Title – ALIF LAILA ; EK HAZAAR AUR EK RAATEIN
(JILD – SHISHAM).

Creator – Mutarjuma Abdul Kareem.

Publisher – Urdu Academy (Karachi).

Date – 1966.

Pages – 347.

Subjects – Alif Laila – Tarajum ; Arbi Adab – Tarajum – Alif Laila

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۲۲

الف لیلہ و لیلہ
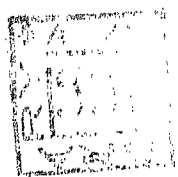
جلد ششم

مترجمہ

ڈاکٹر ابو الحسن منصور احمد صاحب (مرحوم)

پروفیسر مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

شائع کردہ

انجمنِ ترقی اُردو (ہند)، دہلی

۱۹۳۵ء

سات سو اٹھاونویں رات

سات سو اٹھاونویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
تاجر حسن کا غلام شیخ سے رخصت ہو کر چلا گیا اور اُسی دن خوش خوش سفر
شروع کر دیا، وہ سیف الملک کے قصے کے پا جانے پر اتنا خوش تھا کہ دن
رات سفر کرنے لگا اور اپنے وطن پہنچ کر اپنے نوکر کو آگے بھیجا تا کہ
تاجر کو خوش خبری دے اور اس سے کہے کہ تیرا غلام آگیا ہے اور مراد حاصل
ہو گئی ہے۔ جب غلام اپنے آقا کے شہر میں پہنچا اور اُسے خوش خبری پہنچی
ہے تو اُس میعاد میں جو بادشاہ اور تاجر حسن کے درمیان مقرر ہوتی تھی محض
دس دن باقی رہ گئے تھے۔ غلام نے اپنے آقا کے پاس جا کر اُسے
خبر دی کہ میں تیری مراد حاصل کر کے آیا ہوں وہ بہت خوش ہوا اور غلام نے
اپنے گھر میں سستانے کے بعد اپنے آقا کو وہ کتاب دے دی جس
میں سیف الملوک اور بدیع الجمال کا قصہ لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی
آقا نے اپنے سارے کپڑے اتار کر اُسے دے دیے، دس اصیل
گھوڑے، دس اونٹ، دس خچر اور تین غلام عطا کیے اور اس قصے کو
تفصیل کے ساتھ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہا
اے نیک نہاد بادشاہ! میں ایسی پیاری اور کمیاب کہانی لایا ہوں جو کبھی
کسی نے نہ سنی ہو گی۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ تمام سمجھدار امیر وزیر
پڑھے لکھے، سارے ادیب، شاعر اور دانش مند لوگ حاضر ہوں۔ تاجر حسن

نے بادشاہ کے سامنے وہ قصہ پڑھا۔ اُسے سُن کر بادشاہ اور تمام حاضرین حیران ہو گئے، بہت پسند کیا، سب نے اُس کے اوپر سونا چاندی اور جواہرات نثار کیے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تاجر حسن کو بہترین خلعت دیا جائے اور اُسے ایک پورا شہر قلعوں اور جاگیروں سمیت عطا کیا، اُسے اپنا بڑا وزیر بنا کر اپنے داہنی طرف بٹھایا اور کاتبوں کو حکم دیا کہ اس قصے کو سونے سے لکھ کر شاہی خزانے میں محفوظ رکھیں۔ جب کبھی بادشاہ کا دل گھبراتا تو وہ تاجر حسن کو بلاتا اور تاجر حسن وہ قصہ پڑھ کر اُسے سناتا۔

سیف الملوک اور بدیع الجمال کی کہانی

قصے کا مضمون یہ ہے کہ پرانے زمانے میں مصر کا ایک بادشاہ عاصم بن صفوان نام تھا۔ بڑا سخی، دریا دل اور شان دار۔ اس کے قبضے میں بہت سے ملک، قلعے، گڑھیاں، فوجیں اور لشکر تھے۔ اس کا ایک وزیر فارس بن صالح تھا۔ سارا ملک خدا کو چھوڑ کر سورج اور آگ کی پرستش کرتا۔ ہوتے ہوتے یہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا۔ بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے نہایت کم زور، کیوں کہ اس کی عمر ایک سو اسّی برس کی ہو چکی تھی، لیکن اس کے کوئی اولاد نہ ہوئی نہ لڑکا نہ لڑکی۔ وہ رات دن غمگین اور رنجیدہ رہتا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ امرا، وزرا، سردار اور منصب دار [illegible] کے موافق اس کی خدمت [illegible] قائم تھے۔ جو امیر آتا اس کے ساتھ ایک ایک دو دو بیٹے ہوتے۔ یہ [illegible] بادشاہ کو حسد ہوا، اپنے دل میں کہنے لگا کہ ہر شخص اپنی اولاد پر خوش و خرم ہے

لیکن میری کوئی اولاد نہیں، کل میں مرجاؤں گا اور میرا ملک، تخت، جائداد، خزانے اور مال و دولت غیروں کے ہاتھ لگے گا، کوئی میرا نام لیوا نہ بچے گا، نہ دنیا میں مجھے کوئی یاد کرے گا۔ اس خیال کا اُس کے دل پر اتنا صدمہ ہوا کہ آنسو نکل پڑے، تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔

وزیر اور حکومت کے دوسرے امرائے جو وہاں حاضر تھے اُس کی یہ حالت دیکھی تو انھوں نے لوگوں سے پکار کر کہا کہ جب تک بادشاہ کی حالت سنبھل نہ جائے تم سب گھر جاکر آرام کرو۔ سب چلے گئے، سوائے بادشاہ اور وزیر کے وہاں کوئی باقی نہ رہا۔ جب بادشاہ کو ذرا ہوش آیا تو وزیر نے اُس کے آگے زمین چومی اور کہا جہاں پناہ، اس رونے کا سبب کیا ہے؟ بادشاہوں، قلعے والوں یا امرا اور منصب داروں میں سے کس نے تیرے ساتھ دشمنی کی ہے، مجھے بتا کون تیری مخالفت پر آمادہ ہے تاکہ اے بادشاہ! ہم سب مل کر اس کی جان نکال لیں۔ اس کا جواب دینا تو درکنار بادشاہ نے سر تک نہ اُٹھایا۔ وزیر نے دوبارہ اُس کے آگے زمین چومی اور کہا جہاں پناہ: میں تیرے لڑکے اور غلام کی طرح ہوں تو نے مجھے پالا پوسا ہے، اگر مجھے تیرے غم، رنج اور افسوس کا سبب معلوم نہ ہوا تو اور کسے معلوم ہوسکتا ہے، کون ایسا ہوسکتا ہے جو تیرے آگے مجھ جیسی جرأت کرے؟ کہہ تو سہی کہ اس رونے دھونے اور رنج و غم کا کیا سبب ہے؟ اس پر بھی بادشاہ نہ بولا، نہ اس نے منھ کھولا، نہ سر اُٹھایا بلکہ برابر روتا، چلّاتا اور آہ و بکا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر صبر کرنے کے بعد وزیر نے کہا اگر تو اس کا سبب نہ بتائے گا تو میں ابھی تیرے آگے جان دے دوں گا کیوں کہ میں تجھے رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا۔ اب بادشاہ عاصم نے سر اٹھایا

اور اپنے آنسو پونچھ کر کہنے لگا اے نیک رائے وزیر، تجھے میرے غم و رنج میں رہنے دے، جو درد و غم میرے دل میں ہے وہ کیا کم ہے! وزیر بولا اے بادشاہ اس رونے دھونے کا سبب مجھے بتا دے شاید میرے ذریعے سے تجھے خوشی حاصل ہو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

سات سو اٹھویں رات

سات سو اٹھویں رات جب ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب وزیر نے بادشاہ عاصم سے کہا کہ اس رونے دھونے کا سبب مجھے بتا دے شاید میرے ذریعے سے تجھے خوشی حاصل ہو تو بادشاہ نے کہا اے وزیر، میرے رونے کی وجہ نہ مال و دولت ہے نہ ہاتھی گھوڑے نہ اس قسم کی کوئی اور چیز بلکہ تو جانتا ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میری عمر ایک سو اسی سال کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے اور اب تک میرے ہاں کوئی لڑکا ہے نہ لڑکی۔ اگر میں مر گیا تو لوگ مجھے دفن کر کے بھول جائیں گے میرا نام مٹ جائے گا اور دوسرے لوگ میرا تخت اور ملک لے لیں گے، کوئی میرا نام لیوا باقی نہ رہے گا۔ وزیر نے کہا جہاں پناہ، میں تجھ سے سو برس بڑا ہوں، میری بھی کوئی اولاد نہیں، میں بھی اس پر دن رات رنجیدہ اور غمگین رہتا ہوں۔ اب ہم دونوں کو کیا کرنا چاہیے ؟ لیکن میں نے سنا ہے کہ کوئی سلیمان بن داؤدؑ بادشاہ ہے اور اس کا ایک پروردگار ہے جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مجھے چاہیے کہ میں ایک ہدیہ لے کر اس کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں کہ وہ اپنے پروردگار

کے آگے دعا کرے کہ ہم دونوں کے ہاں اولاد پیدا ہو۔ یہ کہہ کر وزیر نے
سفر کی تیاری کی اور نہایت قیمتی ہدیہ لے کر سلیمان بن داؤدؑ کے پاس پہنچا۔

یہ تو وزیر کا قصہ ہوا، اب سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا حال
سنو۔ خدا نے ان پر وحی نازل کی اے سلیمان، مصر کے بادشاہ نے
اپنے بڑے وزیر کو ہدیے اور تحفے دے کر تیرے پاس روانہ کیا ہے اور
ان میں یہ یہ چیزیں ہیں۔ تو اپنے وزیر آصف بن برخیا کو اُس کے پاس
بھیج تاکہ وہ عزت و احترام سے اس کا استقبال کرے اور ہر منزل
پر اُس کے لیے کھانا پینا مہیا کرے۔ جب وہ تیرے پاس پہنچے تو اس
سے کہیو کہ بادشاہ نے تجھے فلاں فلاں کام کے لیے بھیجا ہے اور
اس کی یہ یہ خواہش ہے، اِس کے بعد اُس کے آگے اسلام پیش کیجیو۔
یہ سنتے ہی سلیمانؑ نے اپنے وزیر آصف کو حکم دیا کہ اپنے ساتھیوں
کو لے کر روانہ ہو جائے۔ عزت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرے اور ہر
منزل پر انھیں عمدہ سے عمدہ کھانا پینا دے۔ یہ تمام انتظام کر کے
آصف ان کے خیر مقدم کے لیے چل کھڑا ہوا، چلتے چلتے مصر کے
بادشاہ کے وزیر فارس سے جا ملا، اس کا خیر مقدم کر کے اُسے سلام کیا،
اُس کا اور اس کے ساتھیوں کا بڑا احترام کیا، ہر منزل پر ان کے لیے
کھانا پینا، دانہ چارا مہیا کیا اور ان سے کہا آنے والے مہمانو! اہلاً وسہلاً
و مرحبا، خوش اور دل شاد ہو اور بے فکر ہو جاؤ کہ تمھاری حاجت پوری
ہو گئی۔ وزیر اپنے دل میں کہنے لگا ان لوگوں کو کیسے خبر ہو گئی ہے اور
آصف بن برخیا سے پوچھا اے میرے آقا، ہماری اور ہمارے مقصد
کی خبر تمھیں کس نے دی ہے آصف نے کہا سلیمان بن داؤد علیہما السلام

نے۔ وزیر فارس نے پوچھا ہمارے آقا سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو کس نے خبر دی؟ آصف نے کہا انھیں زمین اور آسمان کے پروردگار اور ساری مخلوقات کے خدا نے خبر دی۔ وزیر فارس بولا پھر تو وہ بہت بڑا خدا ہوگا۔ اب آصف بن برخیا نے پوچھا کہ کیا تم اُس کی پرستش نہیں کرتے؟ مصر کے بادشاہ کے وزیر فارس نے کہا ہم سورج کی پرستش کرتے اور اسی کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ آصف نے کہا اے وزیر فارس! سورج ہی منجملہ اور تاروں کے ایک تارا ہے جو خدا نے پیدا کیا ہے، وہ ہرگز معبود نہیں ہو سکتا، وہ تو کبھی نکلتا ہے اور کبھی چھپ جاتا ہے مگر ہمارا پروردگار ہمیشہ موجود ہے کبھی غائب نہیں ہوتا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ سبا کے ملک میں پہنچے اور جب سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے دار السلطنت کے قریب آئے تو انھوں نے اپنے جن و انس وغیرہ کے لشکروں کو حکم دیا کہ اُن کی راہ میں صف باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔ یہ سنتے ہی سمندر کے جانور، ہاتھی، چیتے اور تیندوے دورویہ صف باندھ کر کھڑے ہو گئے اس طرح سے کہ ہر جنس والے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یہی جنات نے بھی کیا، وہ پوشیدہ نہ تھے بلکہ دکھائی دیتے تھے اور طرح طرح کی بھیانک شکل میں تھے۔ سب کے سب دورویہ صف باندھے کھڑے تھے۔ چڑیاں ان کے اوپر بازو پھیلائے سایہ کر رہی تھیں۔ ان چڑیوں میں سے بعض طرح طرح کی بولیاں بول رہی اور راگ گا رہی تھیں۔ مصر والے ان کے پاس پہنچے تو مارے ڈر کے ٹھٹھک گئے، آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آصف نے کہا اُن کے بیچ میں ہو کر چلو اور اُن سے ڈرو نہیں کیوں کہ وہ سب

سلیمان بن داؤد کی رعایا ہیں، ان میں سے کوئی بھی تمھیں تکلیف نہ پہنچائے گا۔ یہ کہہ کر آصف ان کے آگے آگے چلا، پیچھے پیچھے باقی سب لوگ جن میں ڈرتے ڈرتے مصر کے بادشاہ کے وزیر کے ساتھی بھی تھے۔ جب وہ شہر میں داخل ہوتے تو وہ مہمان خانے میں اُتارے گئے، ان کی بڑی خاطر مدارات کی گئی، تین دن تک انھیں عمدہ عمدہ کھانے کھلائے گئے پھر وہ خدا کے نبی حضرت سلیمان کے سامنے پیش ہوئے۔ اُن کے پاس پہنچے تو انھوں نے چاہا کہ سجدہ کریں لیکن حضرت سلیمان بن داؤد نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں سوائے اس بزرگ خدا کے جس نے زمین آسمان وغیرہ پیدا کیے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی کھڑا رہنا چاہتا ہو تو وہ کھڑا رہے لیکن میری خدمت کے لیے نہیں۔ سب نے اس کی تعمیل کی، وزیر فارس اور اُس کے بعض نوکر جاکر بیٹھ گئے اور بعض چھوٹے درجے کے غلام کھڑے رہے۔

وہ بیٹھ چکے تو ان کے لیے دسترخوان بچھائے گئے اور تمام لوگوں نے کھانا کھایا یہاں تک کہ سیر ہوگئے۔ اب سلیمان نے مصر کے وزیر سے کہا اپنی حاجت بیان کرتا کہ وہ پوری کی جائے۔ بول اور جس لیے تو آیا ہو اُس میں سے کوئی بات نہ چھپا کیوں کہ تو حاجت روائی کی غرض سے آیا ہے۔ اچھا میں خود تجھے بتائے دیتا ہوں کہ وہ کیا ہے، وہ فلاں فلاں بات ہے اور مصر کا بادشاہ جس نے تجھے بھیجا ہے اس کا نام عاصم ہے۔ وہ بوڑھا اور کم زور ہوگیا ہے اور خدا نے اب تک نہ اُسے لڑکا دیا نہ لڑکی، اس وجہ سے وہ رات دن غم، رنج اور فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک دن جب وہ شاہی کرسی پر بیٹھا تھا، اُمرا، وزرا اور حکومت کے دوسرے

بڑے لوگ آتے جاتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کسی کے ساتھ ایک بیٹا، کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ تین بیٹے ہیں، وہ اپنے اپنے بیٹوں کے ساتھ آتے اور اُس کی خدمت میں کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس پر وہ سوچ میں پڑ گیا اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنے لگا دیکھنا چاہیے کہ میرے مرنے کے بعد میرا ملک کس کے پاس جاتا ہے، وہ کسی غیر شخص کے قبضے میں آجائے گا اور میری یہ حالت ہو جائے گی گویا میں تھا ہی نہیں۔ اس لیے وہ سوچ میں پڑ گیا، اتنا متفکر اور پریشان ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، وہ رومال سے منھ ڈھانک کر خوب رویا۔ اس کے بعد روتا پیٹتا تخت سے اترا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس وقت کی اس کی حالت سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہ تھی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔

سات سو ساٹھویں رات

سات سو ساٹھویں رات ہوتی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! سلیمان بن داودؑ نے بادشاہ کا سارا حال اُس کے وزیر فارس سے بیان کر کے پوچھا اے وزیر کیا جو کچھ میں نے تجھ سے کہا صحیح نہیں؟ وزیر نے کہا اے خدا کے نبی، جو کچھ تو نے کہا بالکل درست اور ٹھیک ہے، لیکن اے خدا کے نبی، جب میں اور بادشاہ اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو ہمارے پاس کوئی اور نہ تھا، نہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر تھی، تجھے ان باتوں کی خبر کیسے ہو گئی؟ آپ نے فرمایا میرے پروردگار نے مجھے خبر دے دی ہے جو تمام باتوں کو جانتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل

اور سینے میں چھپی رہتی ہیں۔ یہ سن کر وزیر فارس بولا اے خدا کے نبی وہ تو کوئی بڑا عظیم الشان پروردگار معلوم ہوتا ہے جسے دلوں کے بھید تک معلوم ہیں، اور وہ اور اُس کے تمام ساتھی اسلام لے آئے۔ اس کے بعد خدا کے نبی سلیمانؑ نے وزیر سے کہا تیرے ساتھ یہ یہ ہدیے اور تحفے ہیں۔ وزیر نے جواب دیا ہاں۔ سلیمانؑ نے کہا میں نے قبول کیے لیکن وہ سب تجھے عطا کرتا ہوں۔ اب تم سب جاکر اس مکان میں آرام کرو جہاں تم ٹھیرے ہو یہاں تک کہ سفر کی تھکن جاتی رہے۔ اگر خدا نے چاہا تو میں کل تمھاری حاجت پوری کر دوں گا۔

وزیر فارس اپنی قیام گاہ پر چلا گیا اور دوسرے دن حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے کہا جب تو بادشاہ عاصم بن صفوان کے پاس پہنچ کر اس سے ملے تو تم دونوں فلاں درخت پر چڑھ کر چُپ چاپ بیٹھ جانا، دونوں نمازوں کے بیچ کا وقت ہو اور دوپہر کی گرمی کم ہو جاتے تو درخت سے اُتر کر نظر دوڑانا۔ تمھیں دو اژدہے دکھائی دیں گے جن میں سے ایک کا سر بندر کا ہوگا اور دوسرے کا دیو کا۔ انھیں دیکھتے ہی تم ان پر تیر چلانا، انھیں مار ڈالنا، ان کے سروں اور دُموں کی طرف سے ایک ایک بالشت کاٹ کر پھینک دینا، جو باقی رہ جائے اُسے پکانا، وہ خوب گل جائے تو اپنی بیویوں کو کھلانا اور اسی رات ان کے ساتھ ہم بستر ہونا، اگر خدا نے چاہا تو دونوں کو لڑکوں کا حمل رہ جائے گا۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ایک انگوٹھی، ایک تلوار اور ایک بقچہ منگوایا جس کے اندر دو قبائیں تھیں جن میں ہیرے ٹنکے ہوئے تھے اور کہا اے وزیر فارس، جب دونوں بیٹے بڑے ہو جائیں تو دونوں

کو یہ ایک ایک قبا دینا۔ اچھا بسم اللہ، خدا نے تیری حاجت پوری کردی، اب خدا کا نام لے کر روانہ ہو جا۔ بادشاہ منتظر ہے، اس کی آنکھیں راستے پر لگی ہوئی ہیں۔ وزیر فارس خدا کے نبی سلیمان بن داؤدؑ کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ چومے اور روانہ ہوگیا۔ اس خوشی میں کہ حاجت پوری ہوگئی۔ دن اور رات برابر سفر کرتے کرتے مصر کے قریب پہنچا۔ وہاں سے اس نے اپنے ایک غلام کو آگے روانہ کیا کہ جا کر بادشاہ عاصم کو خبر دے۔ جب بادشاہ نے سنا کہ وزیر آگیا ہے اور اس کی حاجت پوری ہوگئی ہے تو وہ، اس کے مصاحب، درباری اور تمام لشکر پھولے نہ سماتے، خاص کر اس وجہ سے کہ وزیر صحیح وسلامت آگیا۔ بادشاہ اور وزیر آمنے سامنے ہوتے تو وزیر نے گھوڑے سے اتر کر بادشاہ کے آگے زمین چومی اور اُسے خوش خبری دی کہ اُس کی تمنا نہایت عمدہ طرح سے پوری ہوگئی اور اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ بادشاہ عاصم اسلام لے آیا اور وزیر فارس سے کہا آج رات گھر جا کر آرام کر، ایک ہفتہ آرام لینے کے بعد حمام جائیو اور پھر میرے پاس آئیو تاکہ ہم سوچیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وزیر نے زمین چومی اور وہ اس کے غلام اور نوکر چاکر چلے گئے۔ آٹھ دن تک سستانے کے بعد وزیر بادشاہ کے پاس آیا، جو کچھ اُس کے اور حضرت سلیمان بن داؤدؑ کے درمیان پیش آیا تھا بیان کیا اور بادشاہ سے کہا اکیلا میرے ساتھ چل۔ جنگل میں پہنچ کر بادشاہ اور وزیر تیر کمان ہاتھوں میں لے کر درخت پر چڑھ گئے اور دوپہر ڈھلے تک چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ عصر کا وقت قریب ہوا تو نیچے اترے، انھوں نے دیکھا کہ دو اژدہے اُسی درخت کے نیچے سے نکلے۔ بادشاہ دیکھتے ہی ان پر

رہ گیا، ان کی گردنوں میں سنہرے طوق تھے اور وزیر سے کہنے لگا ان
کی گردنوں میں تو سنہرے طوق ہیں، واللہ یہ کیسے عجیب وغریب ہیں۔ چل
انھیں پکڑ کر پنجرے میں رکھیں اور ان کا تماشا دیکھا کریں۔ وزیر نے کہا
انھیں خدا نے اس لیے پیدا کیا ہو کہ ان سے فائدہ پہنچے۔ ان میں سے
ایک پر تو تیر چلا اور ایک پر میں۔ دونوں نے ان پر تیر چلائے، جب
وہ مر گئے تو ایک ایک بالشت ان کی دُم کی طرف سے اور ایک ایک
بالشت سر کی طرف سے کاٹ کر پھینک دیا، باقی کو لے کر محل میں گئے،
باورچی کو بلا کر وہ گوشت اُسے دیا اور کہا اس میں نمک مرچ اور مسالا
ملا کر خوب اچھی طرح پکا اور دو پیالوں میں نکال کر فلاں وقت، فلاں
گھڑی یہاں لے آئیو، دیر نہ کیجیو اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو اکسٹھویں رات

سات سو اکسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
بادشاہ نے باورچی کو پکانے کا حکم دیا۔ باورچی نے خوب مسالا لگا کر اُسے
پکایا اور دو پیالوں میں نکال کر بادشاہ اور وزیر کے پاس لے گیا۔ ایک
پیالہ وزیر نے لیا، دوسرا بادشاہ نے اور اپنی اپنی بیویوں کو کھلا کر اُسی
رات اُن کے ساتھ ہم بستر ہوئے، خدا کا کرنا کہ دونوں اُسی رات حاملہ
ہو گئیں۔ تین مہینے تک بادشاہ نے پریشانی کے ساتھ انتظار کیا، اپنے
دل میں کہتا کہ دیکھنا چاہیے یہ بات صحیح ہو یا غلط۔ ایک روز اُس کی بیوی
بیٹھی ہوئی تھی کہ بچہ اس کے پیٹ میں کلبلایا اور اُسے یقین ہو گیا کہ

وہ حاملہ ہے۔ جب اُسے درد معلوم ہونے لگا اور اس کا رنگ بدل گیا تو اُس نے اپنے ایک غلام کو بلایا جو سب سے بڑا تھا، اس سے کہا جہاں کہیں بادشاہ ہو اس کے پاس جاکر کہہ جہاں پناہ! میں تجھے خوش خبری دیتا ہوں کہ ہماری آقا کا حمل ظاہر ہوگیا اور بچہ اُس کے پیٹ میں کلبلانے لگا۔ غلام خوش خوش اور تیزی کے ساتھ دوڑا، اس نے دیکھا کہ بادشاہ اکیلا بیٹھا ہے اپنے چہرے کو ہاتھ کی ٹیک دیے کچھ سوچ رہا ہے۔ غلام نے سامنے آکر زمین کو بوسہ دیا اور کہا جہاں پناہ ملکہ کو حمل رہ گیا ہے۔ غلام سے یہ سنتے ہی بادشاہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مارے خوشی کے غلام کا ہاتھ اور سر چومنے لگا، اپنے تمام کپڑے اتار کر اُسے دے دیے اور حاضرین سے کہا کہ تم میں سے جو کوئی مجھ سے محبت رکھتا ہو وہ اُسے انعام دے، اور انھوں نے اُسے اس قدر مال و دولت، جواہرات، یاقوت، گھوڑے، خچر اور باغ دیے جو گنتی سے باہر ہیں۔

اسی وقت وزیر بھی بادشاہ کے پاس پہنچا، اس نے کہا جہاں پناہ، میں ابھی گھر میں اکیلا بیٹھا حمل کے بارے میں سوچ رہا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ دیکھنا چاہیے یہ سچ بھی ہے کہ خاتون حاملہ ہوجائے گی اتنے میں میرے غلام نے آکر خوش خبری دی کہ خاتون حاملہ ہے، بچہ اُس کے پیٹ میں کلبلا رہا ہے اور اس کا رنگ بدل گیا ہے۔ میں نے مارے خوشی کے اپنے تمام کپڑے اور ایک ہزار دینار دے کر اُسے غلاموں کا سردار بنا دیا۔ یہ سن کر بادشاہ عاصم نے کہا اے وزیر! خدا نے ہم دونوں پر اپنے فضل و احسان، سخاوت و بخشش سے اور سچے دین کے طفیل بڑی مہربانی کی، اپنے کرم و بزرگی سے انعام و اکرام کیا اور ہمیں اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لایا۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں پر مہربانی کرکے انھیں خوش کردوں۔

اب بادشاہ نے حاجبوں کو حکم دیا کہ لوگوں میں منادی کر دیں کہ کوئی نہ جائے۔ انھوں نے منادی کی کہ بادشاہ کی تقریر سننے سے پہلے کوئی نہ جائے۔ پردہ اٹھا اور بادشاہ نے کہا کہ جسے مجھ سے محبت ہے وہ میری تقریر سننے کے لیے ٹھہر جائے۔ اب تک لوگ ڈر رہے تھے مگر یہ سن کر انھیں اطمینان ہوا اور وہ بیٹھ گئے۔ بادشاہ کھڑا ہو گیا اور انھیں قسم دی کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اس کے بعد اس نے کہا اے امیرو، وزیرو اور حکمرانو، چھوٹے بڑے تمام حاضرین! تم جانتے ہو یا نہیں کہ یہ سلطنت مجھے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہے؟ وہ بولے اے بادشاہ! ہاں، ہم سب جانتے ہیں۔ پھر اس نے کہا پہلے ہم تم سب سورج اور چاند کی پرستش کیا کرتے تھے لیکن خدا نے ہمیں ایمان عطا کیا۔ اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لایا اور ہمیں اسلام کی طرف ہدایت کی۔ اب سنو کہ میں بہت بوڑھا کمزور اور عاجز ہو گیا ہوں، میری خواہش ہے کہ میں ایک کونے میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کروں، پچھلے گناہوں کی معافی مانگوں، یہ میرا بیٹا سیف الملوک حکومت کرے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ خوب صورت جوان، فصیح، تجربہ کار، عاقل، فاضل اور عادل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے اِسی وقت اپنی حکومت سپرد کر دوں اور اپنے بجائے اُسے تم پر بادشاہ بنا دوں، اپنی جگہ اُسے سلطان بنا کر بٹھا دوں اور میں ایک کونے میں بیٹھ کر محض خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاؤں اور میرا بیٹا سیف الملوک تم پر بادشاہی اور حکمرانی کرے۔ تم سب کی متفقہ رائے کیا ہے؟ سب اُٹھ کھڑے ہوتے اور اُس کے آگے زمین چوم کر کہنے لگے اے ہمارے بادشاہ اور نگہبان! اگر تو ہمارے اوپر اپنا ایک غلام بھی مقرر کر دیتا تو ہم اُس کی فرماں برداری کرتے تیری

بات نہ ٹالتے، تیرے حکم کی تعمیل کرتے اور یہ تو تیرا بیٹا سیف الملوک ہے، وہ ہمیں بسر و چشم منظور ہے اور ہم اس سے خوش ہیں۔ اب بادشاہ عاصم بن صفوان اُٹھا، تخت سے اُتر کر اپنے بیٹے کو اس پر بٹھا دیا، اپنے سر سے تاج اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا، شاہی پٹکا اس کی کمر سے باندھ دیا اور خود اس کے پہلو میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ امرا، وزرا اور ملک کے چھوٹے بڑے سب اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے بادشاہ کے آگے زمین چومی اور آپس میں کہنے لگے واقعی یہ بادشاہت کے قابل ہے اور دوسروں سے بہتر، پھر سب نے امان کی درخواست کی اور اُس کے لیے کامرانی و اقبال مندی کی دعا مانگی۔ سیف الملوک نے حاضرین پر سونا چاندی نچھاور کیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو باسٹھویں رات

سات سو باسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا سیف الملوک نے سونا، چاندی نچھاور کیا، خلعت عطا کیے اور انعام و اکرام دیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وزیر فارس اٹھا اور زمین چوم کر کہنے لگا اے امرا اور اے حکومت کے بڑے لوگو تمہیں معلوم ہے کہ میں وزیر ہوں اور میری وزارت بہت پرانی ہے، بادشاہ عاصم بن صفوان کے بادشاہ ہونے سے پہلے کی، وہ اس وقت بادشاہت سے کنارہ کش ہو گیا ہے اور اس نے اپنی جگہ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنا دیا ہے۔ سب نے کہا ہاں، ہم جانتے ہیں کہ تیری وزارت باپ دادا سے چلی آتی ہے۔ وزیر بولا اب میں بھی اس سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسے اپنے بیٹے ساعد کے سپرد کرتا ہوں کیوں کہ وہ عاقل، سمجھدار اور تجربہ کار ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟

انھوں نے جواب دیا بادشاہ سیف الملوک کی وزارت کے قابل سوائے ساعد کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، دونوں ایک دوسرے کا جوڑ ہیں۔ اب وزیر فارس نے اٹھ کر اپنی وزارت کی پگڑی اتاری اور اپنے بیٹے ساعد کے سر پر رکھ دی اور وزارت کا قلم دان بھی اُس کے حوالے کیا۔ حاجب اور امرا کہنے لگے وہ واقعی وزارت کا مستحق ہے۔ بادشاہ عاصم اور وزیر فارس نے اس کے بعد خزانے کھول دیے۔ والیوں، امرا، وزرا اور بڑے چھوٹے لوگوں کو عمدہ عمدہ خلعت عطا کیے، انعام واکرام دیے اور اُن کے لیے نئے وثیقے اور حکم نامے لکھ دیے جن پر سیف الملوک اور وزیر فارس کے بیٹے وزیر ساعد کی مہریں تھیں۔ جو جو اس تقریب میں آئے تھے ہفتہ بھر ٹھیرنے کے بعد اپنے وطن اور گھروں کو روانہ ہو گئے۔

تاج پوشی سے فارغ ہو کر بادشاہ عاصم اپنے بیٹے سیف الملوک اور وزیر زادے ساعد کو لے کر شہر میں داخل ہوا اور محل میں پہنچ کر خزانچی کو بلوایا، اسے حکم دیا کہ انگوٹھی، تلوار، بغچہ اور مُہر حاضر کرے، پھر اپنے بیٹے اور وزیر زادے سے بولا اے میرے بیٹو! آؤ ان میں سے اپنے لیے پسند کر کے لے لو۔ پہلے سیف الملوک نے ہاتھ بڑھایا، بغچہ اور انگوٹھی لے لی، پھر ساعد نے ہاتھ بڑھا کر تلوار اور مہر اٹھا لی اس کے بعد دونوں بادشاہ کا ہاتھ چوم کر اپنے اپنے مکان چلے گئے۔ جب سیف الملوک نے بغچہ لیا ہو تو اُسے کھول کر نہیں دیکھا کہ اُس میں کیا ہے بلکہ اُسے اس تخت پر رکھ دیا جس پر وہ اور اس کا وزیر ساعد رات کو سویا کرتے تھے، یہ ان کا دستور تھا کہ رات کو دونوں ساتھ سوتے۔ چناں چہ آج بھی دونوں پہلو بہ پہلو سو گئے۔ شمعیں ان کے پاس جلتی رہیں۔ آدھی رات کو جو سیف الملوک کی آنکھ کھلی

اور بقچے کو سرہانے دیکھا تو اپنے دل میں کہنے لگا نہ معلوم اس بقچے میں جو
بادشاہ نے مجھے تحفے میں دیا ہے کیا ہے۔ وہ اس بقچے اور موم بتی کو لے کر
تخت سے اترا اور ساعد کو سوتا چھوڑ کر کوٹھری میں گیا، وہاں جا کر بقچہ کھولا،
دیکھا کہ اُس میں جنوں کی بُنی ہوئی ایک قبا ہے، قبا کو اُلٹا پلٹا تو اُس کے
استر پر پیٹھ کی طرف سونے سے کڑھی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر تھی تصویر
کو دیکھتے ہی اُس کے ہوش جاتے رہے۔ عشق کا جن اس پر سوار ہو گیا۔ غش
کھا کر زمین پر گر پڑا، ہوش آیا تو رونے پیٹنے اور تصویر کو بوسے دینے لگا،
اتنا رویا پیٹا کہ وزیر ساعد اُٹھ بیٹھا، اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا، دیکھا کہ سیف الملوک
وہاں نہیں ہے اور صرف ایک موم بتی پاس جل رہی ہے۔ حیران کہ سیف الملوک
کہاں چلا گیا؟ اس نے موم بتی لے کر سارے محل میں چکر لگایا اور
ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کوٹھری میں پہنچ گیا جہاں سیف الملوک تھا
دیکھا کہ وہ رو رہا اور آہیں بھر رہا ہے، اس نے کہا بھائی! اس رونے
کی وجہ کیا ہے؟ تجھ پر کیا ماجرا گزرا؟ کہہ تو سہی، مُنہ سے کچھ تو بول۔
سیف الملوک نے اُسے نہ کوئی جواب دیا نہ سر اُٹھایا بلکہ روتا، آہیں
بھرتا اور سینہ پیٹتا رہا۔ ساعد اُس کی یہ حالت دیکھ کر بولا میں تیرا وزیر
فرمانبردار بھائی ہوں، میری اور تیری تربیت ایک ساتھ ہوئی ہے، اگر تو اپنی
باتیں مجھ سے نہ کہے گا اور اپنے راز مجھ پر ظاہر نہ کرے گا تو پھر انھیں
کس پر ظاہر کرے گا؟ ساعد دیر تک خوشامد کرتا اور زمین چومتا رہا
لیکن سیف الملوک اُس کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوا، اُس سے بات تک
نہ کی بلکہ برابر روتا دھوتا رہا۔ جب ساعد کو سیف الملوک کی حالت
دیکھ کر ڈر لگنے لگا اور پوچھتے پوچھتے تھک گیا تو وہاں سے باہر آیا

اور تلوار لے کر اس کوٹھری میں گیا جہاں سیف الملوک تھا اور اُس کی نوک اپنے سینے پر رکھ کر کہا اے میرے بھائی! ہوشیار ہو جا، اگر تو نے اپنا ماجرا بیان نہ کیا تو میں جان دے دوں گا، میں تجھے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ سیف الملوک نے اپنا سر اُٹھایا اور اپنے وزیر ساعد کی طرف دیکھ کر کہا بھائی! مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنا ماجرا تجھ سے کہوں۔ ساعد بولا میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں جو پروردگاروں کا پروردگار، غلاموں کا آزاد کرنے والا، سببوں کا پیدا کرنے والا، یکتا، مہربان، کریم اور بخشش کرنے والا ہے کہ تو اپنا ماجرا بیان کر۔ مجھ سے شرما نہیں، میں تیرا وزیر، غلام اور تمام باتوں میں تیرا مشیر ہوں۔ سیف الملوک نے کہا آ اور اس تصویر کو دیکھ۔ ساعد اس تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا، اُس کے اوپر پروئے ہوئے موتیوں سے لکھا تھا کہ یہ تصویر بدیع الجمال کی ہے جو مسلمان جن بادشاہ شماخ بن شاروخ کی بیٹی ہے، یہ جنات بابل شہر میں آکر اُترے ہیں اور ارم بن عاد اکبر کے باغ میں رہتے ہیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو تریسٹھویں رات

سات سو تریسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب وزیر ساعد نے قبا پر بدیع الجمال کی تصویر دیکھی تو اس نے سیف الملوک سے کہا بھائی! تجھے معلوم ہے یہ کس عورت کی تصویر ہے تاکہ ہم اُسے تلاش کریں؟ سیف الملوک بولا، بھائی، خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ ساعد نے کہا لے اِسے پڑھ۔ سیف الملوک نے پڑھ کر جو ...

لکھا ہوا پڑھا تو اُس کے دل سے ایک ٹھنڈا سانس نکلا اور وہ آہیں بھرنے لگا
ساعد نے کہا بھائی! اگر تصویر والی دنیا میں موجود ہو اور اس کا نام بدیع الجمال
ہو تو میں فوراً اس کی تلاش میں جاتا ہوں تاکہ تیری مُراد بر آئے۔ مگر بھائی،
خدا کے لیے یہ رونا دھونا چھوڑ دے اور صبح کو جب درباری لوگ تیری
خدمت میں آئیں تو تاجروں، درویشوں، سیاحوں اور پردیسیوں کو بلا کر
اس شہر کے متعلق دریافت کیجیو، ممکن ہو کہ خدا کی رحمت اور مدد سے ہمیں
اس شہر اور ارم کے باغ کا پتا لگ جائے۔ جب سویرا ہوا تو سیف الملوک
اٹھا اور قبا کو لپیٹے تخت پر جا بیٹھا کیوں کہ بغیر اس کے نہ وہ اٹھتا تھا
نہ بیٹھتا نہ اُسے نیند آتی تھی۔ امرا، وزرا، لشکری اور رؤسا دربار میں
حاضر ہوئے تو سیف الملوک نے اپنے وزیر ساعد سے کہا جا ان سے
کہہ دے کہ بادشاہ آج پریشان حال ہو، وہ بیمار ہو، رات بھر اُسے نیند
نہیں آئی ہو، جو کچھ بادشاہ نے کہا تھا وہ وزیر ساعد نے لوگوں سے
کہہ دیا۔

اتنے میں بادشاہ عاصم کو یہ خبر پہنچی، وہ اپنے بیٹے کے حال پر افسوس
کرنے لگا، حکیموں اور نجومیوں کو بلایا اور انھیں لے کر اپنے بیٹے کے پاس
گیا۔ حکیموں نے اُسے دیکھ کر دوا کا نسخہ لکھ دیا لیکن جب وہ تین مہینے
تک برابر بیمار رہا تو بادشاہ عاصم نے غصے میں آکر حکیموں سے کہا مردودو،
کُتو! کیا تم میں سے کوئی بھی میرے بیٹے کا علاج نہیں کر سکتا؟ اگر تم نے
فوراً اس کا علاج نہ کیا تو میں تم سب کی گردنیں اُڑا دوں گا۔ بڑے حکیم نے
جواب دیا جہاں پناہ! ہمیں معلوم ہو کہ یہ تیرا بیٹا ہو اور تو جانتا ہو کہ ہم
غریبوں کے علاج میں بھی سُستی نہیں کرتے پھر تیرے بیٹے کے علاج

ہیں کیوں کر غفلت کر سکتے ہیں! اصل میں تیرا بیٹا ایک سخت بیماری میں
مبتلا ہے، اگر تو اُسے جاننا چاہتا ہے تو ہم تجھ سے بیان کر سکتے ہیں۔ بادشاہ
عاصم نے پوچھا تمھیں میرے بیٹے میں کون سا مرض معلوم ہوتا ہے؟ بڑا حکیم
بولا جہاں پناہ، تیرا بیٹا عاشق ہے اور ایسے شخص پر عاشق جس کا ملنا ناممکن
ہے۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا تمھیں کہاں سے معلوم ہوا کہ میرا بیٹا عاشق
ہے اور عشق آخر آیا کہاں سے؟ انھوں نے جواب دیا اُس کے دودھ شریک
بھائی وزیر ساعد سے پوچھ، وہ اس کی حالت سے واقف ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ
عاصم اُٹھا اور تنہائی میں ساعد کو بلا کر اس سے کہا کہ اپنے بھائی کی بیماری
کا حال سچ سچ کہہ دے۔ اس نے جواب دیا مجھے اس کا حال معلوم نہیں۔
بادشاہ نے جلاد سے کہا کہ ساعد کو پکڑ اور آنکھیں باندھ کر اُس کی گردن
اُڑا دے۔ ساعد اپنی جان کے خوف سے کہنے لگا کہ جہاں پناہ! مجھے پناہ
دے۔ بادشاہ بولا اگر تو بتا دے گا تو تجھے پناہ ہے۔ ساعد نے کہا تیرا بیٹا
عاشق ہے، بادشاہ نے پوچھا اس کا معشوق کون ہے؟ ساعد نے کہا جنات
کے ایک بادشاہ کی لڑکی، اس نے اُس کی تصویر اس قبا پر دیکھی ہے جو
اس بقچے میں تھی جو خدا کے نبی حضرت سلیمان نے تمھیں بہ طور ہدیے
کے بھیجی ہے۔

اتنا سنتے ہی بادشاہ عاصم نے اپنے بیٹے سیف الملوک کے پاس جا کر
کہا بیٹا! تجھ پر کیا مصیبت آئی، وہ تصویر کون سی ہے جس پر تو عاشق ہوا اور
یہ باتیں تو نے مجھ سے کہیں کیوں نہیں؟ سیف الملوک نے کہا ابا جان،
مجھے تیرے آگے شرم آتی تھی اس لیے میں نے تجھ سے اس کا ذکر نہیں
کیا، یہ ایسی باتیں ہیں کہ اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اب تجھے

میرا حال معلوم ہو گیا اس لیے اس کا علاج جس طرح تو کر سکتا ہو کر۔ باپ
بولا آخر کیا تدبیر ہو سکتی ہو؟ اگر وہ کسی انسان کی بیٹی ہوتی تو ہم اس تک پہنچنے
کی تدبیر کر سکتے تھے، وہ تو جنات کی بیٹی ہو اور سوائے حضرت سلیمان بن
داؤد کے کس کی رسائی وہاں تک ہو سکتی ہو! لیکن بیٹا، اُٹھ کھڑا ہو، دل
مضبوط کر اور سوار ہو کر سیر و شکار کے لیے جا، میدان میں کھیل کود، کھانے
پینے میں لگ جا اور دل سے رنج وغم نکال دے، میں تو تیرے لیے سو
شاہ زادیاں لا موجود کروں گا۔ جنات کی بیٹیوں کی تجھے کیا پروا! نہ تو ہمارا
زور اُن پر چلتا ہو، نہ وہ ہماری جنس میں سے ہیں۔ اس نے جواب دیا
نہ تو میں اس سے دست کش ہو سکتا ہوں، نہ کسی اور کی مجھے خواہش ہو۔ بادشاہ
نے کہا بیٹا، تو پھر کیا ہو؟ بیٹے نے جواب دیا سارے تاجروں، مسافروں
اور سیاحوں کو بلا کر اس بارے میں گفتگو کر، ممکن ہو کہ خدا ہمیں اِرَم کے
باغ اور بابل کے شہر تک پہنچا دے۔ بادشاہ عاصم نے فوراً حکم دیا کہ شہر کے
تمام تاجر، پردیسی اور ناخدا حاضر ہوں۔ وہ حاضر ہوئے تو اس نے ان سے
بابل کے شہر، اُس کے جزیرے اور اِرَم کے باغ کے متعلق دریافت کیا، کوئی
بھی ایسا نہ نکلا جو انھیں جانتا ہو یا ان کا پتا بتا سکے مگر مجلس برخاست
ہوتے وقت ان میں سے ایک نے کہا جہاں پناہ! اگر تو ان کا پتا لگانا چاہتا
ہو تو صرف چین کے شہر سے لگ سکتا ہو، وہ بڑا شہر ہو، وہاں کا کوئی نہ کوئی
شخص ضرور تجھے تیرے مقصد تک پہنچا دے گا۔ یہ سن کر سیف الملوک اپنے
باپ سے بولا کہ چین کے سفر کی خاطر مجھے ایک کشتی تیار کرا دے۔ باپ نے
کہا بیٹا، تو اپنی شاہی کرسی پر بیٹھا رہ اور رعیت پر حکومت کیے جا، میں خود
چین جا کر اس بات کا پتا چلاؤں گا۔ سیف الملوک بولا ابا جان! اس

بات کا تعلق مجھ سے ہو اور میری طرح کوئی اس کا پتا نہیں لگا سکتا۔ تیرا کیا بگڑتا ہو تو مجھے سفر کی اجازت دے دے چند روز کی بات ہو۔ اگر مجھے اس کی خبر مل گئی تو میں نے من مانی مراد پائی۔ نہ ملی تو سفر میں میرا جی بہل جائے گا اور میری حالت سنبھل جائے گی۔ زندہ رہا تو صحیح و سالم تیرے پاس لوٹ کر آجاؤں گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

سات سو چونسٹھویں رات

سات سو چونسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! سیف الملوک نے کہا اگر میں زندہ رہا تو صحیح و سالم تیرے پاس لوٹ کر آجاؤں گا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا، اُسے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ دکھائی دیا کہ اس کی بات مان لے۔ ناچار اس نے بیٹے کو سفر کی اجازت دے دی اور چالیس کشتیاں تیار کر کے اُس کے ہمراہ علاوہ نوکر چاکر کے بیس ہزار غلام کر دیے اور مال و دولت اور تمام ضروری ہتھیار دے کر کہا بیٹا! سفر کر، خدا تجھے خیریت، عافیت اور سلامتی کے ساتھ واپس لائے! میں تجھے اس خدا کے حوالے کرتا ہوں جو امانت کو حفاظت کے ساتھ رکھتا ہو۔

اِس کے بعد اُس کے ماں باپ اس سے رخصت ہوئے، کشتیاں، تمام سامان اور لشکر سمیت روانہ ہوگئیں اور چلتے چلتے چین کے شہر میں جا پہنچیں۔ اُدھر جب چین والوں کو یہ خبر ملی کہ چالیس کشتیاں سپاہیوں، جنگ کے سامان، ہتھیاروں اور ذخیروں سے لدی ہوئی آئی ہیں تو انھیں

گمان ہوا کہ کوئی دشمن اُن سے لڑنے اور اُن کا محاصرہ کرنے کے لیے آ گیا۔ انھوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے، پتھر پھینکنے کے آلات لگا دیے۔ ادھر بادشاہ سیف الملوک کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنے خاص غلاموں میں سے دو غلاموں کو چین کے بادشاہ کے پاس بھیجا، پیغام دے کر کہا کہ یہ بادشاہ عاصم کا بیٹا سیف الملوک ہے جو محض مہمانوں کی حیثیت سے تیرے ملک میں آیا ہے تاکہ کچھ دنوں سیر و تفریح کرے، نہ لڑنے آیا ہے نہ دشمنی کرنے۔ اگر تیری خوشی ہو تو وہ تیرے ہاں آ کر ٹھہرے ورنہ لوٹ جائے کیوں کہ وہ نہ تجھے پریشانی میں ڈالنا چاہتا ہے نہ شہر والوں کو۔ غلاموں نے شہر کے دروازے پر جا کر کہا کہ ہم بادشاہ سیف الملوک کے ایلچی ہیں۔ لوگوں نے دروازہ کھول دیا اور ایلچیوں کو لے کر اپنے بادشاہ کے پاس گئے۔ اس بادشاہ کا نام فغفور شاہ تھا۔ بادشاہ عاصم سے اس کی جان پہچان تھی۔ جب اس نے سنا کہ نووارد بادشاہ سیف الملوک بادشاہ عاصم کا بیٹا ہے تو اس نے ایلچیوں کو خلعت دیے اور حکم دیا کہ سب دروازے کھول دیے جائیں، دعوت کی تیاری کی اور خود اپنے خاص درباریوں کو لے کر باہر آیا، سیف الملوک سے گلے ملا اور کہا کہ ہمارے مہمان کا آنا مبارک ہو! میں تیرا اور تیرے باپ کا غلام ہوں، میرا سارا شہر تیری خدمت کے لیے حاضر ہے اور جو کچھ تو چاہے گا مہیا کر دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے دعوت کا سامان اس جگہ پہنچا دیا جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سیف الملوک اور اس کا وزیر ساعد سوار ہوئے، اپنے مصاحبوں وغیرہ کو ساتھ لے کر سمندر کے کنارے سے شہر پہنچے، ان کی خوشی میں پھریرے اور شادیانے

بجاتے گئے، چالیس دن تک خوب دعوتیں رہیں۔

دعوتوں سے فارغ ہوکر بادشاہ نے کہا اے میرے بھائی کے بیٹے! کچھ تیرا دل خوش ہوا؟ میرا ملک تجھے پسند آیا؟ سیف الملوک بولا اے بادشاہ، خدا تیری عزّت کے ساتھ تیرے ملک کی عزّت کو برقرار رکھے! بادشاہ فغفور شاہ نے کہا تو ضرور کسی نہ کسی ضرورت سے یہاں آیا ہوگا۔ بتا تو میرے ملک میں کیا چاہتا ہے تاکہ میں تیری حاجت روائی کروں؟ سیف الملوک نے کہا اے بادشاہ! میری داستان عجیب و غریب ہے، میں بدیع الجمال کی تصویر پر عاشق ہوں۔ چین کے بادشاہ کو یہ سُن کر اس پر اتنا ترس آیا کہ وہ رونے لگا، پوچھا اے سیف الملوک! اب تو کیا چاہتا ہے؟ اس نے جواب دیا میں چاہتا ہوں کہ تمام سیاحوں، پردیسیوں اور ان لوگوں کو بلا جو سفر کیا کرتے ہیں، میں اس تصویر والی کے متعلق اُن سے دریافت کروں گا، ممکن ہے ان میں سے کوئی مجھے اس کا پتا نشان بتا سکے۔ بادشاہ فغفور شاہ نے والیوں، حاجبوں اور سرداروں کو حکم دیا کہ وہ تمام سیاحوں اور مسافروں کو بلا لائیں جو ملک میں ہیں۔ وہ آئے تو بڑی تعداد میں تھے۔ بادشاہ فغفور شاہ کے پاس آکر حاضر ہوئے تو سیف الملوک نے اُن سے بابل کے شہر اور آرم کے باغ کی نسبت دریافت کیا، کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ سیف الملوک کو بڑی مایوسی ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اتنے میں ایک ناخدا بولا اے بادشاہ! اگر تو اس شہر اور اس باغ کا پتا معلوم کرنا چاہتا ہے تو پہلے تجھے جزائر جانا چاہیے جو ہند کی ولایت میں ہیں۔

یہ سنتے ہی سیف الملوک نے حکم دیا کہ کشتیاں حاضر کی جائیں، لوگوں

نے اس کی تعمیل کی، اُن میں کھانا پانی وغیرہ ساری ضرورت کی چیزیں رکھ دیں اور سیف الملوک اور اس کا وزیر ساعد بادشاہ فغفور شاہ سے رخصت ہوکر سوار ہو گئے، ہوا موافق تھی چالیس دن تک خیریت اور اطمینان کے ساتھ سفر کرتے رہے لیکن اس کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ یکایک آندھی چلی، لہریں ہر طرف سے تھپیڑے مارنے لگیں، مینہ برسنے لگا، آندھی کی وجہ سے سمندر کی حالت ابتر ہو گئی اور سب کشتیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں۔ یہی حشر چھوٹی ناؤں کا بھی ہوا، سب لوگ ڈوب گئے، محض سیف الملوک چند غلاموں کے ساتھ ایک ناؤ پر باقی رہ گیا۔ اب خدا کا کرنا کہ آندھی رُک گئی، سورج نکل آیا، سیف الملوک نے اپنی آنکھیں کھولیں، سوائے آسمان اور سمندر کے کوئی کشتی نظر نہ آئی، اس نے دیکھا کہ وہ اور اُس کے چند ساتھی ایک ناؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس نے غلاموں سے پوچھا کہ کشتیاں اور چھوٹے بجرے کہاں ہیں اور میرا بھائی ساعد کدھر گیا؟ انھوں نے کہا جہاں پناہ، نہ کشتیاں بچیں، نہ بجرے اور نہ وہ لوگ جو ان میں سوار تھے، سب ڈوب کر مچھلیوں کا چارا بن چکے ہیں۔ سیف الملوک نے ایک چیخ ماری اور وہ جملہ کہا جس کا کہنے والا پشیمان نہیں ہوتا یعنی: لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ اور وہ اپنا منھ پیٹنے لگا منھ پیٹتے پیٹتے چاہتا تھا کہ سمندر میں کود پڑے، غلاموں نے اُسے روک لیا اور کہا اے بادشاہ، اس سے کیا فائدہ! تو نے اپنی خوشی سے یہ کام کیا ہے۔ اگر اپنے باپ کا کہنا مانتا تو ایسی کوئی بات پیش نہ آتی لیکن یہ بات روحوں کے پیدا کرنے والے نے ازل سے مقدر کر رکھی تھیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی...

وزیر بولا جو تیرا جی چاہے کر۔ بادشاہ نے کہا ای وزیر، ابھی جا، تمام مجرموں اور قرض داروں کو قید خانے سے رہا کر دے، اور اس کے بعد بھی جو کوئی جرم کرے گا ہم اُسے مناسب طریقے سے معاف کر دیں گے۔ علاوہ بریں ہم تین سال تک لگان نہیں لیں گے۔ تو شہر پناہ کے اِرد گرد لنگر خانے کھول دے۔ باورچیوں کو حکم دے کہ طرح طرح کے کھانوں کی دیگیں چڑھائے رکھیں، ہر قسم کا کھانا رات دن پکاتے رہیں، شہر اور گرد و نواح والے خواہ دُور کے ہوں یا نزدیک کے کھائیں پئیں اور اپنے گھروں کو لے جائیں اور یہ بھی حکم دے دے کہ سات دن تک وہ شہر کو سجاتے رکھیں، خوشیاں منائیں اور اپنی دکانیں نہ دن میں بند کریں نہ رات میں۔

وزیر فوراً اُٹھ کر باہر گیا اور جو کچھ بادشاہ نے کہا تھا بجا لایا۔ لوگوں نے شہر، قلعے اور برجوں کو بہترین طریقے سے سجایا، عمدہ عمدہ کپڑے پہنے، ہر روز کھاتے پیتے، کھیل کود اور تفریح میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ ملکہ کے حمل کے دن پورے ہو گئے اور بچّہ پیدا ہوا۔ بادشاہ عاصم نے حکم دیا کہ شہر کے تمام عالم، ادیب، منجّم، فاضل اور منشی حاضر ہوں، وہ حاضر ہو کر اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ طاق میں کوڑی پھینکی جائے، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ نجومیوں اور دائیوں کو معلوم ہو جائے کہ بچّہ پیدا ہو گیا۔ لوگ اسی انتظار میں تھے کہ ملکہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جو چاند جیسا تھا، نجومی اس کا زائچہ کھینچنے، طالع اور پیدائش کا وقت دیکھنے، جنم پتّرہ بنانے میں لگ گئے پھر سب نے اٹھ کر بادشاہ کے آگے زمین چومی، انعام مانگا اور اُسے خوش خبری دی کہ بچّہ مبارک ہے اور اس کا طالع نیک، لیکن لڑکپن میں اس پر ایک حادثہ گزرے گا

جیسے ہم کہتے ڈرتے ہیں۔ بادشاہ بولا کہو، بالکل نہ ڈرو۔ انھوں نے کہا اے بادشاہ۔ یہ بچہ اس ملک سے نکل کر پردیس جائے گا اور سمندر میں ڈوبے گا، اُسے تکلیف، قید اور پریشانیوں کا سامنا ہوگا، بہت سی مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ اس کے بعد اُسے ان چیزوں سے چھٹکارا ملے گا، اس کا مقصد حاصل ہوگا اور باقی عمر نہایت عیش و آرام سے گزرے گی، وہ اپنی رعایا اور ملکوں پر حکمرانی کرے گا اور دنیا پر اس طرح حکومت کرے گا کہ اُس کے دشمن اور حاسد جلیں گے۔

نجومیوں کی باتیں سن کر بادشاہ نے کہا یہ غیب کی باتیں ہیں اور جو اچھی بُری بات خدا اپنے بندے کے مقدر میں لکھ دیتا ہے اُسے پورا کرکے چھوڑتا ہے ممکن ہے اسے کوئی تکلیف بھی پہنچے اور عجب نہیں کہ آج سے اُس وقت تک اُسے ہزاروں خوشیاں نصیب ہوں۔ بہرحال بادشاہ نے اُن کی باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، انھیں اور تمام حاضرین کو خلعت دے کر رخصت کر دیا۔ اتنے میں وزیر فارس بادشاہ کی خدمت میں خوش خوش آیا اور اُس کے آگے زمین چوم کر کہنے لگا اے بادشاہ! خوش ہو، میری بیوی کے ہاں ابھی لڑکا پیدا ہوا ہے جو چاند کے ٹکڑے کی طرح ہے۔ بادشاہ بولا اے وزیر! جا کر اُسے لے آ تاکہ دونوں ساتھ ساتھ میرے محل میں تربیت پائیں اور اپنی بیوی کو میری بیوی کے ساتھ رکھ کہ دونوں اپنے بیٹوں کو ایک ساتھ تربیت دیں۔ وزیر اپنی بیوی اور بچے کو لے آیا اور دونوں بچے کھلائیوں اور دودھ پلائیوں کے سپرد کر دیے گئے۔ جب سات دن گزر گئے تو دونوں بادشاہ عاصم کے سامنے پیش کیے گئے اور اس سے پوچھا گیا کہ ان کا کیا نام رکھا جائے؟ بادشاہ نے کہا تم ہی ان کا نام رکھو۔

انھوں نے جواب دیا بیٹے کا نام سوائے باپ کے اور کوئی نہیں رکھتا۔ بادشاہ نے کہا میرے بیٹے کا نام میرے دادا کے نام پر سیف الملوک رکھو اور وزیر کے بیٹے کا نام ساعد۔ بادشاہ نے کھلائیوں اور دودھ پلائیوں کو انعام دیے اور کہا اُن کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور ان کی تربیت عمدہ طریقے سے کرو۔ کھلائیوں نے بہت دل لگا کر ان کی تربیت کی اور جب ان کی عمر پانچ سال کی ہوگئی تو بادشاہ نے انھیں مکتب میں مُلّا کے سپرد کیا۔ مُلّا نے انھیں پڑھنا لکھنا سکھایا یہاں تک کہ ان کی عمر دس دس سال کی ہوگئی۔ اب بادشاہ نے انھیں مختلف اُستادوں کے سپرد کیا کہ اُن دونوں کو گھوڑے پر چڑھنا، تیر چلانا، نیزہ پھینکنا، چوگان کھیلنا اور سپاہ گری کا فن سکھائیں۔ جب پندرہ پندرہ سال کے ہوتے تو وہ ہر فن میں طاق تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جو شہ سواری میں ان کی ٹکّر کا ہو، ہر ایک اکیلا ایک ایک ہزار کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ بادشاہ انھیں دیکھتا اور خوش ہوتا۔

جب ان کی عمر بیس سال کی ہوگئی تو ایک روز بادشاہ نے اپنے وزیر فارس کو تنہائی میں بلا کر کہا اے وزیر! میرے دل میں ایک بات آئی ہے جسے میں کرنا چاہتا ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ پہلے تجھ سے مشورہ لے لوں۔ وزیر بولا جو کچھ تیرے دل میں آیا ہے کر ڈال، تیری رائے مبارک ہوتی ہے۔ بادشاہ عاصم بولا اے وزیر! میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک کونے میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کروں اور اپنا ملک اور اپنی حکومت اپنے بیٹے سیف الملوک کے حوالے کردوں، وہ خوب صورت جوان، شہ سواری، عقل، ادب، دبدبے اور ریاست میں کامل ہوچکا ہے۔ اس میں تیری کیا رائے ہے؟ وزیر نے

جواب دیا تیری راے بہت اچھی، مبارک اور نیک ہی۔ اگر تو نے ایسا کیا تو میں بھی ایسا ہی کروں گا اور میرا بیٹا ساعد سیف الملوک کا وزیر ہوگا وہ بھی خوش رو جوان، علم اور راے والا ہی، دونوں کا ساتھ رہے گا، مگر ہم ان دونوں کا کام سنبھالے رہیں گے اور کوتاہی کرنا تو درکنار انھیں سیدھے راستے پر چلاتے رہیں گے۔ بادشاہ عاصم نے وزیر سے کہا خط لکھ کر پیادوں کے ہاتھ ہر اقلیم، ملک، قلعے اور گڑھی کو روانہ کردے جو ہماری حکومت میں ہیں اور ہر بڑے آدمی کو حکم دے کہ وہ فلاں مہینے میں آکر میدان فیل میں حاضر ہوں۔ وزیر نے فوراً جاکر تمام والیوں، قلعوں کے سرداروں اور جو جو بادشاہ عاصم کے ماتحت تھے ان کے نام خط لکھے کہ وہ سب فلاں مہینے میں حاضر ہوں اور اسی طرح سے شہر کے بھی تمام دور اور نزدیک والوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب میعاد کے زیادہ دن گزر چکے اور کم باقی رہ گئے تو بادشاہ عاصم نے فراشوں کو حکم دیا کہ میدان میں خیمے لگائیں، بہترین طریقے سے آراستہ کریں اور وہ بڑا تخت لگائیں جس پر بادشاہ عید کے دن بیٹھا کرتا ہی۔ انھوں نے فوراً ہر حکم کی تعمیل کی، تخت لگایا اور نواب، حاجب اور امرا باہر آئے۔ بادشاہ نے نکل کر کہا لوگوں میں منادی کردی جائے کہ میدان میں آجائیں۔ تمام امیر، وزیر، صوبہ دار اور جاگیر دار میدان میں آگئے اور دستور کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں درجہ بدرجہ بعض کھڑے رہے اور بعض بیٹھ گئے۔ جب سب لوگ حاضر ہوچکے تو بادشاہ نے دسترخوان بچھانے کا حکم دیا، دسترخوان بچھے سب نے کھایا پیا اور بادشاہ کو دعا دی۔

سات سو پینسٹھویں رات

سات سو پینسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
غلاموں نے کہا روحوں کو پیدا کرنے والے نے یہ بات ازل سے مقدر
کر رکھی تھی، بندہ اس کے لکھے کو مٹا نہیں سکتا۔ تیری پیدایش کے وقت
نجومیوں نے تیرے باپ سے کہا تھا کہ یہ ساری مصیبتیں تیرے بیٹے کو
جھیلنی ہوں گی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جب تک یہ بلا
ہم سے ٹلے صبر کریں۔ سیف الملوک نے کہا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ
الْعَلِیِّ الْعَظِیْم، جو کچھ خدا نے مقدر کر دیا ہے اس سے چھٹکارا نہیں۔ یہ
کہہ کر وہ سوچ میں پڑ گیا، آنسو لڑی بند اس کے رخساروں پر بہنے لگے
اور وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ جب وہ جاگا تو اس نے کھانا مانگا۔
کھانا آیا۔ اس نے کھایا۔ ناؤ برابر چلی جا رہی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ
انھیں کدھر لیے جا رہی ہے۔ اسی طرح ایک مدت تک ناؤ کو موجیں اور
ہوا دن رات بہائے لیے چلی گئیں یہاں تک کہ کھانے پینے کا سامان
ختم ہو گیا، وہ کہیں کے کہیں جا پڑے، بھوک، پیاس اور پریشانی سے
عاجز آ گئے۔ ایک دن دور سے ایک جزیرہ دکھائی دیا اور ہوا انھیں اسی
طرف لے چلی، وہاں پہنچ کر انھوں نے لنگر ڈال دیا، بجرے میں ایک
شخص کو چھوڑ کر باقی لوگ اترے۔ جزیرے کے اندر داخل ہوئے تو انھیں
طرح طرح کے بے شمار میوے نظر پڑے اور انھوں نے پیٹ بھر کر کھائے۔
میوے کھا رہے تھے کہ انھیں درختوں کے نیچے بیٹھا ہوا ایک شخص
دکھائی دیا، بڑا لمبا تڑنگا اور عجیب الخلقت تھا، داڑھی اور تمام بدن سفید

اس نے ایک غلام کو نام لے کر آواز دی اور کہا کہ یہ پھل نہ کھا کچے ہیں، میرے پاس آ، میں یہ پکے ہوئے پھل تجھے کھانے کے لیے دوں۔ غلام کی نظر اس پر پڑی تو وہ سمجھا کہ یہ بھی انھیں لوگوں میں سے ہوگا جو ڈوب گئے اور یہاں آ کر نکلا ہے، وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا، اُس کے پاس پہنچا۔ غلام کو کیا معلوم تھا کہ غیب میں اُس کے لیے کیا مقدر ہو چکا ہے اور اس کی پیشانی پر کیا لکھا ہے! جوں ہی غلام اس شخص کے قریب پہنچا تو وہ اُچھل کود کر اُس کے کندھے پر چڑھ بیٹھا اور ایک ٹانگ اُس کی گردن میں لپیٹ کر دوسری پیٹھ پر لٹکا دی اور کہا چل، اب میں تجھے چھوڑوں گا نہیں اور تو ہمیشہ کے لیے میرا گدھا بنا رہے گا۔ یہ دیکھ کر غلام نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور رو رو کر کہنے لگا ہائے میرے آقا! تم لوگ اپنی جان لے کر اس جنگل سے بھاگو، یہاں کا ایک شخص میرے کندھے پر چڑھ بیٹھا ہے اور دوسرے تمھاری طرف آرہے ہیں وہ بھی اسی طرح تم پر سوار ہو جائیں گے۔ غلام کی یہ بات سن کر سب کے سب بھاگے اور بجرے میں سوار ہو گئے لیکن ان لوگوں نے سمندر میں بھی ان کا پیچھا کیا اور کہنے لگے کہ تم کہاں بھاگے جاتے ہو؟ آگر ہمارے ساتھ رہو تاکہ ہم تمھارے اوپر سوار ہوں، تمھیں کھلائیں پلائیں اور تم ہمارے گدھے بنے رہو۔ یہ لوگ ناؤ کو تیز تیز سمندر میں کھینے لگے یہاں تک کہ وہ اُن سے دور نکل گئے اور خدا پر بھروسا کر کے آگے چل دیے۔

ایک مہینے تک اُن کی یہی حالت رہی پھر انھیں ایک اور جزیرہ نظر آیا، وہ اس میں اُترے، انھوں نے دیکھا کہ وہاں قسم قسم کے پھل ہیں۔ وہ ان پھلوں کو کھا ہی رہے تھے کہ اُنھیں دور سے کوئی چیز چمکتی ہوئی

دکھائی دی۔ اُس کے قریب پہنچے اور غور سے دیکھا تو وہ ایک بدصورت سی چیز چاندی کے ستون جیسی تھی۔ ایک غلام نے اُسے اپنے پاؤں سے ٹھکرایا وہ آدمی نکلا جس کی آنکھیں لمبی لمبی، سر چپٹا ہوا، ایک کان اوڑھے ہوئے تھا کان کیا اوڑھنا اور بچھونا ہے جب وہ سوتا تو ایک کان اپنے نیچے بچھا لیتا اور دوسرا اوڑھ لیتا۔ اس شخص نے غلام کو پکڑ لیا جس نے اُسے ٹھوکر ماری تھی اور اُسے لے کر جزیرے کے اندر چلا گیا۔ وہاں سب اسی طرح کے بھوت پریت رہتے اور آدم خور تھے۔ اس غلام نے بھی اپنے ساتھیوں کو آواز دی کہ اپنی اپنی جان لے کر بھاگو، یہ بھوتوں کا جزیرہ ہے جو انسانوں کو کھا جاتے ہیں اور وہ مجھے کاٹ کر کھانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ سب بھاگے اور پھلوں کو چھوڑ چھوڑ ناؤ پر سوار ہو گئے، کئی دن تک سفر کرتے کرتے ایک اور جزیرہ دکھائی دیا، وہاں اُترے تو سامنے ایک اونچا پہاڑ تھا، اُس کے اوپر چڑھے تو انھیں ایک گنجان جنگل نظر آیا۔ بھوکے تو تھے ہی پھلوں پر ایسے آنکھیں بند کرکے گر سے کہ آس پاس کی کچھ خبر نہ رہی، انھوں نے دیکھا بھی نہیں اور درختوں میں سے بہت سے ڈراؤنی شکل والے لمبے تڑنگے لوگ آپہنچے۔ ہر ایک پچاس پچاس ہاتھ لمبا تھا اور دانت ہاتھی کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ ناؤ والوں کو گھیر کر وہ ایک شخص کے پاس لے گئے جو ٹیلے پر ایک کالا لمبا کپڑا پہنے بیٹھا ہوا تھا، اردگرد بہت سے زنگی کھڑے تھے انھوں نے سیف الملوک اور اس کے غلاموں کو پکڑ کر اپنے بادشاہ کے آگے پیش کیا اور کہنے لگے ہم نے ان چڑیوں کو درختوں کے بیچ میں پایا ہے۔ بادشاہ بھوکا تھا، اس نے غلاموں میں سے دو کو پکڑ کر ذبح کیا

اور کھا گیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو چھیاسٹھویں رات

سات سو چھیاسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
اُن کے بادشاہ نے دو غلاموں کو پکڑا اور انھیں ذبح کر کے کھا گیا۔ یہ
دیکھ کر سیف الملوک کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے؛ وہ رونے اور ٹھنڈے
سانس بھرنے لگا۔ بادشاہ اس کے رونے کی آواز سُن کر بولا یہ چڑیاں بڑی
خوش آوازی سے گاتی ہیں اسے ان کی بولی بہت پسند ہے۔ اب انھوں
نے ایک ایک کو ایک پنجرے میں بند کیا اور پنجرے بادشاہ کے سر کے اوپر
لٹکا دیے کہ وہ ان کی بولی سُنے۔ سیف الملوک اور اُس کے غلام پنجرے
میں بند ہو گئے۔ زنگی اُنھیں کھانا پانی دینے لگے۔ وہ کبھی روتے، کبھی
ہنستے، کبھی باتیں کرتے اور کبھی چُپ ہو جاتے۔ اِدھر ان کی یہ حالت،
اُدھر زنگیوں کا بادشاہ ان کی آوازوں کے مزے لیتا۔ اسی طرح سے وہ
مدت تک رہے۔

زنگیوں کے بادشاہ کی ایک بیٹی تھی جس کا بیاہ کسی دوسرے جزیرے
میں ہوا تھا۔ اُسے جو خبر لگی کہ باپ کے پاس نہایت خوش گلو چڑیاں ہیں
تو اس نے آدمی بھیج کر اپنے باپ سے ان میں سے کچھ چڑیاں منگوائیں۔
بادشاہ نے سیف الملوک اور تین غلاموں کو چار پنجروں میں بند کر کے
بھیج دیا۔ یہ انسانی چڑیاں لڑکی کے پاس پہنچیں تو اس نے بہت پسند کیا
اور حکم دیا کہ انھیں اس کے سرہانے کسی جگہ ٹانگ دیا جائے۔ سیف الملوک

اپنی حالت اور اپنی پچھلی عزت کا خیال کر کے رونے لگا، تینوں غلام بھی رونے لگے۔ ادھر وہ رو رہے تھے، اُدھر شہزادی سمجھتی تھی کہ وہ گا رہے ہیں۔ شہزادی کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی کوئی شخص مصر یا کسی دوسرے ملک سے آتا اور وہ اُسے پسند کرتی تو اُس کی بڑی قدر و منزلت کرتی۔ خدا کا کرنا شہزادی نے سیف الملوک کو دیکھا تو اُس کا حُسن و جمال اور قد و قامت اُسے بہت بھایا، اُس نے حکم دیا کہ انھیں عزت کے ساتھ رکھا جائے۔ اتفاق سے ایک دن جب وہ سیف الملوک کے ساتھ تنہا تھی اس نے کہا کہ میرے ساتھ ہم بستر ہو، سیف الملوک نے نہ مانا اور جواب دیا اے میری آقا، میں پردیسی ہوں اور محبت کا مارا جس سے مجھے عشق ہے اُس کے سوا کسی اور سے وصال کی تمنا نہیں رکھتا، شہزادی اُسے پھسلاتی اور محبت کا اظہار کرتی مگر وہ نہ مانتا اور اُسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہ دیتا، کسی حالت میں اُس کے وصال پر راضی نہ ہوتا۔ جب شہزادی کی کوئی تدبیر اُس پر نہ چلی تو وہ اس سے اور اُس کے غلاموں سے بہت ناراض ہوتی۔ جل کر کہہ دیا کہ اب ان کی خاطر نہ کی جائے بلکہ یہ پانی اور لکڑیاں ڈھو کر لایا کریں۔ چار سال تک ان کی یہی حالت رہی، سیف الملوک اُکتا گیا اور اس نے بادشاہ کے پاس ایک شخص کو سفارش کے لیے بھیجا تاکہ شہزادی انھیں آزاد کر دے، وہ اپنی راہ لیں اور اس مصیبت سے انھیں چھٹکارا ہو۔ شہزادی نے سیف الملوک کو بلا کر کہا اگر تو میرا ارمان نکال دے تو میں تجھے اس مصیبت سے آزاد کر دوں گی، تو اپنے وطن صحیح و سالم پہنچ جائے گا۔ غرض کہ شہزادی نے بڑی خوشامد کی، بہت پھسلایا لیکن سیف الملوک نے اس کا ارمان پورا نہ کیا۔ شہزادی نے ناراض ہو کر سیف الملوک کی طرف

منھ پھیر لیا اور وہ سب اُسی طرح جزیرے میں زندگی بسر کرتے رہے۔
جزیرے والوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ شہزادی کی چڑیاں ہیں اس لیے کسی
کی مجال نہ تھی کہ انھیں نقصان پہنچاتے۔ شہزادی کو ان کی طرف سے
اطمینان تھا اور یہ یقین کہ وہ اس جزیرے سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ وہ
بھی دو دو تین تین دن غائب رہتے اور جنگل میں پھر کر لکڑیاں جمع کرکے
شہزادی کے باورچی خانے میں لاتے۔ پانچ سال تک یہی حال رہا۔

ایک دن کا ذکر ہو سیف الملوک اور اُس کے غلام سمندر کے
کنارے بیٹھے ہوئے اپنا دُکھڑا رو رہے تھے کہ سیف الملوک کو اپنی ماں،
باپ اور بھائی ساعد کی یاد آنے لگی، اُن کی جدائی میں رونے لگا اور
خوب بلک بلک کر رو دیا، غلام بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ انھوں نے
کہا جہاں پناہ! آخر ہم کب تک رویا کریں گے؟ رونے دھونے سے کیا
فائدہ! یہ باتیں تو خدا نے ہماری قسمت میں لکھ دی ہیں، اور قلم نے وہی
لکھا ہو جو خدا کا حکم ہو۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ ممکن ہو کہ
جس خدا نے ہمیں اس بلا میں گرفتار کیا ہو وہی ہمیں اس سے چھٹکارا
بھی دے۔ سیف الملوک بولا بھائیو! اس بیسوا کے پھندے سے آخر کس طرح
چھٹکارا پائیں! خدا ہی اپنے فضل سے چھڑا دے تو چھڑا دے ورنہ مجھے
تو کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہاں ایک ترکیب ہو سکتی ہو کہ ہم یہاں
سے بھاگ چلیں اور اس مصیبت سے نجات پائیں۔ غلاموں نے کہا
جہاں پناہ، اس جزیرے سے بھاگ کر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟ جدھر دیکھو
بھوت ہی بھوت ہیں اور انسانوں کو کھانے والے۔ جہاں بھی جائیں گے
وہ ہمیں پکڑ لائیں گے، پھر یا تو ہمیں کھا جائیں گے یا پکڑ کر پھر یہیں لے آئیں گے

اور شہزادی ہم پر سخت ناراض ہوگی۔ سیف الملوک بولا میں تمھارے لیے ایک چیز بناؤں گا، ممکن ہو خدا کی مدد سے ہمیں نجات ملے اور ہم اس جزیرے سے نکل بھاگیں۔ انھوں نے پوچھا تو کیا کرنا چاہتا ہو؟ اس نے جواب دیا ہمیں چاہیے کہ درخت کاٹیں، ان کی چھال سے رسّیاں بٹیں، لکڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھیں اور ان کی کشتی بناکر سمندر میں ڈال دیں، اس میں میوے بھر لیں اور سوار ہو جائیں ممکن ہو کہ اس طرح سے خدا ہمیں خوشی نصیب کرے، وہ ہر بات پر قادر ہو۔ خدا کرے کہ ہوا موافق ہو، ہمیں ہند پہنچا دے اور ہم اس ملعونہ سے چھٹکارا پا جائیں! سب نے کہا یہ دلے بہت ٹھیک ہو، وہ خوش ہو گئے اور فوراً کشتی کے لیے لکڑیاں کاٹنے لگے۔ اپنی کشتی کے لیے شہتیر بھی بناتے، رسّیاں بھی بٹتے اور شام کو کچھ لکڑیاں لے کر شہزادی کے باورچی خانے بھی پہنچ جاتے، ایک مہینے تک وہ یہی کیا کیے یہاں تک کہ کشتی بن کر تیار ہو گئی۔ اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو سڑسٹھویں رات

سات سو سڑسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا او نیک نہاد بادشاہ! کشتی بن چکی تو انھوں نے اُسے سمندر میں ڈالا، جزیرے کے درختوں سے پھل توڑ کر اس میں بھر لیے کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ انھوں نے کیا بنایا ہو وہ ایک روز شام کے وقت سوار ہو گئے۔ چار مہینے تک کشتی سمندر میں چلتی رہی، انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ انھیں کہاں لیے جا رہی ہو، کھانے کی چیزیں

ختم ہوگئیں، بھوک اور پیاس کی شدت سے تنگ آ گئے۔ ساتھ ہی سمندر
میں تلاطم آ گیا۔ پانی موجیں مارنے لگا، ایک ڈراؤنے مگرمچھ نے اچک کر
ایک غلام کو پکڑ لیا اور اُسے نگل گیا۔ یہ دیکھ کر سیف الملوک رونے لگے۔ اب
کشتی میں صرف دو آدمی رہ گئے، وہ اور ایک غلام اور مگرمچھ کے ڈر سے
ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اسی طرح چلے جا رہے تھے کہ ایک دن انھیں
ایک بڑا خوفناک اونچا پہاڑ دکھائی دیا جس کے پیچھے ایک جزیرہ
نظر آتا تھا، وہ تیز تیز اُس کی طرف بڑھے۔ انھیں بڑی خوشی تھی کہ وہاں
جاکر اُتر پڑیں گے۔ اتنے میں پھر سمندر میں تلاطم آیا، لہریں اُٹھنے لگیں، اس
کی صورت بدل گئی اور ایک مگرمچھ نے سر نکالا۔ سیف الملوک کا جو ایک
غلام باقی رہ گیا تھا اُسے بھی پکڑ کر نگل گیا اور سیف الملوک جزیرے
میں پہنچتے پہنچتے اکیلا رہ گیا۔ بڑی مشکل سے پہاڑ پر چڑھا اور اِدھر
اُدھر دیکھنے لگا، اُسے ایک جنگل نظر آیا جنگل میں جاکر درختوں کے
پھل کھانے لگا۔ پھل کھا ہی رہا تھا کہ اُس نے درختوں کے اوپر بیس
سے زیادہ بڑے بڑے بندر دیکھے جو خچروں سے بھی بڑے تھے سیف الملوک
ڈر گیا، بندروں نے اُتر کر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اشارے
سے کہا کہ ہمارے پیچھے پیچھے آ۔ آگے آگے چلنے لگے۔ سیف الملوک
پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا اور بندر آگے آگے کہ ایک بلند اور مضبوط قلعے
کے پاس پہنچے۔ بندر اس میں داخل ہوئے۔ سیف الملوک بھی ان کے پیچھے
پیچھے تھا۔ اس نے وہاں طرح طرح کی نفیس چیزیں، جواہرات اور معدنیات
اس قدر دیکھیں جن کے بیان سے زبان گونگی ہے، اس قلعے میں اُسے
ایک جوان نظر آیا جس کی ابھی داڑھی مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں لیکن وہ

بہت بلند بالا تھا۔ سیف الملوک اس سے مانوس ہو گیا کیوں کہ سوائے اس
جوان کے سارے قلعے میں کوئی انسان نہ تھا۔
جب جوان کی نظر سیف الملوک پر پڑی تو وہ اُسے بہت پسند آیا،
اس نے پوچھا تیرا نام کیا ہے، کس ملک کا رہنے والا ہے اور یہاں کیسے آیا؟
مجھ سے اپنا سارا ماجرا کہہ دے، کچھ چھپا یو نہیں۔ سیف الملوک نے جواب
دیا خدا کی قسم میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا، نہ میرا یہاں آنے کا
ارادہ تھا، نہ میری یہ خواہش تھی کہ میں جگہ جگہ سیر کرتا پھروں میرا مقصد
تو کچھ اور ہی تھا۔ جوان بولا اچھا اپنا مقصد بیان کر؟ سیف الملوک
نے کہا میں مصر کا رہنے والا ہوں، میرا نام سیف الملوک، میرے
باپ کا بادشاہ عاصم بن صفوان ہے اور اس نے اپنی ساری کہانی شروع
سے آخر تک سنادی۔ جوان نے جو سیف الملوک کی کہانی سنی تو وہ اُٹھ کھڑا
ہوا اور کہنے لگا، جہاں پناہ، میں بھی مصر میں رہا ہوں، میں نے وہاں
سنا تھا کہ تو چین گیا ہے۔ کہاں چین اور کہاں یہ ملک! عجیب و غریب
بات ہے۔ سیف الملوک بولا تو ٹھیک کہتا ہے لیکن میں چین پہنچنے کے
بعد ہند روانہ ہوا تھا، راہ میں طوفان آیا، سمندر متلاطم ہوا جتنی کشتیاں
میرے ساتھ تھیں سب چکنا چور ہو گئیں۔ آخر میں اس نے یہ کہا اب
میں تیرے پاس یہاں پہنچا ہوں۔ جوان نے کہا اے بادشاہ زادے!
غربت اور اس کی مصیبتیں تیرے اوپر کافی گزر چکی ہیں لیکن خدا کا شکر
کر کہ تو یہاں پہنچ گیا۔ اب میرے ساتھ ٹھہر، میں تجھے محبت سے رکھوں گا
اور جب میں مر جاؤں گا تو تو اس ملک کا بادشاہ ہو جائے گا جس میں بھا
یہ اتنا بڑا جزیرہ ہے جس کی حد نہیں اور یہ بندر بڑے کاریگر ہیں، تجھے

ہر چیز یہاں مل سکتی ہے۔ سیف الملوک نے کہا بھائی، جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے میں کسی جگہ ٹھہر نہیں سکتا خواہ مجھے ساری دنیا کا چکر ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔ ممکن ہے کہ خدا میری مراد پوری کر دے یا میں اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں میری موت لکھی ہو اور مر جاؤں۔ جوان نے ایک بندر کی طرف اشارہ کیا، وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد بہت سے بندروں کو ساتھ لے کر آیا جن کی کمروں میں ریشمی پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے آ کر دسترخوان بچھایا، سو کے قریب سونے اور چاندی کے برتن لا کر رکھے جن میں طرح طرح کے کھانے تھے۔ کھانے چننے کے بعد بندر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے غلام بادشاہوں کے آگے کھڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد جوان نے حاجبوں سے کہا بیٹھ جائیں، سوائے اُس کے جو خدمت کے لیے مامور تھا سب بیٹھ گئے۔ جب وہ کھا کر سیر ہو گئے تو دسترخوان بڑھایا گیا، سونے کے تشت اور لوٹے لائے گئے۔ انھوں نے ہاتھ دھوئے۔ پھر تقریباً چالیس شیشے شراب کے لائے گئے جن میں سے ہر ایک میں الگ الگ قسم کی شراب تھی۔ سب نے شراب پی، مزے اُڑائے، خوش ہوئے اور ان کا وقت اچھا گزرا کیوں کہ جب تک وہ کھایا پیا کیے بندر ناچتے اور کھیلتے رہے۔ سیف الملوک کو بڑا تعجب ہوا اور وہ اپنی مصیبتیں بھول گیا، اور شہرزاد کو صبح ہوئی ......

سات سو اڑسٹھویں رات

سات سو اڑسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!

سیف الملوک بندروں کا ناچ دیکھ کر اتنا متعجب ہوا کہ وہ اپنی غربت اور غربت کی مصیبتیں بھول گیا۔ رات ہوئی تو بندروں نے موم بتیاں جلا کر سونے چاندی کے شمع دانوں میں رکھیں، نُقل اور میووں کی رکابیاں لائے دونوں نے کھایا اور سونے کا وقت آیا تو سو گئے۔ سویرا ہوا تو جوان اٹھا اور سیف الملوک کو جگا کر کہنے لگا جھروکے سے سر نکال کر دیکھ کیا دکھائی دیتا ہے۔ سیف الملوک نے دیکھا کہ سارا میدان اور جنگل بندروں سے بھرا ہوا ہے جن کی تعداد سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی وہ کہنے لگا یہ تو بے شمار بندر ہیں چاروں طرف، آخر ان کے جمع ہونے کا کیا سبب ہے؟ جوان نے کہا ان کا یہ دستور ہے جزیرے کے سارے بندر یہاں آجاتے ہیں بلکہ ان میں ایسے بھی ہیں جو دو دو تین تین دن کی راہ طے کر کے آئے ہوں گے۔ ہر سنیچر کو وہ یہاں اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ میں سو کر اٹھوں اور اپنا سر اس جھروکے سے باہر نکالوں۔ جب اُن کی نظر مجھ پر پڑتی ہے تو وہ میرے آگے زمین چومتے ہیں اور پھر اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا سر جھروکے میں سے نکالا، بندروں نے اس کے آگے زمین چومی اور چلے گئے۔

سیف الملوک جوان کے پاس پورے ایک مہینے ٹھیر کر رخصت ہوا۔ جوان نے سو کے قریب بندروں کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ جائیں، انھوں نے اس کے ساتھ سفر کر کے سات دن میں اُسے اپنے جزیروں کی سرحد تک پہنچا دیا اور واپس اپنے گھر لوٹ گئے۔ سیف الملوک چار مہینے پہاڑوں، ٹیلوں، جنگلوں اور بیابانوں میں سفر کرتا رہا، کبھی بھوکا رہتا، کبھی گھاس پات سے پیٹ بھرتا، کبھی درختوں کے پھلوں سے۔ وہ اپنے کیے پر پچھتاتا تھا کہ

کہیں جوان کے پاس سے چلا آیا۔ اسی سوچ میں چلتے چلتے کھڑا ہوگیا۔ دل میں ٹھنی کہ لوٹ جائے، اتنے میں دور سے کوئی کالی سی چیز چمکتی ہوئی دکھائی دی اور وہ کہنے لگا یہ کوئی آباد شہر تو نہیں؟ اور کیا ہوسکتا ہے؟ جب تک میں دیکھ نہ لوں کہ یہ کیا چیز ہے اُس وقت تک لوٹ کر نہیں جاؤں گا اور وہ اُس کے قریب پہنچا، وہ ایک عالی شان محل تھا، وہی عمارت جو یافث بن نوح علیہ السلام نے بنائی تھی جس کا ذکر خدا نے اپنی بزرگ کتاب میں کیا ہے کہ وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيدٍ. سیف الملوک محل کے دروازے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ خدا جانے اس محل کے اندر کیا ہوگا اور یہاں کس کی بادشاہت ہوگی۔ یہ پتا کس سے چلے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں انسان رہتے ہیں یا جنات۔ دیر تک بیٹھا یہی سوچتا رہا لیکن نہ کسی کو اندر جاتے دیکھا نہ باہر نکلتے۔ بالآخر وہ خدا کا نام لے کر محل میں داخل ہوا اور سات دہلیزیں گنتا چلا گیا، کوئی شخص نظر نہ آیا۔ اب اُسے داہنے ہاتھ پر تین دروازے دکھائی دیے اور سامنے ایک دروازہ جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھا، پردے کو اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اندر چلا گیا، دیکھا کہ وہاں ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں ریشمی قالینیں بچھی ہوئی ہیں، صدر میں ایک سونے کا تخت ہے جس پر چاند کی سی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے، اس کا لباس شاہانہ ہے اور وہ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے پہلی رات کی دلھن۔ تخت کے نیچے چالیس دستر خوان جن پر سونے چاندی کے برتن چنے ہوئے ہیں اور سب میں عمدہ عمدہ کھانے۔ سیف الملوک لڑکی کی طرف بڑھا اور سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا تو انسان ہے یا جن؟ سیف الملوک بولا بہترین انسانوں میں سے کیوں کہ

میں بادشاہ اور بادشاہ زادہ ہوں۔ لڑکی نے کہا تو یہاں کس کام سے آیا ہی؟ لیکن پہلے کھانا کھالے، اُس کے بعد شروع سے آخر تک اپنی کہانی سنائیو اور یہ بھی سنائیو کہ تو یہاں تک کس طرح پہنچا۔ سیف الملوک نے دسترخوان پر بیٹھ کر سرپوش اُٹھائے اور بھوکا تو تھا ہی اتنا کھایا کہ پیٹ بھر گیا، ہاتھ دھوئے اور تخت پر چڑھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

لڑکی نے پوچھا نے اب کہہ تو کون ہی، تیرا کیا نام ہی، کہاں سے آیا ہی اور تجھے یہاں کون لایا؟ سیف الملوک نے جواب دیا میری کہانی تو بڑی لمبی ہی۔ لڑکی بولی کہہ تو سہی کہ تو کہاں سے آیا، کیوں آیا اور تیرا مقصد کیا ہی؟ سیف الملوک نے کہا پہلے تو بتا کہ تو کون ہی، تیرا کیا نام ہی، تجھے کون لایا ہی اور تو یہاں اکیلی کیوں رہتی ہی؟ لڑکی بولی میرا نام دولت خاتون ہی، ہند کے بادشاہ کی بیٹی ہوں جو سرندیپ میں رہتا ہی۔ میرے باپ کا بہت بڑا خوب صورت باغ ہی، ویسا خوب صورت باغ نہ ہند میں ہی نہ اس کے قرب و جوار میں، اس کے اندر ایک بڑا حوض ہی۔ ایک دن میں اپنی کنیزوں کے ساتھ اس باغ میں گئی، ہم سب کپڑے اتار کر حوض کے اندر گئے اور وہاں کھیلنے کودنے لگے۔ اتنے میں یک بہ یک کوئی چیز بادل کی طرح میرے اوپر اتری، مجھے کنیزوں کے درمیان میں سے اٹھا کر ہوا میں اڑ گئی اور کہنے لگی ای دولت خاتون، ڈر نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر اڑنے کے بعد اس نے مجھے زمین پر اُتارا فوراً اپنی صورت بدل کر ایک خوب صورت اور خوش پوشاک جوان کی صورت اختیار کر لی اور مجھ سے کہا کہ کیا تو مجھے پہچانتی ہی؟ میں نے کہا ای میرے آقا! نہیں۔ وہ بولا میں جنوں کے بادشاہ ملک ازرق کا بیٹا ہوں۔

میرا باپ قلعہ قلزم میں رہتا ہے، اس کے حکم میں چھ لاکھ جن ہیں جو ہوا میں بھی اڑ سکتے اور زمین کے اندر بھی گھس سکتے ہیں۔ آج اتفاق سے میں اُدھر گزر رہا تھا کہ میری نظر تجھ پر جا پڑی، میں عاشق ہو گیا اور اُتر کر تجھے تیری کنیزوں کے درمیان سے اُٹھا کر اس مضبوط قلعے میں لے آیا، یہی میرا گھر ہے اور میں یہیں رہتا ہوں۔ یہاں تک کسی کی پہنچ نہیں، نہ جنوں کی، نہ انسانوں کی اور ہند سے یہاں تک تو ایک سو بیس برس کا راستہ ہے۔ یقین کر کہ اب تو اپنے ماں باپ کا وطن کبھی دیکھ نہیں سکتی لہٰذا اطمینان سے میرے پاس اس جگہ رہ، جو کچھ تو چاہے گی میں لاکر تیرے لیے حاضر کردوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے گلے لگایا اور میرا منھ چوما، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

سات سو آٹھویں رات

سات سو آٹھویں رات ہوتی تو اُس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! لڑکی نے سیف الملوک سے کہا کہ جنوں کے شہزادے نے مجھے گلے لگایا، میرا منھ چوما اور مجھ سے کہا کہ کسی بات کا خوف نہ کر اور اتنا کہنے کے بعد وہ میرے پاس سے چلتا بنا، تھوڑی دیر کے بعد یہ دسترخوان، فرش اور قالینیں لے کر آیا۔ اب وہ ہر منگل کو میرے پاس آتا ہے، تین روز ٹھیرتا ہے اور چوتھے روز عصر کے وقت تک ٹھیر کر چلا جاتا ہے، منگل تک غائب رہتا ہے اور پھر اسی طرح آتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو میرے ساتھ بیٹھ کر کھاتا پیتا، مجھے گلے لگاتا اور میرا منھ چومتا ہے اور بس۔ میں اُسی طرح اب تک باکرہ ہوں جیسا کہ

سے مجھے خدا نے پیدا کیا ہے وہ میرے ساتھ اور کوئی حرکت نہیں کرتا۔ میرے باپ کا نام تاج الملوک ہے اُسے نہ میرا حال معلوم ہے نہ پتا۔ میری کہانی تو ختم ہوئی اب تو اپنی کہانی سُنا۔ سیف الملوک بولا میری کہانی بڑی طول طویل ہے، میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اُسے بیان کیا تو بڑی دیر لگے گی اور جن آجائے گا۔ لڑکی نے کہا وہ تو ابھی تیرے آنے سے گھڑی بھر پہلے گیا ہے، منگل سے پہلے نہیں آئے گا۔ تو اطمینان سے بیٹھ اور آپ بیتی شروع سے لے کر آخر تک سنا دے۔ سیف الملوک نے اپنی کہانی اسے سنانی شروع کی۔ جب وہ بدیع الجمال کے قصے پر پہنچا تو لڑکی کے آنسو ڈبڈبا آئے، وہ کہنے لگی اے بدیع الجمال، مجھے تیری طرف سے ایسا گمان نہ تھا، اے بدیع الجمال! ہائے افسوس! کیا تو نے کبھی مجھے یاد نہیں کیا، نہ یہ پوچھا کہ میری بہن دولت خاتون کہاں چلی گئی ہے یہ کہہ کر وہ زار زار رونے اور بدیع الجمال کے نہ یاد کرنے پر فریاد کرنے لگی۔

سیف الملوک نے کہا اے دولت خاتون، تو انسان ہے اور بدیع الجمال جن، وہ تیری بہن کیسے ہوئی؟ اس نے جواب دیا وہ میری دودھ شریک بہن ہے، اس طرح کہ میری ماں ایک دن اس باغ میں سیر کر رہی تھی کہ اُسے زچہ کا درد معلوم ہوا اور میں اُسی باغ میں پیدا ہوئی۔ اتفاقاً بدیع الجمال کی ماں بھی اپنے غلاموں کے ساتھ اُس وقت اُسی باغ میں تھی اسے بھی زچہ کا درد شروع ہو گیا، اس نے باغ کے ایک کونے میں جا کر بدیع الجمال کو جنا اور اپنی چند کنیزوں کو میری ماں کے پاس بھیج کر کھانا اور دوسری چیزیں جن کی ضرورت بچہ جننے کے وقت ہوتی ہے منگوائیں۔ میری ماں نے تمام چیزیں بھیج دیں اور اسے مدعو کیا۔ وہ آٹھ گھڑی ہوئی اور بدیع الجمال کو

لیے میری ماں کے پاس آئی، میری ماں نے اُسے دُودھ پلایا۔ اس کے بعد وہ اور اس کی ماں دو مہینے باغ میں ہماری مہمان رہیں۔ جاتے وقت اُس کی ماں نے میری ماں کو کچھ چیزیں دے کر کہا کہ جب تجھے میری ضرورت ہو تو میں اسی باغ کے اندر حاضر ہو جاؤں گی۔ بعد اُن کا یہ دستور رہا کہ وہ ہر سال ہمارے ہاں آتیں اور کچھ دن ٹھیر کر اپنے وطن چلی جاتیں۔ اے سیف الملوک، اگر میں اپنی ماں کے پاس ہوتی، اپنے وطن میں تجھ سے ملتی، ہم دونوں ساتھ ہوتے تو میں کوئی نہ کوئی تدبیر نکال کر تیری مراد پوری کر دیتی لیکن میں تو اب یہاں پڑی ہوں اور انھیں میری خبر تک نہیں۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ میں یہاں ہوں تو وہ مجھے چھڑا سکتے تھے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں میں کیا کر سکتی ہوں! سیف الملوک بولا اُٹھ، میرے ساتھ بھاگ چل، جہاں خدا کی مرضی ہوگی ہم پہنچ جائیں گے۔ لڑکی نے جواب دیا یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے، خدا کی قسم اگر ہم ایک سال کی راہ بھی طے کر چکے ہوں گے تو یہ ملعون ایک پل میں ہمارے پاس پہنچ جائے گا اور ہمیں تباہ کر دے گا۔ سیف الملوک بولا اچھا میں کسی جگہ چھپ رہوں گا اور جب وہ میرے پاس سے گزرے گا میں تلوار کا وار کر کے اُسے قتل کر دوں گا۔ لڑکی بولی تو اُسے ہرگز قتل نہیں کر سکتا جب تک اُس کی رُوح زندہ ہے۔ سیف الملوک نے پوچھا اُس کی رُوح کس جگہ ہے؟ لڑکی نے کہا میں نے اس کے متعلق اُس سے بارہا پوچھا لیکن وہ ہمیشہ انکار کرتا رہا ایک بار میں نے بہت گڑگڑا کر پوچھا تو وہ ناراض ہو کر کہنے لگا تو کب تک میری رُوح کو پوچھا کرے گی؟ آخر تیرا مطلب کیا ہے؟ میں نے کہا اے حاتم! میرا تیرے بعد خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ جب تک میں

جیتی رہوں گی تیری روح کو لپٹائے رہوں گی، اگر میں تیری روح کو اپنی آنکھ کے اندر حفاظت سے نہ رکھوں تو تیرے بعد کیوں کر زندہ رہ سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہو جاتے کہ تیری روح کہاں ہے تو میں اُسے اپنی داہنی آنکھ کی طرف حفاظت سے رکھوں گی۔ یہ سن کر اس نے کہا سُن میں پیدا ہوا تو نجومیوں نے کہا کہ میری روح کی موت ایک انسانی شہزادے کے ہاتھ سے ہوگی۔ اس لیے میں نے اپنی روح کو ایک بھونرے کے پوٹے میں رکھا، بھونرے کو ایک ڈبیا میں بند کیا، ڈبیا کو ایک ڈبے میں، ڈبے کو صندوقچی میں، صندوقچی کو سات صندوقوں میں اور اسے مرمر کی سینی میں رکھ کر سینی کو اس سمندر کے کنارے گاڑ دیا ہے کیونکہ یہ کنارہ انسانوں کے ملک سے بہت دور ہے، کسی انسان کی پہنچ یہاں تک ہو نہیں سکتی۔ میں نے تجھ سے سب کچھ کہہ دیا لیکن کسی سے مت کہیو، یہ بھید فقط میرے اور تیرے درمیان رہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

سات سو سترویں رات

سات سو سترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جن کی روح کا سارا قصہ بیان کر کے دولت خاتون نے کہا کہ جن بولا یہ بھید فقط میرے اور تیرے درمیان رہے، ہم نے کہا میں کس سے جا کر کہوں گی، میرے پاس تیرے سوا آتا کون ہے جس سے کہوں۔ مگر خدا کی قسم تو نے اپنی روح ایسے مضبوط قلعے میں محفوظ کر رکھی ہے جہاں کسی کی بھی پہنچ نہیں، کوئی انسان وہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہو! اگر

فرض بھی کر لیا جائے کہ خدا نے وہی مقدر کیا ہو جو نجومی کہتے ہیں۔ پھر بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کی رسائی وہاں تک کس طرح ہو سکتی ہو۔ جن نے کہا ممکن ہو ان میں سے کوئی شخص ایسا آئے جس کی انگلی میں حضرت سلیمان بن داودؑ کی انگوٹھی ہو، وہ اس جگہ پہنچ کر اس ہاتھ کو جس میں انگوٹھی ہو پانی کے اوپر رکھے اور کہے کہ اِن ناموں کی قسم فلاں شخص کی روح نکل آئے تو وہ تابوت نکل آئے گا اور وہ صندوقوں وغیرہ کو توڑ کر بھونرے کو نکال لے گا اُس کی گردن گھونٹ دے گا اور میں مرجاؤں گا۔ سیف الملوک بولا وہ شہزادہ میں ہی ہوں، دیکھ یہ میری انگلی میں سلیمان بن داودؑ کی انگوٹھی ہو۔ اٹھ اور میرے ساتھ سمندر کے کنارے چل دیکھیں تو جو اس نے کہا جھوٹ ہو یا سچ۔ دونوں چل کھڑے ہوئے اور سمندر تک پہنچ گئے۔ دولت خاتون سمندر کے کنارے کھڑی رہی اور سیف الملوک نے پانی میں جاکر کہا میں فلاں شخص کی روح کو جو بادشاہ ازرق جن کا بیٹا ہو اُن اسما اور طلسمات کا جو اس انگوٹھی پر کندہ ہیں اور خود حضرت سلیمانؑ کا واسطہ دیتا ہوں کہ وہ باہر نکل آئے۔ یہ کہتے ہی سمندر میں موجیں اٹھیں اور تابوت باہر آگیا۔ سیف الملوک نے اُسے اٹھاکر پتھر پر دے پٹکا اور وہ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح اس نے صندوقوں اور صندوقچوں کو توڑ کر ڈبیے میں سے بھونرے کو نکال لیا اور محل میں جاکر تخت پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں ایک بڑی آندھی اٹھی اور کوئی بڑی سی چیز اُڑتی ہوئی نظر آئی جس میں سے یہ آواز آئی کہ اے شاہزادے مجھے مار نہیں زندہ رہنے دے، میں تیرا آزاد کردہ غلام رہوں گا اور تیرا مقصد پورا کر دوں گا۔ دولت خاتون بولی جن آگیا ہو، اب بھونرے کو مار ڈال۔

اگر وہ ملعون محل میں آگیا تو اُسے چھین کے گا تجھے مار ڈالے گا اور اس کے بعد مجھے بھی سیف الملوک نے بھونرے کو مسل ڈالا، وہ مرگیا اور جن محل کے دروازے پر گر کر کالی راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ دولت خاتون بولی اس ملعون کے ہاتھ سے تو چھٹکارا ہوگیا، اب کیا کرنا چاہیے؟ سیف الملوک نے کہا جس خدا نے ہمیں مصیبت میں گرفتار کیا ہو وہی ہماری مدد کرے گا اور اس بلا سے چھٹکارے کی تدبیر نکال دے گا۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور محل کے دس دروازے اکھاڑ ڈالے۔ یہ دروازے صندل اور اگر کے تھے، اس کی کیلیں سونے اور چاندی کی۔ پھر اس نے وہیں سے رسیاں لیں جو ریشم کی تھیں، دروازوں کے پٹوں کو ایک دوسرے سے ملا کر باندھا وہ اور دولت خاتون مل کر انہیں سمندر کے کنارے لے گئے اور انھیں پانی میں ڈال کر یہ کشتی کنارے سے باندھ دیا یہ کام کر کے محل میں آئے چاندی کے برتن، جواہرات، یاقوت اور عمدہ عمدہ معدنیات لیں، غرض کہ تمام چیزیں جن کا وزن کم اور قیمت زیادہ تھی لے جا کر کشتی میں رکھا، خدا پر بھروسا کر کے اس میں بیٹھ گئے اور چپو کی طرح دو لکڑیاں ہاتھوں میں لے رسیاں کھول دیں اور کھیلنے لگے۔ اس طرح وہ چار مہینے پانی پر رہے یہاں تک کہ کھانا پینا ختم ہوگیا، مصیبت کا سامنا ہوا، انھوں نے گھبرا کر خدا سے دعا کی کہ یا مالک ہمیں اس بلا سے چھٹکارا دے۔

سیف الملوک کا سفر میں یہ دستور تھا کہ سوتا تھا تو دولت خاتون کو اپنے پیچھے سلاتا اور جب کروٹ بدلتا تو تلوار بیچ میں رکھ لیتا۔ ایک رات کا واقعہ ہے سیف الملوک سو رہا تھا اور دولت خاتون جاگ رہی تھی کہ کشتی نے خشکی کی طرف رُخ کیا اور ایک بندرگاہ پر جا لگی جہاں اور بہت سی کشتیاں بھی کھڑی تھیں

دولت خاتون کی نظر کشتیوں پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک شخص ملاحوں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ باتیں کرنے والا ان کا بڑا ناخدا تھا۔ ناخدا کی باتیں سُن کر دولت خاتون کو یقین ہو گیا کہ یہ خشکی کسی شہر کا بندرگاہ ہے اور یہ کہ اب وہ دونوں آبادی میں پہنچ گئے ہیں وہ بہت خوش ہوئی اور سیف الملوک کو جگا کر کہا اُٹھ کر ناخدا سے پوچھ کہ اس شہر اور بندرگاہ کا کیا نام ہے؟ سیف الملوک جلدی سے کھڑا ہوا اور اس سے جا کر کہا بھائی، اس شہر کا کیا نام ہے، اس بندرگاہ کو کیا کہتے ہیں اور یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ ناخدا بولا پھٹکار ہو تجھ پر! اگر تجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بندرگاہ اور شہر کیا ہیں تو یہاں آیا کیوں؟ سیف الملوک بولا میں پردیسی ہوں، تاجروں کی ایک کشتی میں سفر کر رہا تھا وہ ٹوٹ گئی، جو کچھ اس میں تھا سب ڈوب گیا۔ میں ایک تختے پر بیٹھ کر یہاں پہنچا۔ اس لیے میں نے تجھ سے پوچھا ہے اور پوچھنے میں کوئی عیب نہیں۔ ناخدا نے کہا یہ شہر عماریہ ہے اور اس بندرگاہ کو کمین البحرین کہتے ہیں۔ دولت خاتون نے جو یہ نام سُنے تو بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی شکر ہے خدا کا! سیف الملوک نے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا اے سیف الملوک، خوش ہو کہ خوشی قریب ہے۔ اس شہر کا بادشاہ میرا سگا چچا ہے اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی......

سات سو اکھترویں رات

سات سو اکھترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!

دولت خاتون نے سیف الملوک سے کہا اس شہر کا بادشاہ میرا سگا چچا ہے
اور اس کا نام عالی الملوک ہے۔ اس کے بعد وہ بولی ناخدا سے پوچھ کہ کیا
اس شہر کا بادشاہ عالی الملوک خیریت سے ہے؟ اس نے پوچھا تو ناخدا نے
غصے میں آکر کہا تو تو کہتا تھا کہ میں کبھی یہاں آیا نہیں، پردیسی ہوں، پھر
تجھے اس شہر کے بادشاہ کا نام کس سے معلوم ہوا۔ ہاں وہ اچھا ہے۔ یہ سن کر
دولت خاتون خوش ہوگئی اور ناخدا کو پہچان لیا۔ اس کا نام معین الدین
تھا اور اس کے باپ کے ناخداؤں میں سے تھا جب سے دولت خاتون غائب
ہوئی تھی وہ اس کی تلاش میں دنیا بھر کا چکر لگا کر ناکام واپس ہوتے
ہوتے اس کے چچا کے شہر میں تھا۔ لڑکی نے سیف الملوک سے کہا ناخدا
سے کہہ اے ناخدا معین الدین، تیری شہزادی تجھے بلاتی ہے، آکر اس سے
بات کر۔ سیف الملوک نے اسی طرح سے اس سے خطاب کیا۔ ناخدا تیش
میں آگیا اور کہنے لگا اے کتے، تو کون ہے اور مجھے کہاں سے جانتا ہے؟
اور اس نے ملاحوں سے کہا مجھے ایک مضبوط سا ڈنڈا تو دینا میں اس منحوس
کا سر پھوڑ دوں۔ اب وہ ڈنڈا لے کر سیف الملوک کی طرف جھپٹا مگر جب
اس کی نظر کشتی میں پڑی تو اسے ایک عجیب خوب صورت سی شکل دکھائی
دی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوگیا اور غور سے دیکھنے پر اسے معلوم ہوا کہ
دولت خاتون ہے جو چاند کے ٹکڑے کی طرح وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ ناخدا
نے پوچھا تیرے ساتھ کون ہے؟ اس نے جواب دیا ایک لڑکی جس کا
نام دولت خاتون ہے۔ ناخدا نے اس کا نام سنا اور معلوم ہوگیا کہ یہ اس
کی آقا اور اس کے بادشاہ کی بیٹی ہے تو اسے غش آگیا۔ ہوش آیا تو
کشتی کو چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگا اور بادشاہ کے محل پر پہنچ کر اندر

جانے کی اجازت چاہی۔ حاجب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ناخدا معین الدین تجھے کوئی خوش خبری دینے آیا ہے۔ بادشاہ نے اُسے اندر بلا لیا۔

بادشاہ کے پاس آکر ناخدا نے زمین چومی اور کہا اے بادشاہ! میں تیرے پاس خوش خبری لے کر آیا ہوں، تیرے بھائی کی بیٹی دولت خاتون بہ خیریت اس شہر میں پہنچ گئی ہے، وہ ایک کشتی پر ہے اور اُس کے ساتھ چودھویں رات کے چاند کی طرح ایک جوان ہے۔ بھتیجی کی خبر سنتے ہی بادشاہ خوش ہو گیا۔ ناخدا کو ایک نفیس خلعت عطا کیا اور فوراً حکم دیا کہ اس کی بھتیجی کی سلامتی کی خوشی میں شہر آراستہ کیا جائے۔ پھر اُسے اور سیف الملوک کو اپنے پاس بلوایا۔ انھیں سلام کیا اور سلامتی پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بھائی کو خبر بھیجی کہ تیری بیٹی مل گئی ہے اور اس وقت میرے پاس ہے۔ جوں ہی یہ خبر دولت خاتون کے باپ تاج الملوک کو ملی تو اس نے تیاری کر کے سفر کر دیا اور اپنے بھائی عالی الملوک کے پاس پہنچ کر دولت خاتون سے ملا۔ سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ ایک ہفتہ اپنے بھائی کے پاس ٹھیرنے کے بعد تاج الملوک اپنی بیٹی اور سیف الملوک کو لے کر چل دیا۔ جب دولت خاتون اپنے باپ کے ملک سرندیپ میں پہنچی اور اپنی ماں سے ملی تو سب اُس کی سلامتی پر خوش ہوئے اور جشن منائے گئے۔ وہ دن ایسا دن تھا جس کی طرح کبھی کوئی نہ ہوا تھا۔ بادشاہ نے سیف الملوک کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس سے کہا اے سیف الملوک، تو نے میرے اور میری بیٹی کے ساتھ اتنی بڑی بھلائی کی ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ اگر اس کا بدلہ کوئی دے گا تو خدا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بجائے تو تخت پر بیٹھ اور ہند پر حکومت کر۔ میں اپنا ملک، تخت، خزانے

اور نوکر چاکر سب تجھے دیتا ہوں اور بہ طور ہدیے کے دیتا ہوں ۔ یہ سُن کر سیف الملوک اُٹھا، اُس کے آگے زمین چوم کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا جہاں پناہ! مَیں تیرے سارے ہدیے قبول کرتا ہوں اور انھیں پھر تجھے ہدیۃً واپس دیتا ہوں ۔ جہاں پناہ! مجھے نہ ملک کی ضرورت ہے نہ سلطنت کی ہیں تو محض یہ چاہتا ہوں کہ خدا میری مُراد پوری کر دے ۔ بادشاہ بولا اے سیف الملوک! میری ساری دولت تیرے آگے ہے، اس میں سے جو تیرا جی چاہے لے اور مجھ سے بالکل اجازت نہ مانگ، خدا میری طرف سے تجھے نیک بدلہ دے! سیف الملوک نے جواب دیا خدا یا دشاہ کی عزت بڑھائے ۔ جب تک مَیں اپنا مقصد حاصل نہ کرلوں نہ مجھے ملک میں مزا آئے گا نہ مال میں ۔ ہاں مَیں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مَیں اس شہر اور اُس کے گلی کوچوں کی سیر کروں ۔ تاج الملوک نے حکم دیا کہ اُس کے لیے اچھے سے اچھا گھوڑا حاضر کیا جائے اور جب ایک عمدہ گھوڑا مع زین اور لگام کے حاضر کیا گیا تو وہ اس پر سوار ہو کر بازار گیا اور شہر کے گلی کوچوں میں سیر کرنے لگا ۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک جوان پر پڑی جو ایک قبا لیے کہہ رہا تھا کہ پندرہ دینار! سیف الملوک نے غور سے دیکھا تو وہ اُس کے بھائی ساعد کے مشابہ معلوم ہوا اور حقیقت میں تھا بھی وہی لیکن غربت کی درازی اور سفر کی تکلیفوں کی وجہ سے اس کا رنگ روپ بدل گیا تھا ۔ اس نے اُسے بالکل نہ پہچانا اور اپنے نوکروں سے کہا اس جوان کو یہاں لے آؤ تاکہ مَیں اس کا حال دریافت کروں ۔ وہ اُسے لے آئے تو سیف الملوک نے کہا اسے میرے محل میں لے جا کر جب تک مَیں سیر سے نہ لوٹوں اپنے ساتھ رکھو ۔ وہ لوگ غلطی سے یہ سمجھے کہ اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اسے لے جا کر قید خانے

میں بند کردو۔ ان کا گمان ہوا کہ شاید جوان اس کا بھاگا ہوا غلام ہے۔ لوگوں نے اُسے پکڑ کر قید خانے میں بند کر دیا اور چلے آئے۔ سیف الملوک سیر سے لوٹ کر محل آیا تو نہ اُسے اپنے بھائی ساعد کی یاد آئی نہ کسی اور نے اُسے یاد دلایا۔ غرض کہ ساعد قید خانے میں پڑا رہا۔ جب لوگ قیدیوں کو عمارت کے کام کے لیے لے جاتے تو اُن کے ساتھ ساعد کو بھی لے جاتے۔ وہ بہت بدحال ہوگیا اور ایک مہینے تک اس کی یہی حالت رہی۔ وہ اپنے حال پر غور کرتا اور اپنے دل میں کہتا کہ نہ معلوم میں کیوں قید ہوں۔ اُدھر سیف الملوک اپنی خوشی وغیرہ کی وجہ سے اُسے بالکل بھول گیا۔ ایک دن سیف الملوک بیٹھا اپنے بھائی ساعد کو یاد کر رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھ والے غلاموں سے پوچھا فلاں روز جو غلام تمھارے ساتھ تھا کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا تو نے کہا نہ تھا کہ اُسے قید خانے پہنچا آؤ۔ سیف الملوک بولا میں نے تم سے یہ کب کہا تھا؟ میں نے تو کہا تھا کہ اُسے میرے محل میں پہنچا آؤ۔ یہ کہہ کر اس نے حاجبوں کو ساعد کے پاس بھیجا۔ وہ جاکر اُسے بیڑیوں سمیت لے آئے، اور اُسے سیف الملوک کے آگے پیش کیا۔ سیف الملوک نے کہا اے جوان! تو کس ملک کا رہنے والا ہے؟ اس نے جواب دیا مصر کا۔ میرا نام ساعد ہے۔ میں وزیر فارس کا بیٹا ہوں۔ یہ سن کر سیف الملوک تخت سے کود پڑا اور دوڑ کر اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ مارے خوشی کے چیخ چیخ کر رونے لگا اور کہا اے میرے بھائی ساعد! خدا کا شکر ہے کہ میں تجھ سے ملنے تک زندہ رہا۔ میں بادشاہ عاصم کا بیٹا تیرا بھائی سیف الملوک ہوں۔

ساعد نے اپنے بھائی کی باتیں سنیں اور اُسے پہچان لیا تو پھر دونوں

گلے مل کر رونے لگے۔ حاضرین کو بڑا تعجب ہوا۔ اب سیف الملوک نے حکم دیا کہ ساعد کو حمام لے جایا جائے۔ لوگ اُسے حمام لے گئے۔ وہ حمام سے نکلا تو اُسے نفیس کپڑے پہنا کر سیف الملوک کے دربار میں لاتے۔ سیف الملوک نے اُسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا۔ تاج الملوک کو خبر لگی کہ سیف الملوک اور اُس کا بھائی ساعد ایک دوسرے سے آملے ہیں تو اُسے بے حد خوشی ہوئی۔ وہ بھی ان کے پاس آگیا اور تینوں نے بیٹھ کر اپنی اپنی کہانیاں شروع سے لے کر آخر تک سنا ڈالیں۔ ساعد نے اپنی کہانی یوں شروع کی کہ ای میرے بھائی، ای سیف الملوک! جب کشتیاں ڈوب گئیں اور غلام غرق ہو گئے تو میں اور چند غلام پورے مہینے بھر تک سمندر پر تیرتے رہے۔ پھر خدا کی قدرت سے ہواؤں نے ہمیں ایک جزیرے پر لا پھینکا۔ ہم بھوکے تو تھے ہی درختوں کے پھل کھاتے اور کھانے میں اتنے مشغول ہوتے کہ ہمیں اپنی بھی خبر نہ رہی۔ دیو جیسے لوگ آپڑے اور اُچھل اُچھل کر ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے اور ہم سے کہنے لگے کہ ہمیں لے کر چلو اب تم ہمارے گدھے ہو۔ جو شخص میرے اوپر سوار تھا اس سے میں نے پوچھا تو کیا بلا ہو اور میرے اوپر کیوں سوار ہوا؟ یہ سُن کر اس نے اپنی ٹانگ اس زور سے میرے گلے میں لپیٹی کہ میں مرنے کے قریب ہو گیا اور دوسری ٹانگ اس زور سے میری پیٹھ پر ماری مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ٹوٹ گئی، میں مُنھ کے بل زمین پر گرا۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے بے حال تھا۔ میں گر پڑا تو وہ سمجھا کہ میں بھوکا ہوں، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک امرود کے درخت کے پاس لے گیا جس میں امرود لدے ہوئے تھے اور کہا پیٹ بھر کر کھا۔ میں نے پیٹ بھر کر امرود کھائے اور

اور بے خیالی میں اُٹھ کر چلنے لگا لیکن ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ وہ شخص پلٹا اور میرے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ میں کبھی آہستہ آہستہ چلتا، کبھی تیز تیز، کبھی دوڑتا اور وہ میرے اوپر بیٹھا بیٹھا ہنستا اور کہتا کہ میں نے عمر بھر تجھ سا گدھا نہیں دیکھا۔

اتفاق سے ہم نے ایک روز کچھ انگور کے خوشے جمع کیے اور انھیں پاؤں سے کچل کر ایک گڑھے میں بھر دیا۔ وہ گڑھا ایک حوض کی طرح ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب ہم پھر وہاں گئے تو دیکھا کہ دھوپ کھا کر وہ شراب ہو گئی ہے۔ ہم اُسے پیتے اور نشے میں آکر خوب مزے لیتے۔ ہمارے چہرے سُرخ ہو جاتے اور ہم مست ہو کر گانے اور ناچنے لگتے۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ تمھارے چہرے کس وجہ سے سُرخ ہو جاتے ہیں اور تم ناچنے اور گانے لگتے ہو؟ ہم نے کہا اس کا سبب نہ پوچھو، آخر تم پوچھ کر کرو گے کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہو تو سہی، ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ کیا بات ہے۔ ہم نے کہا انگور کا عرق۔ یہ سُن کر وہ ہمیں ایک گھاٹی میں لے گئے جس کی لمبائی چوڑائی کا پتا نہ چلتا تھا۔ وہاں اس زیادتی سے انگوروں کے خوشے تھے کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے اور کہاں ختم ہوتے ہیں اور ایک ایک خوشے کا وزن دس دس سیر ہوگا۔ وہ بہت گنجان تھے۔ انھوں نے ہم سے کہا انھیں توڑ کر جمع کرو۔ ہم نے بہت سے خوشے توڑ کر جمع کیے۔ وہاں ایک بہت بڑا گڑھا بھی تھا۔ ایک بڑے حوض سے بھی بڑا۔ اس میں ہم نے انگوروں کو بھر کر خوب پاؤں سے کچلا اور وہی کیا جو پہلی بار کیا تھا۔ جب وہ شراب بن گئی تو ہم نے کہا اب یہ ٹھیک ہے لیکن اسے پیو گے کس چیز میں؟ انھوں نے جواب دیا ہمارے پاس تمھاری طرح کے گدھے تھے جن کا

گوشت ہم کھا چکے ہیں اور کھوپڑیاں باقی ہیں۔ اُن میں بھر کر ہمیں پلاؤ۔ ہم نے انھیں شراب پلائی یہاں تک کہ وہ نشے میں آ کر سو گئے ۔ ان کی تعداد دو سو کے قریب ہو گی ۔ وہ سو گئے تو ہم آپس میں کہنے لگے کہ یہی بس نہیں کہ وہ ہم پر سوار ہوتے ہیں بلکہ وہ ہمیں کھا بھی جائیں گے ۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم ! ہمیں چاہیے کہ انھیں خوب بدمست کر کے قتل کر ڈالیں اور ان سے چھٹکارا پائیں ۔ اب ہم نے انھیں جگایا اور کھوپڑیوں میں بھر بھر کر شراب پلانی شروع کی وہ بولے کہ یہ کڑوی ہے؛ ہم نے جواب دیا تم اسے کڑوی کیوں کہتے ہو۔ جو کوئی ایسا کہے اگر اس نے دس بار نہ پی تو اسی دن مر جائے گا۔ موت کے ڈر کے مارے وہ کہنے لگے اچھا ہمیں دس بار پلا دو۔ جب وہ پورے دس بار پی چکے تو انھیں اتنا نشہ ہوا کہ ہاتھ پانو ڈھیلے پڑ گئے ہم نے انھیں ہاتھ پکڑ پکڑ کر کھینچا اور ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے اِرد گرد اور اوپر انگوروں کی لکڑیوں کا ڈھیر لگا یا اور ان میں آگ لگا کر دُور سے دیکھنے لگے کہ ان کا کیا حشر ہونا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سات سو بہتّرویں رات

سات سو بہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! ساعد نے کہا کہ ہم دُور جا کر دیکھنے لگے کہ ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ جب وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے تو ہم لوٹ کر آئے ۔ خدا کا شکر کیا کہ اس نے ہمیں ان کے ہاتھ سے نجات دی ۔ اب ہم جزیرے سے سمندر کے

کنارے کی طرف چلے اور ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے۔ مَیں دو غلاموں کے ساتھ ایک بڑے جنگل میں پہنچا جہاں بہت سے درخت تھے اور پھل کھانے لگے ابھی کھا ہی رہے تھے کہ ہمیں ایک لمبا تڑنگا شخص دکھائی دیا جس کی ڈاڑھی لمبی اور کان بڑے بڑے اور آنکھیں مشعل کی طرح تھیں۔ اُس کے قریب بہت سی بھیڑیں تھیں جنھیں وہ چرا رہا تھا اور اُس کے ساتھ اُسی کی طرح کے اور لوگ بھی تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوش ہوگیا۔ ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ مرحبا اہلاً وسہلاً، میرے گھر چلو مَیں تمھارے لیے ان بھیڑوں میں سے ایک بھیڑ ذبح کروں اور اُسے بھون کر تمھیں کھلاؤں۔ ہم نے پوچھا تیرا گھر کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا اس پہاڑ کے پاس، تم اس طرف جاؤ، وہاں تمھیں ایک غار دکھائی دے گا، اس کے اندر چلے جانا۔ وہاں تمھاری طرح اور بہت سے مہمان ہیں، ان کے ساتھ جاکر بیٹھو، مَیں ابھی دعوت کا سامان تیار کرکے لاتا ہوں۔ ہم سمجھے کہ وہ سچ کہتا ہے اور اسی سمت روانہ ہوکر غار کے اندر داخل ہوگئے، دیکھا کہ وہاں سارے مہمان اندھے ہیں۔ جوں ہی ہم اندر پہنچے ایک کہنے لگا میں بیمار ہوں، دُوسرا بولا مَیں کمزور ہوں۔ ہم نے پوچھا کیسی باتیں کر رہے ہو، تمھاری کمزوری اور بیماری کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے ہم سے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا مہمان۔ وہ بولے تمھیں کس نے لاکر اس ملعون کے ہاتھ میں گرفتار کرایا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم! یہ بھوت ہے جو انسان کو کھا جاتا ہے۔ اسی نے ہمیں اندھا کیا ہے تاکہ ہمیں کھا جائے۔ ہم نے پوچھا تمھیں اس بھوت نے کس طرح اندھا کیا؟ انھوں نے جواب دیا وہ ابھی تمھیں بھی ہماری طرح اندھا کردے گا۔ ہم نے پوچھا کہ آخر کیوں؟ انھوں نے جواب،

دیا۔ وہ تمھارے پاس دُودھ کے پیالے لائے گا اور کہے گا کہ تم سفر کی وجہ سے تھکے ماندے ہو، لو یہ دُودھ پی لو۔ دُودھ پیتے ہی تم بھی ہماری طرح ہو جاؤ گے۔ مَیں نے اپنے دِل میں کہا بغیر کسی تدبیر کے ہمارا چھٹکارا نہیں ہو سکتا اور زمین میں ایک گڑھا کھود کر مَیں اس پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ملعون بھوت دُودھ کے پیالے لے کر آ پہنچا ایک پیالہ مجھے اور ایک ایک میرے ساتھیوں کو دے کر کہا تم جنگل سے پیاسے آتے ہو، جب تک مَیں گوشت بھوُن کر تمھارے لیے لاؤں یہ دُودھ پیو۔ مَیں نے پیالہ لے لیا اور اپنے مُنھ کے پاس لا کر اُسے گڑھے میں اُنڈیل دیا اور چِلّانے لگا۔ آہ! آہ! میری آنکھیں جاتی رہیں، میں اندھا ہو گیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے پیٹنے لگا۔ وہ ہنسا اور بولا ڈر نہیں لیکن میرے دونوں ساتھی دُودھ پی گئے اور اندھے ہو گئے۔ اب وہ ملعون فوراً اُٹھا، غار کا دروازہ بند کر کے میرے پاس آیا اور میری پسلیاں ٹٹولنے لگا جب اس نے دیکھا کہ مَیں دُبلا ہوں اور میرے جسم پر گوشت کا نام نہیں تو اس نے دُوسرے کو ٹٹولا اور اُسے موٹا تازہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اُس نے تین بھیڑیں ذبح کیں، ان کی کھال کھینچی اور لوہے کی سیخیں لا کر ان پر گوشت لگایا اور آگ پر بھوُن کر میرے دونوں ساتھیوں کے پاس لایا۔ انھوں نے بھی کھایا اور ان کے ساتھ اس نے بھی۔ پھر وہ جا کر ایک شراب بھری مشک لے آیا۔ پی کر اوندھا لیٹ گیا اور خرّاٹے لینے لگا۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ اب وہ سو تو گیا ہو لیکن اُسے قتل کیسے کروں؟ فوراً مجھے سیخوں کا خیال آیا۔ مَیں نے ان میں سے دو سیخیں لے کر آگ میں رکھیں اور جب وہ

انگارے کی طرح لال ہوگئیں تو مَیں نے اُٹھ کر اپنی کمر کسی۔ دونوں سیخیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس ملعون کے پاس جا کر اس کی آنکھوں میں بھونک دیں اور زور سے دبایا۔ اُسے بھی جان عزیز تھی، باوجود اندھے ہونے کے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور چاہتا تھا کہ مجھے پکڑ لے مگر مَیں نے غار کے اندر بھاگنا شروع کیا۔ اس نے میرا پیچھا کیا۔ مَیں نے اندھوں سے جو وہاں تھے پوچھا اس ملعون کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ ان میں سے ایک نے کہا اے ساعد! اُچک کر اس محراب کے اُوپر چڑھ جا، وہاں تجھے ایک چمکدار تلوار ملے گی۔ اُسے میرے پاس لے آ، پھر مَیں بتاؤں گا کہ اب تجھے کیا کرنا چاہیے۔ مَیں نے اُچک کر محراب سے تلوار اتار لی اور اس شخص کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ تلوار سے اُس کی کمر پر وار کر وہ فوراً مر جائے گا۔ وہ دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ مَیں اس کی طرف دوڑا، وہ اندھوں کے پاس گیا کہ انھیں قتل کر دے لیکن مَیں نے بڑھ کر اُس کی کمر پر تلوار ماری اور اُس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس نے چلّا کر کہا اے شخص، اگر تو مجھے قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو ایک ہاتھ اور مار۔ مَیں دُوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ جس نے مجھے تلوار کا پتا دیا تھا کہا خبردار دُوسرا وار ہرگز نہ کیجیو۔ پھر وہ نہیں مرے گا بلکہ زندہ ہو کر ہم سب کو مار ڈالے گا۔ اور شہرزاد کو صبح...

سات سو تہتّرویں رات

سات سو تہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! ساعد نے کہا جس شخص نے مجھے تلوار کا پتا دیا تھا کہا کہ دُوسرا وار ہرگز

نہ کیجیو وہ زندہ ہو جاتے گا اور ہم سب کو مار ڈالے گا۔ میں نے اس کا کہنا مان لیا، دوسرا وار نہ کیا اور وہ ملعون مر گیا۔ اب پھر وہی شخص بولا کہ غار کا دروازہ کھول کر ہمیں نکال دے ممکن ہو کہ خدا ہماری مدد کرے اور ہمیں یہاں سے چھٹکارا ملے۔ میں نے جواب دیا کہ اب ہمیں کوئی ڈر نہیں رہا آؤ تھوڑا آرام کریں۔ ان بھیڑوں کو ذبح کر کے کھائیں اور شراب پئیں۔ جنگل بہت بڑا ہے۔ چنانچہ دو مہینے تک ہم وہاں ٹھیرے۔ بھیڑوں اور پھلوں پر گزارا کرتے رہے۔

ایک دن ایسا اتفاق پیش آیا کہ ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے ہمیں دور سے ایک بڑی کشتی دکھائی دی۔ ہم نے کشتی والوں کی طرف اشارہ کیا، انھیں آواز دی۔ وہ ہمیں بھوت سمجھ کر ڈر گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس جزیرے میں ایک بھوت رہتا ہے جو آدمیوں کو کھا جاتا ہے اور بھاگنے لگے لیکن ہم نے اپنے عماموں کے پلّے ہوا میں اڑاتے اور زیادہ قریب جا کر آوازیں دیں۔ ان میں سے ایک شخص جو تیز نظر تھا کہنے لگا اے کشتی والو! یہ تو مجھے ہم ہی جیسے آدمی معلوم ہوتے ہیں بھوت نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھے اور ہمارے قریب آگئے پھر جب انھیں یقین آگیا کہ ہم آدمی ہیں تو انھوں نے ہمیں سلام کیا۔ ہم نے ان کے سلام کا جواب دیا اور انھیں خوش خبری سنائی کہ ہم نے اس بھوت کو مار ڈالا ہے۔ انھوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہم جزیرے سے کچھ پھل کھانے کے لیے لے کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ تین دن تک موافق ہوا کے ساتھ چلتے رہے۔ اس کے بعد ہوا تیز ہوئی، اندھیرا چھا گیا اور آندھی نے کشتی کو لے جا کر ایک پہاڑ

سے ٹکرا دیا، کشتی ٹوٹ گئی اور اس کے تختے تتر بتر ہو گئے۔ خدا کی قدرت
کہ ایک تختہ میرے ہاتھ آگیا اور میں اس پر بیٹھ کر دو دن تک تیرتا رہا۔ ہوا
موافق تھی، میں عرصے تک تختے کو پاؤں سے کھیتا رہا یہاں تک کہ خدا
نے مجھے صحیح وسلامت خشکی پر پہنچا دیا۔ اس شہر کی صورت دکھائی دی اندر داخل
ہوا تو پردیسی اور اکیلا تھا۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کروں مارے
بھوک کے بے تاب تھا اور سخت تھکا ماندہ۔ میں نے یہ قبا اتاری۔ چھپا کر
شہر کے بازار میں گیا اور اپنے دل میں کہا کہ اسے بیچ کر گزارا کروں گا۔ اس
وقت تک کہ اللہ کوئی نہ کوئی صورت نکال دے۔ اے میرے بھائی! میں
نے قبا ہاتھ میں لے لی۔ لوگ اسے دیکھتے اور بڑھ بڑھ کر بولی بولتے
اتنے میں تو آیا اور تو نے مجھے دیکھ کر حکم دیا کہ غلام مجھے محل میں لے جائیں
مگر انھوں نے مجھے لے جا کر قید خانے میں بند کر دیا۔ اب تو نے مجھے
یاد کیا اور اپنے پاس بلایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پھر مل گئے۔ وزیر ساعد کی
یہ داستان سن کر سیف الملوک اور دولت خاتون کا باپ تاج الملوک
اچنبھے میں پڑ گئے تاج الملوک نے سیف الملوک اور اس کے بھائی
ساعد کو ایک خوب صورت محل رہنے کے لیے دیا۔ جب دولت خاتون
سیف الملوک کے پاس آتی، اس کا شکریہ ادا کرتی، اس کے احسان کا
ذکر کرتی تو وزیر ساعد اس سے کہتا اے شاہ زادی! تجھ سے ہماری یہی درخواست
ہے کہ اس کی مراد پوری کرا دے۔ وہ جواب دیتی ہاں میں کوشش کروں گی
اور اگر خدا کو منظور ہے تو اس کی مراد بر آئے گی۔ یہ کہہ کر وہ سیف الملوک
کی طرف مخاطب ہوتی اور کہتی کہ دل کو خوش رکھ اور آنکھیں ٹھنڈی۔
یہ تو سیف الملوک اور اس کے وزیر ساعد کا قصہ ہوا۔ اب شہ زادی

بدیع الجمال کا حال سُنو۔ جب اُسے یہ خبر ملی کہ اُس کی بہن اپنے باپ کے پاس اپنے وطن میں لوٹ کر آ گئی ہے تو اس نے کہا میرے لیے ضروری ہے کہ میں پوشاکوں اور گہنوں سے خوب آراستہ ہو کر اُس کی ملاقات کو جاؤں اور اُسے سلام کروں۔ لہٰذا وہ روانہ ہو گئی۔ دولت خاتون کے پاس پہنچی تو وہ اس کے استقبال کے لیے آئی سلام کر کے اُسے گلے لگایا، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، شہزادی بدیع الجمال نے بھی اس کی سلامتی پر اُسے مبارک باد دی اور بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگیں۔ بدیع الجمال نے دولت خاتون سے پوچھا کہ پردیس میں تیرے اوپر کیا گزری؟ دولت خاتون بولی بہن، نہ پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری، ہلسے مخلوق کو کن کن مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے! بدیع الجمال نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا بہن، میں قصرِ مشید میں تھی، بادشاہ ازرق کے بیٹے نے مجھے وہاں لے جا کر رکھا تھا اور اس نے باقی کہانی آخر تک سنا دی۔ منجملہ اُس کے سیف الملوک کا قصہ بھی اور یہ کہ محل میں اس کے ساتھ کیا گزری۔ قصرِ مشید تک پہنچنے سے پہلے اُسے کن کن مصیبتوں اور خطروں کا سامنا ہوا، اس نے کس طرح بادشاہ ازرق کے بیٹے کو قتل کیا۔ دروازے نکال کر اُن کی ایک ناؤ بنائی اور چپو تیار کرکے یہاں تک پہنچا۔ بدیع الجمال کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ وہ کہنے لگی بہن، یہ بڑا عجیب و غریب قصہ ہے۔ دولت خاتون نے کہا میں چاہتی ہوں کہ تجھ سے اصل واقعہ بیان کر دوں لیکن شرم روکتی ہے۔ بدیع الجمال نے کہا شرم کی کیا بات ہے، تو تو میری بہن اور دوست ہے۔ ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہیں اور میں جانتی ہوں کہ تو میرے لیے بھلائی ہی بھلائی چاہتی ہے، پھر شرم کیسی؟ جو تو کہنا چاہتی ہے

کہہ ڈال شرما نہیں اور مجھ سے کوئی بات نہ چھپا۔ دولت خاتون نے کہا کہ اُس نے تیری تصویر اُس قبا میں دیکھی تھی جو تیرے باپ نے حضرت سلیمان بن داؤدؑ کو بھیجی تھی۔ آپ نے بغیر کھولے اور بے دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے اُسے مصر کے بادشاہ عاصم بن صفوان کے پاس منجملہ اور ہدیوں اور تحفوں کے بھیج دیا۔ بادشاہ عاصم نے بھی اسی طرح لپٹی لپٹائی وہ قبا اپنے بیٹے سیف الملوک کو دے دی۔ جب سیف الملوک نے اُسے کھول کر پہننا چاہا تو اُس پر تیری تصویر دیکھ کر عاشق ہوگیا۔ تیرے تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور تیری وجہ سے یہ ساری مصیبتیں جھیلیں، اور شہرزاد کو صبح ہوئی...

سات سو چہتّرویں رات

سات سو چہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! دولت خاتون نے بدیع الجمال سے کہا اُس نے بڑی بڑی مصیبتیں تیری خاطر جھیلیں۔ بدیع الجمال کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور وہ دولت خاتون کے آگے شرما کر کہنے لگی یہ بات تو ممکن نہیں۔ انسانوں اور جنات میں بھی کبھی نبھی ہے دولت خاتون برابر سیف الملوک کی صورت، سیرت اور شہ سواری کی تعریف کرتی، اُس کی خوبیاں بیان کرتی اور کہتی کہ بہن خدا کے لیے اُس سے بات کر لے خواہ ایک ہی جملہ کیوں نہ ہو۔ بدیع الجمال انکار کیے جاتی کہ تیری یہ بات نہ میں سنوں گی نہ مانوں گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس نے کچھ نہیں سنا۔ سیف الملوک کی صورت، سیرت اور بہادری کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر دولت خاتون اُس کی خوشامدیں

کرکے اور اُس کے پاؤں چوم کر کہنے لگی او بدیع الجمال، تجھے قسم ہے اس دودھ
کی جو ہم دونوں نے پیا ہے اور قسم ہے اُس نقش کی جو حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی
پر ہے میری یہ بات مان لے۔ میں نے قصر رشید میں اس سے وعدہ کیا ہے کہ
میں تیری صورت دکھاؤں گی۔ تجھے خدا کی قسم میری خاطر سے اُسے اپنی
صورت دکھا دے اور خود اُس کی بھی صورت دیکھ لے۔ وہ یہ کہتی روتی خوشامدیں
کرتی اور اُس کے ہاتھ پاؤں چومتی جاتی یہاں تک کہ وہ مان گئی اور کہنے لگی
اچھا تیری خاطر میں اُسے ایک بار اپنی صورت دکھا دوں گی۔

دولت خاتون خوش ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں چوم کر اس بڑے محل
میں پہنچی جو باغ میں تھا اور کنیزوں کو حکم دیا کہ اس میں فرش بچھا کر سونے
کا تخت لگائیں اور شراب کے برتن چُنیں۔ پھر وہ سیف الملوک اور اُس کے
وزیر ساعد کے پاس گئی۔ دیکھا وہ دونوں بیٹھے ہیں۔ اس نے سیف الملوک کو
خوش خبری سُنائی کہ تیرا مقصد حاصل ہو گیا اور تیری مراد بر آئی۔ اب تم
دونوں محل میں جا کر چھپ جاؤ اس طرح کہ تمھیں کوئی دیکھ نہ سکے اور
وہاں بیٹھے اور بدیع الجمال کے آنے کا انتظار کرو۔ سیف الملوک اور ساعد
اس جگہ چلے گئے جو دولت خاتون نے بتایا تھا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے
دیکھا کہ سونے کا تخت بچھا ہوا ہے۔ اس پر تکیے لگے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے
کھانے اور شرابیں چنی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ سیف الملوک کو
اپنی معشوقہ کی یاد آ گئی۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ محبت نے زور پکڑا۔ وہ
اُٹھ کر چلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے محل کے دروازے سے باہر آ گیا۔ ساعد بھی
اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ سیف الملوک نے کہا بھائی، تو اپنی جگہ بیٹھا رہ
میرے پیچھے نہ آ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ساعد واپس جا کر بیٹھ گیا اور سیف الملوک

وہاں سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ وہ محبت کی شراب کے نشے میں چور تھا۔ آنسو جاری، اور پریشان اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اُس کے آنے میں دیر ہوئی تو ساعد اُسے باغ میں ڈھونڈنے نکلا دیکھا کہ وہ اکیلا دیوانوں کی طرح پھر رہا ہے۔ ساعد نے اسے باتوں میں لگا یا۔ غم غلط کیا اور وہ دونوں باغ کی سیر کرنے اور پھل کھانے لگے۔

اِدھر تو ساعد اور سیف الملوک باغ میں سیرگشت رہے تھے اُدھر جب نوکر محل کو آراستہ کر چکے، دولت خاتون کے حکم کی تعمیل ہو چکی اور بدیع الجمال کے بیٹھنے کے لیے سونے کا تخت بچھا دیا گیا تو دونوں شہزادیاں محل میں داخل ہوئیں۔ بدیع الجمال تخت پر بیٹھ گئی۔ تخت ایک محراب کے پاس تھا جہاں سے باغ دکھائی دیتا تھا۔ غلام طرح طرح کے نفیس کھانے لائے۔ دونوں نے کھائے اس طرح کہ دولت خاتون خود بھی کھاتی اور بدیع الجمال کو نوالے بنا بنا کر دیتی۔ کھانوں سے پیٹ بھر گیا تو دولت خاتون نے مٹھائیاں منگوائیں۔ مٹھائیاں کھائیں اور ہاتھ دھوئے۔ اس کے بعد شراب اور شراب نوشی کا سامان لایا گیا۔ صراحیاں اور جام چُنے گئے۔ دولت خاتون ایک جام بھر کر بدیع الجمال کو پلاتی اور دوسرا خود پیتی۔ اب بدیع الجمال محراب میں سے باغ کو دیکھنے لگی۔ کیسے کیسے پھل اور کس کس رنگ کے پھول ہیں۔ یکایک اُس کی نظر سیف الملوک پر جا پڑی جو باغ میں ٹہل رہا اور جس کے ساتھ ساتھ وزیر ساعد تھا۔ دیکھا کہ سیف الملوک اشعار پڑھ رہا ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ ایک ہی نگاہ اس پر پڑی تھی کہ ہزاروں تمنائیں اُمنڈ آئیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

سات سو چھہترویں رات

سات سو چھہترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب
بدیع الجمال کے دل میں ہزاروں تمنائیں آمنڈ آئیں کیوں کہ شراب اپنا کام کر چکی
تھی تو اس نے دولت خاتون کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا بہن، باغ میں یہ
کون جوان ہے جو پریشان اور محبت کا مارا معلوم ہوتا ہے؟ دولت خاتون نے
کہا اگر اجازت دے تو میں یہاں بلوا کر اسے دیکھوں۔ اس نے جواب دیا اگر تو
بلا سکتی ہے تو بلا۔ دولت خاتون نے پکار کر کہا اے شاہزادے، ہمارے پاس آ
اور اپنا حسن و جمال ہمیں دکھا۔ سیف الملوک نے دولت خاتون کی آواز پہچان
لی اور محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جوں ہی اس کی نظر بدیع الجمال پر پڑی غش
کھا کر گر پڑا، دولت خاتون نے اس پر گلاب چھڑکا جب اسے ہوش آیا تو
اس نے بدیع الجمال کے آگے زمین چومی اور اس کا حسن و جمال دیکھ کر بدیع الجمال
کے ہوش اڑ گئے۔ دولت خاتون نے کہا اے شاہزادی! یہی سیف الملوک ہے جس
نے خدا کے حکم سے مجھے چھڑایا ہے اور جس پر تیری وجہ سے بڑی بڑی مصیبتیں
آئی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تو ایک نظر سے اسے دیکھ لے۔ بدیع الجمال
نے ہنس کر کہا خاکی سب بے وفا ہوتے ہیں۔ یہ جوان کیا وفا کرے گا! انسانوں
میں محبت کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ سیف الملوک بولا اے شاہزادی! میں بے وفائی
ہرگز نہیں کر سکتا۔ سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ یہ کہہ کر وہ زار قطار رونے لگا۔
بدیع الجمال نے کہا اے شاہزادے! میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں تیری طرف
بالکل متوجہ ہو گئی اور پھر دیکھا کہ تجھ میں الفت ہے نہ محبت تو کیا ہو گا؟ انسانوں
میں بھلائی کم ہوتی ہے اور بے وفائی بہت۔ تجھے معلوم نہیں کہ حضرت سلیمان بن داؤد

نے بلقیس پر عاشق ہو کر اس سے شادی کی مگر جب ان کی نظر دوسری پر پڑی جو اُس سے زیادہ حسین تھی تو بلقیس کو چھوڑ کر اُس کے ہو گئے۔ سیف الملوک بولا اے میری آنکھ اور میری روح، خدا نے ہر انسان کو یکساں نہیں پیدا کیا ہے، اگر خدا نے چاہا تو میں عہد کا پکا رہوں گا اور تیرے قدموں کے نیچے جان دے دوں گا۔ تجھے عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ میں بات کا کتنا پکا ہوں اور خدا میری بات کو پورا کرنے کا ذمے دار ہے۔ بدیع الجمال نے کہا بیٹھ اور میرے آگے اپنے دین کی قسم کھا اور ہم دونوں عہد و پیمان کریں کہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کے ساتھ بے وفائی نہ کرے گا اور جو بھی بے وفائی کرے خدا اُسے سزا دے۔ یہ سن کر سیف الملوک بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قسم کھائی کہ اپنے ساتھی کے بعد دونوں میں سے کوئی دوسرا ساتھی نہ چنے گا، نہ انسانوں میں سے اور نہ جنوں میں سے۔ اس کے بعد دونوں دیر تک ایک دوسرے کے گلے لپٹے اور خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔ جب دونوں قسمیں کھا چکے اور دونوں کے دل رونے دھونے سے ہلکے ہو گئے تو سیف الملوک اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بدیع الجمال بھی ٹہلنے لگی۔ اس کے ساتھ ایک کنیز تھی جس کے پاس کھانا اور شراب کی ایک صراحی تھی۔ ٹہلنے کے بعد بدیع الجمال آ کر بیٹھی تو کنیز نے اس کے آگے کھانا اور شراب رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد سیف الملوک پہنچا۔ سلام کر کے اُسے گلے لگایا اور دونوں کھانے پینے لگے اور شہرزاد کو صبح ہوئی ......

سات سو چھہترویں رات

سات سو چھہترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!

دونوں بیٹھ کر کھانے پینے لگے۔ بدیع الجمال نے کہا اے شاہزادے، جب تو باغ ارم پہنچے گا تو تجھے وہاں ایک بہت بڑا خیمہ لگا ہوا دکھائی دے گا جو لال اطلس کا ہو گا اور جس کا استر ہرے ریشم کا۔ دل مضبوط کر کے اس کے اندر جائیو۔ وہاں تجھے ایک بوڑھی عورت لال سونے کے تخت پر بیٹھی ہوئی دکھائی دے گی۔ تخت میں موتی اور ہیرے جڑے ہوں گے۔ اس کے پاس جا کر ادب اور شان سے سلام کیجیو اور تخت کی طرف نظر دوڑائیو۔ اس کے نیچے تجھے جوتیاں دکھائی دیں گی۔ سونے کے تاروں سے بُنی ہوئی اور جواہرات سے مُرصّع۔ ان جوتیوں کو چومیو، سر پر رکھیو۔ پھر داہنی بغل میں دبا کر چُپ چاپ سر جُھکا بڑھیا کے سامنے کھڑا ہو جائیو۔ اگر وہ تجھ سے پوچھے کہ تو کہاں سے آیا ہے، یہاں تک تیری رسائی کیوں کر ہوئی، اس جگہ کا پتا تجھے کس نے دیا، میری جوتیاں تو نے کیوں اٹھائیں تو کچھ نہ بولیو اس وقت تک کہ یہ میری کنیز آ کر اس سے باتیں کرے۔ اسے تجھ پر مہربان اور راضی کرے، کیا عجب کہ خدا اس کا دل تیری طرف پھیر دے اور وہ تیری مراد پوری کر دے۔

یہ کہہ کر اس نے ایک کنیز کو آواز دی جس کا نام مرجانہ تھا اور کہنے لگی تجھے اس محبت کی قسم جو مجھے تیرے ساتھ ہے۔ یہ کام آج ہی کر دے دیر نہ لگا۔ اگر تو نے اُسے آج ہی پورا کر دیا تو میں تجھے خدا کی خاطر آزاد کر دوں گی۔ تجھے انعام دوں گی۔ تجھ سے بڑھ کر کوئی دوسرا مجھے عزیز نہ ہو گا اور تو میری راز دار ہو گی۔ کنیز نے کہا اے میری آقا! میری آنکھوں کی روشنی۔ کہہ تو سہی کہ تیرا کیا کام ہے۔ میں اُسے بسر و چشم پورا کروں گی۔

بدیع الجمال نے کنیز سے کہا اس انسان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر میری دادی کے پاس باغ ارم میں لے جا اور حفاظت کے ساتھ اس کے

خیمے میں پہنچا دے۔ جب تم دونوں خیمے میں داخل ہوں اور تو دیکھے کہ
اس نے میری دادی کی جوتیاں اٹھالی ہیں، اُس کی خدمت میں کھڑا ہو اور
وہ پوچھ رہی ہو کہ تو کہاں کا رہنے والا ہو، کدھر سے یہاں آپہنچا، تجھے کون
لے کر آیا ہو، تو نے کس لیے یہ جوتیاں اٹھالی ہیں اور بتا کہ تیری کیا خواہش ہو
میں اُسے پورا کروں تو تو فوراً اندر جاکر اُسے سلام کہیو اور کہیو اے میری آقا!
اُسے میں یہاں لائی ہوں۔ یہ مصر کے بادشاہ کا بیٹا اور وہی شخص ہو
جس نے قصر مشید میں جاکر بادشاہ ازرق کے بیٹے کو قتل کیا اور دولت خاتون
کو چھڑاکر صحیح وسالم اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا۔ انھوں نے اس کو
میرے ساتھ بھیجا ہو اور میں اُسے اس لیے لے کر آئی ہوں کہ وہ تجھے دولت خاتون
کے صحیح وسالم پہنچنے کی خوش خبری سنائے اور تو اُس کی آؤ بھگت کرے۔
اس کے بعد تو اس سے کہیو کہ کیا یہ جوان حسین نہیں ہو؟ وہ جواب دے گی
ہاں ہو۔ اس وقت تو اُس سے کہیو یہ بڑی عزت آب رو والا، بہادر، شجاع،
مصر کا مالک اور بادشاہ ہو۔ اس میں ساری اچھی خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ پھر
اگر وہ تجھ سے پوچھے کہ وہ کس ضرورت سے آیا ہو تو کہیو میری آقا نے سلام
کے بعد تجھے یہ کہلا بھیجا ہو کہ میں کب تک بے نکاح کے کنواری بیٹھی رہوں گی؟
مدت گزرتی چلی جاتی ہو، آخر تم میری شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں اور
اپنے اور میری ماں کے جیتے جی دوسری لڑکیوں کی طرح کیوں مجھے بیاہ نہیں
دیتیں؟ اگر وہ کہے کہ کس طرح اس کا نکاح کرنا چاہیے؟ اگر کسی سے
اس کی آنکھ لڑگئی ہو یا اس کا دل کسی سے مل گیا ہو تو وہ ہمیں بتا دے۔
ہم جہاں تک ہو سکے گا اس کی خواہش کے مطابق اس کا ارمان پورا کردیں گے۔
اس کے جواب میں تو کہیو اے میری آقا! تیری بیٹی نے کہلا بھیجا ہو کہ تم

لوگ میرا نکاح حضرت سلیمان سے کرانا چاہتے تھے اور قبا پر میری تصویر بناکر تم نے ان کے پاس بھیجی تھی لیکن میں اس کی قسمت میں نہ تھی۔ اس نے وہ قبا مصر کے بادشاہ کے پاس بھیج دی اس نے اسے اپنے بیٹے کے حوالے کیا۔ وہ قبا پر میری تصویر دیکھتے ہی مجھ پر عاشق ہوگیا۔ ماں باپ کو چھوڑکر دنیا تک ترک کر دی۔ حیران و پریشان گھر سے نکل کھڑا ہوا اور میری خاطر بڑی بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلیں۔

کنیز نے سیف الملوک کو اپنی پیٹھ پر بٹھاکر کہا اپنی آنکھیں میچ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ اُسے لے کر اُڑ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا آنکھیں کھول۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے ایک باغ نظر آیا۔ یہی باغ ارم تھا۔ کنیز مرجانہ بولی اے سیف الملوک! اس خیمے کے اندر جا۔ سیف الملوک خدا کا نام لے کر اندر گیا۔ اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑھیا تخت پر بیٹھی ہوئی ہے اور کنیزیں اُس کی خدمت میں کھڑی ہیں۔ وہ ادب سے اس کے قریب پہنچا۔ جوتیاں اٹھاکر چومیں اور جو کچھ بدیع الجمال نے کہا تھا کیا۔ بڑھیا بولی تو کون ہے کہاں سے آیا۔ کس ملک کا رہنے والا ہے، یہاں تجھے کون لایا، تو نے یہ جوتیاں اٹھاکر کیوں چومیں اور کب تو نے مجھ سے کوئی حاجت کہی ہو اور میں نے اُسے پورا نہیں کیا؟ یہ سنتے ہی کنیز مرجانہ نے اندر آکر بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا اور اس سے وہی گفتگو کی جو بدیع الجمال نے بتائی تھی۔ یہ سنتے ہی بڑھیا چلائی اور ناراض ہوکر کنیز سے کہا انسان اور جن میں کیسے ملاپ ہوسکتا ہے! اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

سات سو سترویں رات

سات سو سترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! بڑھیا غصے میں آکر بولی انسان اور جن میں کیسے ملاپ ہو سکتا ہے! سیف الملوک نے کہا اگر خدا نے چاہا تو مجھ سے کوئی بے وفائی ظاہر نہیں ہوگی تیرا غلام بن کر زندگی بسر کروں گا۔ تیری محبت پر جان دے دوں گا۔ جو عہد تیرے ساتھ باندھوں گا اُسے پورا کروں گا اور سوا تیرے کسی اور کو دھیان میں نہ لاؤں گا تو عنقریب دیکھے گی کہ میں سچا ہوں جھوٹا نہیں اور تیرے ساتھ کس مروت سے پیش آتا ہوں۔ بڑھیا تھوڑی دیر سر جھکائے سوچ میں بیٹھی رہی، پھر سر اُٹھا کر کہنے لگی اے خوش رو جوان، کیا تو عہد و پیمان پر پکا رہے گا؟ اس نے جواب دیا ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس نے آسمان کو بلند بنایا اور زمین کو پانی پر بچھایا کہ میں وعدہ پورا کروں گا۔ یہ سن کر بڑھیا بولی اگر خدا کو منظور ہے تو میں تیری مراد پوری کروں گی۔ اچھا اب تو باغ میں جا کر سیر کر اور پھل کھا جن کی نظیر دنیا میں نہیں۔ میں اپنے بیٹے شہیال کو بلاتی ہوں، وہ جائے گا تو میں اس بارے میں اُس سے بات چیت کروں گی اور خدا نے چاہا تو اس میں بھلائی ہوگی کیوں کہ وہ میری مخالفت نہیں کرے گا۔ وہ میرا حکم مان لے گا اور میں اُس کی بیٹی بدیع الجمال کا بیاہ تیرے ساتھ کرا دوں گی۔ اے سیف الملوک خوش ہو کہ وہ تیری بیوی ہو جائے گی۔ سیف الملوک نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں چوم کر وہاں سے باغ کی طرف چل دیا۔ بڑھیا نے کنیز کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میرے بیٹے شہیال کو ڈھونڈ کہ کہاں ہے اور اُسے میرے پاس لے آ۔

کنیز چلی۔ بادشاہ شہپال کو ڈھونڈ کر اُس سے ملی اور اُسے لے آئی۔

یہ تو بڑھیا کا قصہ ہوا۔ اب سیف الملوک کا ماجرا سُنو۔ وہ باغ میں سیر کر رہا تھا کہ پانچ جنوں کی نظر اُس پر پڑی جو بادشاہ ازرق کی رعایا تھے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کہاں کا رہنے والا ہے اور اُسے یہاں کون لایا؟ ہو نہ ہو یہ وہی ہے جس نے بادشاہ ازرق کے بیٹے کو قتل کیا۔ کسی چالاکی سے اُس سے پوچھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے اور باغ میں ایک طرف قریب بیٹھ کر کہنے لگے اے خوش رو جوان، تو نے بادشاہ ازرق کے بیٹے کے مارنے اور دولت خاتون کو اس کے پنجے سے چھڑانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ وہ بڑا دھوکے باز تھا۔ اُسے فریب دے کر اُڑا لے گیا تھا۔ اگر خدا کی طرف سے تو اس پر مسلط نہ کیا گیا ہوتا تو لڑکی ہرگز نہ چھوٹتی۔ بتا تو سہی تو نے اُسے کیوں کر قتل کیا؟ سیف الملوک نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں نے اُسے اِس انگوٹھی کے زور سے قتل کیا ہے جو میری انگلی میں ہے۔ اُنھیں یقین ہو گیا کہ اِسی نے اُسے قتل کیا ہے اور دو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ دو نے دونوں پاؤں اور پانچویں نے اس کا مُنھ دبا لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ چلائے اور بادشاہ شہپال کے آدمی آواز سن کر اُسے چھڑا لے جائیں۔ اس کے بعد وہ اُسے اُڑا لے گئے۔ اُڑتے اُڑتے اپنے بادشاہ کے پاس پہنچے اور اُسے اس کے سامنے لے جا کھڑا کیا اور کہنے لگے جہاں پناہ! ہم تیرے بیٹے کے قاتل کو تیرے پاس لے آئے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا یہ ہے۔ بادشاہ ازرق بولا کیا تو نے ہی میرے بیٹے کو ناحق قتل کیا ہے جو میرے جگر کا ٹکڑا اور میری آنکھ کا تارا تھا؟ اس نے تیرا کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ سیف الملوک نے کہا ہاں میں نے ہی اُسے قتل

کیا ہو لیکن اُس کے ظلم وستم کی وجہ سے وہ بادشاہوں کی اولاد کو بیر معطلہ اور قصر مشید لے جایا کرتا تھا۔ ان بچوں کے اور ان کے ماں باپ میں جدائی ڈالتا، ان کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا۔ میں نے اس انگوٹھی کے زور سے اُسے قتل کیا جو میری انگلی میں ہو اور خدا اُس کی روح کو فوراً دوزخ میں لے گیا جو رہنے کی بہت بُری جگہ ہو۔

بادشاہ ارزق پر ثابت ہو گیا کہ بے شک اُسی نے اُس کے بیٹے کو مارا ہو۔ اس نے اپنے وزیر کو بلا کر کہا اس میں شک نہیں کہ یہی میرے بیٹے کا قاتل ہو۔ تیری کیا رائے ہو۔ اس کے ساتھ کیا کروں، اسے بری طرح سے قتل کروں، سخت عذاب دوں یا کیا؟ بڑا وزیر بولا اس کا عضو عضو کاٹ کر پھینک دے۔ دوسرے نے کہا روزانہ اس پر مار پڑنی چاہیے۔ تیسرے نے کہا اس کے دو ٹکڑے کر ڈال۔ چوتھا بولا اس کی انگلیاں کاٹ کر اُسے آگ میں جلا دے۔ پانچویں نے کہا صلیب پر چڑھا دے۔ غرض کہ ہر ایک اپنی اپنی رائے کے مطابق اُسے مشورہ دینے لگا۔ بادشاہ ارزق کے دربار میں ایک بڑا سیاست داں تھا۔ دنیا کی باتوں سے باخبر، اُس نے کہا جہاں پناہ! میں تجھ سے ایک بات کہتا ہوں، میرے مشورے پر عمل کرنے میں تجھے شرمندگی نہیں ہوگی۔ یہ شخص بادشاہ کا مشیر اور حکومت کا بڑا آدمی تھا۔ اس کی ہر بات مانی جاتی، اس کی رائے پر عمل کیا جاتا۔ کسی بات میں بادشاہ اس کی مخالفت نہ کرتا۔ اسی نے اُٹھ کر بادشاہ کے آگے زمین چومی اور بولا جہاں پناہ! اگر میں اس بارے میں تجھے مشورہ دوں تو کیا تو اُسے مانے گا اور میری جان بخشی کرے گا؟ بادشاہ نے کہا اپنی رائے بیان کر، میں تیری جان بخشی کرتا ہوں۔ اس نے کہا جہاں پناہ! اگر تو نے اُسے

ابھی قتل کر دیا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ تو نے میری نصیحت نہ مانی اور میری بات نہ سمجھی۔ ابھی اس کا قتل کرنا بے کار ہو کیوں کہ وہ تیرے قبضے میں ہو۔ تیرے اختیار میں اور تیرا قیدی، جب تو چاہے گا وہ تجھے مل جائے گا اور جو تیرا جی چاہے تو اس کے ساتھ کر سکتا ہو۔ لیکن جہاں پناہ! صبر سے کام لے۔ اس نے باغ ارم میں جا کر بادشاہ شہپال کی بیٹی بدیع الجمال سے شادی کی ہو اور اس طرح یہ ان کا رشتے دار ہو گیا ہو۔ تیرے آدمی اُسے پکڑ کر تیرے پاس لے آئے ہیں۔ یہ بات تجھ پر بھی ظاہر ہو اور اُن پر بھی۔ اگر تو نے اُسے قتل کر دیا تو بادشاہ شہپال تجھ سے اس کا بدلہ لے گا اور تیرا دشمن بن جائے گا۔ اپنی بیٹی کی خاطر لشکر لے کر تیرے اوپر چڑھائی کرے گا۔ اس کے لشکر کے آگے تیری کچھ نہ چلے گی تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ بادشاہ نے اس کی یہ رائے مان لی اور سیف الملوک کو قید خانے بھیج دیا۔

یہ تو سیف الملوک کی سرگزشت ہوئی، اب بدیع الجمال کی دادی کا حال سُنو۔ اپنے بیٹے شہپال سے ملنے کے بعد اس نے کنیز کو بھیجا کہ سیف الملوک کو تلاش کر کے لائے۔ نہ ملا تو اس نے اپنی آقا کے پاس آکر کہا وہ مجھے باغ میں نہیں ملتا۔ یہ سُن کر بڑھیا نے باغ کے ملازموں کو بلوایا اور ان سے سیف الملوک کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا ہم نے اُسے ایک درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا تھا کہ اتنے میں بادشاہ ازرق کی جماعت کے پانچ شخص اتر کر اس کے پاس آئے۔ اس سے باتیں کرنے لگے پھر اُسے اُٹھا کر اور اس کا منھ بند کر کے اُڑ گئے۔ بدیع الجمال کی دادی کو سخت افسوس ہوا۔ وہ تیش میں آکر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بیٹے شہپال سے

کہنے لگی تو کیسا بادشاہ ہو کہ تیرے جیتے جی بادشاہ ازرق کی جماعت کے آدمی ہمارے باغ میں گھس کر ہمارے مہمان کو زندہ اُٹھا لے جاتے ہیں۔ ماں نے بیٹے کو خوب ابھارا اور کہا یہ کیسے ہو سکتا ہو کہ تیرے جیتے جی ہم پر کوئی زبردستی کر سکے! اس نے جواب دیا "اماں! اس انسان نے بادشاہ ازرق کے بیٹے کو قتل کیا ہو۔ اب خدا نے اُسے اس کے قبضے میں دے دیا بھلا یہ بھی کوئی بات ہو کہ ایک انسان کی خاطر میں جن سے دشمنی مول لوں! ماں بولی کہ اُس کے پاس جا کر ہمارے مہمان کو طلب کر۔ اگر وہ زندہ ہو اور ازرق نے اُسے تیرے حوالے کر دیا تو اُسے یہاں لے آ، اور اگر بادشاہ ازرق نے اُسے قتل کر دیا ہو تو اُسے اور اس کی اولاد، بیویوں اور متعلقین کو زندہ پکڑ کر میرے پاس لے آ۔ میں انھیں اپنے ہاتھ سے قتل کر کے ان کا ملک تباہ کر ڈالوں۔ اگر تو نے میرا حکم نہ مانا تو میں ہرگز تجھے اپنا دودھ نہ بخشوں گی اور اپنی تربیت تجھ پر حرام کر دوں گی۔ اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

سات سو اٹھترویں رات

سات سو اٹھترویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! بدیع الجمال کی دادی نے اپنے بیٹے شہیال سے کہا اگر تو نے میرا حکم نہ مانا تو میں اپنا دودھ ہرگز نہ بخشوں گی۔ یہ سُن کر بادشاہ شہیال اٹھا اور اپنے لشکر کو باہر نکال کر اپنی ماں اور اُس کے چہیتوں کی خاطر اور اس چیز کی وجہ سے جو ازل میں مقدر ہو چکی تھی بادشاہ ازرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے وہاں پہنچ گیا اور دونوں لشکروں میں لڑائی شروع ہو گئی۔

بادشاہ ازرق اور اس کا لشکر ہار گیا، اُس کی چھوٹی بڑی اولادیں حکومت کے حکام اور تمام بڑے لوگ گرفتار ہوکر بادشاہ شہپال کے سامنے پیش ہوئے۔ شہپال نے کہا اے بادشاہ ازرق، انسان سیف الملوک میرا مہمان ہے؟ بادشاہ ازرق بولا اے شہپال، تو بھی جن ہے اور میں بھی۔ کیا یہ ساری باتیں تو نے ایک انسان کی خاطر کی ہیں جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے؟ وہ اس شخص کا قاتل ہے جو میرا بیٹا، میرے جگر کا ٹکڑا اور میری روح کا آرام تھا۔ پھر تو نے یہ حرکت کیوں کی اور ایک ہزار جنوں کا خون کیوں بہایا؟ شہپال نے کہا باتیں نہ بنا۔ اگر وہ زندہ ہے تو اُسے حاضر کر، میں تجھے اور تیری اولاد کو چھوڑ دوں گا جنھیں میں نے گرفتار کیا ہے، اور اگر تو نے اُسے قتل کر دیا ہے تو میں تجھے اور تیری اولاد کو ذبح کر ڈالوں گا۔ بادشاہ ازرق نے کہا اے بادشاہ کیا تجھے یہ شخص میرے بیٹے سے زیادہ عزیز ہے؟ بادشاہ شہپال نے کہا تیرا بیٹا ظالم تھا، وہ انسانوں کے بچے اور بادشاہوں کی بیٹیوں کو اٹھا لاتا، انھیں قصر مشید اور بیر معطلہ میں لا کر رکھتا اور ان کے ساتھ بدکاری کرتا تھا۔ بادشاہ ازرق بولا وہ میرے پاس ہے۔ اچھا میرے اور اُس کے درمیان صلح کرا دے۔ شہپال نے دونوں میں صلح کرا دی، انھیں خلعت دیے۔ بادشاہ ازرق اور سیف الملوک کے درمیان معاہدہ لکھ دیا جس سے اس کے بیٹے کا خون معاف ہو گیا۔ اس کے بعد شہپال نے اُسے مسلمان کر لیا اور انھیں عمدہ عمدہ دنیائیں دیں۔ بادشاہ ازرق تین دن تک مہمان رہ کر رخصت ہو گیا اور شہپال سیف الملوک کو لے کر اپنی ماں کے پاس آیا۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور شہپال سیف الملوک کا حسن و جمال دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گیا۔

سیف الملوک نے اپنی ساری داستان شروع سے آخر تک اُسے کہہ سنائی اور نیز وہ واقعہ جو اُسے بدیع الجمال کے ساتھ پیش آیا تھا۔ بادشاہ شہیال نے کہا اماں چوں کہ تیری یہی مرضی ہے اس لیے اب تو اسے لے کر سرندیپ جا اور وہاں دھوم دھام سے اُس کی شادی رچا، وہ خوب صورت جوان ہے اور اُس نے بدیع الجمال کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے۔

بڑھیا اپنی کنیزوں کو لے کر سرندیپ پہنچی۔ جب یہ سب دولت خاتون کی ماں کے باغ میں پہنچ کر خیمے کے اندر گئیں تو بدیع الجمال کی نظر ان پر پڑی۔ بڑھیا نے ان سے وہ سارا ماجرا بیان کیا جو سیف الملوک اور بادشاہ ارزق میں گزرا اور یہ کہ وہ بادشاہ ارزق کے قید خانے میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد دولت خاتون کے باپ تاج الملوک نے حکومت کے بڑے بڑے لوگوں کو جمع کرکے بدیع الجمال کا نکاح سیف الملوک سے کر دیا۔ عمدہ عمدہ خلعت تقسیم کیے اور لوگوں کو دعوتیں دیں۔ اب سیف الملوک نے اٹھ کر تاج الملوک کے آگے زمین چومی اور کہا اے بادشاہ مجھے معاف کر، میں تجھ سے ایک بات کا خواہش مند ہوں مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں تو میری درخواست رد نہ کر دے۔ تاج الملوک بولا قسم ہے خدا کی اگر تو میری جان بھی مانگے تو میں دینے میں دریغ نہ کروں گا۔ تو نے میرے ساتھ بھلائی کی ہے۔ سیف الملوک نے کہا میں چاہتا ہوں کہ تو شاہ زادی دولت خاتون کا نکاح میرے بھائی ساعد سے کر دے تاکہ ہم سب تیرے غلام ہو جائیں۔ تاج الملوک بولا سر آنکھوں پر اور اس نے دوبارہ حکومت کے بڑے لوگوں کو اکٹھا کرکے دولت خاتون کا نکاح ساعد سے کر دیا اور قاضیوں نے نکاح نامہ لکھ دیا۔ نکاح نامے کے مرتب ہونے کے بعد

سونا چاندی نچھاور کیا گیا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ شہر آراستہ کیا جائے۔ پھر جشن ہونے لگے۔ سیف الملوک بدیع الجمال سے ہم بستر ہوا اور اسی رات ساعد دولت خاتون سے، سیف الملوک بدیع الجمال سے چالیس دن تک برابر ہم بستر ہوتا رہا۔ ایک دن شہزادی نے کہا اے شاہزادے اب کوئی اور حسرت تو تیرے دل میں باقی نہیں رہ گئی؟ سیف الملوک نے جواب دیا خدا نہ کرے! تو نے میرا ارمان نکال دیا کوئی حسرت میرے دل میں باقی نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ مصر جاکر اپنے ماں باپ سے ملوں اور دیکھوں کہ ان کا کیا حال ہے۔ بدیع الجمال نے اپنے چند نوکروں کو حکم دیا کہ اسے اور ساعد کو مصر پہنچا آئیں۔ وہ انھیں لے جاکر مصر میں اُن کے گھر والوں کے پاس پہنچا آئے۔ سیف الملوک اور ساعد اپنے اپنے والدین سے ملے، ایک ہفتہ اُن کے پاس ٹھیرے اور ان سے رخصت ہو کر پھر سرندیپ چلے آئے۔ اسی طرح جب کبھی اپنے گھر والوں سے ملنے کی تمنا ہوتی تو ان کے پاس چلے جاتے اور لوٹ آتے۔ سیف الملوک بدیع الجمال کے ساتھ اور ساعد دولت خاتون کے ساتھ بڑے عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ لذتوں کو گرانے، صحبتوں کو درہم برہم کرنے والی موت آپہنچی۔ پاک ہے وہ ذات جو ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی مرتی نہیں اور جس نے مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کی قسمت میں موت لکھی! وہ ذات بلا ابتدا کے اول ہے اور بلا انتہا کے آخر۔

بصرے کے سوداگر حسن کی کہانی

پرانے زمانے میں ایک سوداگر تھا۔ بصرے کا رہنے والا، بڑا مال دار
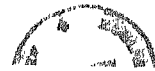
اس کے دو بیٹے تھے۔ اللہ کا کرنا کہ وہ تاجر مر گیا، خدا اس پر رحمت کرے! اور ساری دولت وارثوں کے لیے چھوڑ گیا۔ دونوں بیٹوں نے باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد مال و اسباب آپس میں برابر برابر تقسیم کر کے دکانیں کھول لیں۔ ایک پیتل کے برتن بیچنے لگا اور دوسرے نے سنار کا کام شروع کر دیا۔ ایک دن یہ سنار اپنے ٹھیے پر بیٹھا ہوا تھا ایک عجمی بازار کی سیر کرتا ہوا اس کی دکان پر پہنچا اور اس کی کاری گری دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ اس سنار کا نام حسن تھا، عجمی اپنا سر ہلانے لگا اور کہا کہ قسم ہو خدا کی تو بڑا اچھا سنار ہے۔ وہ حسن کی کاری گری کو دیکھ رہا تھا حسن اپنے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب لیے پڑھ رہا تھا۔ لوگ اس کے حسن و جمال اور اس کے تناسب پر محو تھے۔ جب عصر کا وقت ہوا اور دکان لوگوں سے خالی ہو گئی تو عجمی نے حسن کے پاس آ کر کہا بیٹا، تو بڑا خوش رو جوان ہے۔ یہ کون سی کتاب ہے؟ تو بے باپ کا ہے اور میرا کوئی بیٹا نہیں۔ مجھے ایک کاری گری آتی ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ہنر نہیں، اور شہرزاد کو صبح ہو گئی ....

سات سو اناسیویں رات

جب سات سو اناسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! عجمی نے کہا مجھے ایک کاری گری آتی ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ہنر نہیں۔ بہت سے لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انہیں سکھا دوں لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بھی سکھانا پسند نہ کیا۔ میرا

جی چاہتا ہو کہ تجھے سکھا دوں اور تجھ کو اپنا بیٹا بنا لوں تاکہ فقر و فاقے سے تجھے نجات ملے اور اس پیشے سے تیرا پیچھا چھوٹے جس میں تہائی اور ہتوڑا، بھٹی اور آگ کی تکلیف ہو۔ حسن نے پوچھا کہ اے میرے آقا! تو مجھے کب سکھائے گا؟ اس نے جواب دیا کہ میں کل تیرے پاس آکر تیرے سامنے پیتل سے خالص سونا بناؤں گا۔ حسن یہ سن کر بہت خوش ہوا اور عجمی سے رخصت ہو کر اپنی ماں کے پاس گیا۔ سلام کیا اور اس کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد تمام قصہ جیراتی سے عجمی کا ماجرا سنایا۔ ماں نے کہا بیٹا! تجھے کیا ہو گیا ہو؟ لوگوں کی باتیں نہ مانا کر خاص کر عجمیوں کی بات تو ہرگز نہیں سننی چاہیے کیوں کہ وہ دھوکے باز ہوتے ہیں اور کیمیاگری جانتے ہیں۔ لوگوں کو جال میں پھانس کر ان کا مال لے اڑتے ہیں اور اسے کھا جاتے ہیں۔ حسن نے کہا اماں: ہم غریب لوگ ہیں، ہمارے پاس ہو کیا کہ کوئی اس کے لالچ میں ہم کو جال میں پھانسے گا! اور یہ عجمی تو ایک بھلا مانس بوڑھا ہو۔ نیکی اس کے چہرے سے ٹپکتی ہو، خدا نے اسے میرے اوپر مہربان کر دیا ہو۔ یہ سن کر اس کی ماں مارے غصّے کے چپ ہو گئی مگر بیٹے کا دل اسی میں لگا رہا اور مارے خوشی کے وہ رات بھر سویا بھی نہیں۔

جب صبح ہوئی تو حسن اٹھا اور کنجیاں لے کر دکان کھولی ہی تھی کہ عجمی آ پہنچا۔ حسن اٹھ کھڑا ہوا اور چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ چومے لیکن اس نے اسے روک دیا اور اس بات کو پسند نہ کیا۔ حسن سے کہا کہ کٹھالی کو آگ پر رکھ اور دھونکنی لگا۔ حسن نے عجمی کے کہنے کی تعمیل کی اور کوئلے دہکائے۔ عجمی بولا بیٹا! تیرے پاس پیتل ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس ایک ٹوٹا ہوا پیالہ ہو۔ عجمی نے کہا اسے قینچی سے کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر۔ حسن نے اس کے کہنے کے مطابق اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹے اور

انھیں کٹھالی میں ڈال کر دھونکنی سے ہوا دینی شروع کی یہاں تک کہ وہ پگھل کر پانی ہو گئے۔ اب عجمی نے اپنا ہاتھ پگڑی کی طرف بڑھایا اور اُس میں سے ایک لپٹا ہوا کاغذ نکالا اور آدھے درہم کے برابر کوئی سفوف نکال کر کٹھالی میں ڈال دیا۔ یہ سفوف زرد سُرمے کی طرح کا تھا۔ اب اس نے حسن سے کہا کہ اور دھونک۔ حسن اور دھونکنے لگا یہاں تک کہ وہ ایک سونے کا ٹکڑا بن گیا۔ یہ دیکھ کر حسن کے ہوش و حواس مارے خوشی کے جاتے رہے۔ وہ اس ٹکڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور اُسے چھری سے کھرچ کر دیکھا تو وہ عمدہ قسم کا کُندن تھا۔ اس کی مسرّت کا کیا پوچھنا چاہتا تھا کہ جُھک کر عجمی کا ہاتھ چوم لے۔ عجمی نے اُسے روک دیا اور کہا کہ اس ٹکڑے کو بازار میں لے جا اور بیچ کر دام کھرے کر مگر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیو۔ حسن نے بازار جاکر وہ ٹکڑا دلاّل کو دیا۔ دلاّل نے اُسے لے کر کسوٹی پر لگایا اور دیکھا کہ وہ خالص سونا ہے۔ دس ہزار درہم سے اس کی بولی شروع ہوئی۔ سوداگر بڑھ بڑھ کر بولی بولنے لگے۔ یہاں تک کہ پندرہ ہزار درہم تک دام لگ گئے۔ گھر جاکر حسن نے ماں سے سارا ماجرا بیان کیا اور کہا کہ اماں! میں اس صنعت کو سیکھ گیا ہوں۔ ماں ہنسی اور کہنے لگی کہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اور شہرزاد کو صبح ہوئی ......

سات سو اٹھائیسویں رات

سات سو اٹھائیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! ماں لاحول پڑھ کر مارے غصے کے چُپ ہو گئی۔ حسن بھولے پن سے ایک ہاون دستہ لے کر عجمی کے پاس گیا جو دُکان میں بیٹھا ہوا تھا اور اُسے اُس کے آگے

رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ بیٹا تو اس ہاون دستے کا کیا کرنا چاہتا ہے؟ حسن
نے جواب دیا کہ اس کو بھی آگ پر پگھلا کر سونے کے ڈلے بنا لیں۔ عجمی ہنس کر
بولا بیٹا! کہیں تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ کیا تو ایک ہی دن میں دو سونے
کے ڈلے لے کر بازار جائے گا؟ تجھے معلوم نہیں کہ لوگ ہم سے بدظن ہو جائیں گے
اور ہمیں مار ڈالیں گے۔ بیٹا! جب تو مجھ سے یہ فن سیکھ جائے تو اُسے سال
میں ایک بار سے زیادہ مت بنائیو اور وہ تیرے لیے ایک سال سے دوسرے
سال تک کافی ہوگا۔ حسن کہنے لگا اے میرے آقا! تو ٹھیک کہتا ہے اور دُکان
میں بیٹھ کر اس نے کٹھالی آگ پر چڑھا دی اور بھٹی میں کوئلے ڈال دیے
عجمی نے کہا بیٹا! اب تیرا کیا مطالبہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ فن مجھے
سکھا دے۔ عجمی نے ہنس کر کہا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم
بیٹا، تو بڑا کم عقل ہے اور اس فن کے سیکھنے کے بالکل ناقابل۔ کبھی کوئی
اس فن کو بیچ سڑک پر یا بازاروں میں سیکھ سکتا ہے؟ اگر ہم نے اس
جگہ یہ کام شروع کر دیا تو لوگ کہیں گے ہم کیمیاگر ہیں اور جب اس کی خبر
حکام تک پہنچے گی تو وہ ہماری جان کے گاہک ہو جائیں گے۔ بیٹا! اگر تو
یہ کام سیکھنا چاہتا ہے تو میرے گھر چل۔ حسن نے اٹھ کر دکان بند کی اور
عجمی کے ساتھ ہو لیا مگر راستے میں اُسے اپنی ماں کی بات یاد آ گئی اور
اس کے دل میں کشمکش ہونے لگی۔ وہ دیر تک سر نیچا کیے کھڑا رہا۔
جب عجمی نے دیکھا کہ وہ رک گیا ہے تو ہنسا اور بولا کہ تیرا دل تو نہیں الٹ
گیا؟ اگر تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے نقصان پہنچاؤں گا تو پھر میرے دل میں
تیری طرف سے کیوں کر بھلائی آ سکتی ہے! اگر تو میرے گھر سے ڈرتا ہے
تو میں تیرے گھر چل کر وہاں تجھے سکھا سکتا ہوں۔ حسن نے کہا ہاں چچا،

لیکن صبر کر میں جڑی بوٹیوں کو ملا کر تیرے لیے اکسیر بنا دوں گا۔ اے میرے بیٹے اے حسن! سن جو اکسیر اس کاغذ میں ہے اس کا نصف درہم پانچ سیر پیتل کے لیے کافی ہے جو اسے پانچ سیر خالص سونا بنا دے گا۔ اے میرے بیٹے اے حسن! اس کاغذ میں ڈیڑھ چھٹانک مصری اکسیر ہے۔ جب یہ ختم ہو جائے گی تو میں تجھے اور بنا دوں گا۔ حسن نے کاغذ کی پڑیا کو لے کر دیکھا اُسے اس میں پہلے سے بھی عمدہ کوئی پیلی چیز نظر آئی، کہنے لگا اے میرے آقا، اس کا نام کیا ہے، یہ کہاں پائی جاتی ہے اور کس طرح بنائی جاتی ہے؟ عجمی حسن کا بڑھتا ہوا لالچ دیکھ کر ہنسا۔ اس نے کہا کہ آخر تو کتنی باتیں پوچھے گا؟ چپ چاپ اپنا کام کیے جا۔ حسن گھر میں سے جا کر ایک رکابی لے آیا اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر کٹھالی میں ڈال دیے۔ جب وہ پگھل گئے تو پڑیا کی تھوڑی سی دوا لے کر ڈال دی اور وہ خالص سونا ہو گیا۔ حسن باغ باغ ہو گیا۔ سونے کے ڈلے نے اس کی عقل کو چکر میں ڈال دیا۔ اب عجمی نے اپنی پگڑی میں سے تیزی کے ساتھ ایک تھیلی نکالی جس میں کوئی ایسی نشہ آور چیز تھی کہ اگر اُسے ہاتھی بھی سونگھ لیتا تو ایک دن سے لے کر دوسرے دن تک سوتا رہتا۔ اس نے اس میں سے تھوڑی سی لے کر چپکے سے مٹھائی میں ملا دی اور کہا اے حسن! اب تو ہی میرا بیٹا ہے اور میرے جان و مال سے زیادہ عزیز ہے۔ میری ایک بیٹی ہے، اُس سے میں تیرا نکاح کر دوں گا۔ حسن نے کہا میں تیرا غلام ہوں اور جو بھی بھلائی تو میرے ساتھ کرے گا وہ خدا کے پاس جمع رہے گی۔ عجمی نے کہا کہ بیٹا! ذرا صبر سے کام لے پھر تیرے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے وہ مٹھائی حسن کو دی۔ اس نے اس کا ہاتھ چوم کر اُسے اپنے منھ میں رکھ لیا، اُسے کیا

خبر تھی کہ غیب میں اُس کے لیے کیا پوشیدہ ہو۔ سطح آب کا نکلنا تھا کہ اُس کا سر اُس کے پانوؤں سے آگے آگے چلنے لگا اور وہ دُنیا سے غائب ہو گیا۔ جب عجمی نے دیکھا کہ بلا حسن کے اوپر نازل ہو چکی ہو تو بہت خوش ہوا اور کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ اے مردود اے عرب کے کتے! آخر تو میرے جال میں پھنس گیا۔ اے حسن، میں کئی سال سے تیری تلاش میں تھا اور اب تو قابو میں آگیا ہو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

سات سو اکیاسیویں رات

سات سو اکیاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! عجمی نے کہا کہ بالآخر تو میرے جال میں پھنس گیا اور اپنی کمر کس کر اس نے حسن کی مشکیں باندھیں، ہاتھ پانو ملا کر باندھ دیے اور ایک صندوق لیا، اسے خالی کر کے اس میں حسن کو بند کیا اور قفل ڈال دیا۔ پھر اُس نے دوسرا صندوق کھولا۔ اس کی ساری چیزیں نکال پھینکیں اور حسن کا سارا مال متاع سونے کے دونوں ڈلوں سمیت صندوق میں بھر بازار سے حمّال کو لایا اس پر دونوں صندوق لادے اور انھیں شہر کے باہر لے جاکر سمندر کے کنارے اُتارا وہاں ایک کشتی لنگر ڈالے کھڑی تھی۔ اس کشتی میں غلام تھے اور ناخدا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ملّاحوں کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس کے پاس آئے اور دونوں صندوقوں کو لے جاکر کشتی میں رکھ دیا۔ عجمی نے ناخدا اور سب ملّاحوں کو پکار کر کہا کہ تیار ہو جاؤ ہماری حاجت پوری ہو چکی ہو اور مراد بر آئی ہو۔ ناخدا نے ملّاحوں سے

کہا کہ لنگر اٹھاؤ اور بادبان کھول دو۔ ہوا موافق تھی کشتی چل نکلی۔

یہ تو عجمی اور حسن کا قصہ ہوا، اب حسن کی ماں کا حال سنو۔ اس نے عشا کے وقت تک انتظار کیا مگر جب نہ اُسے کوئی خبر ملی بلکہ آواز تک نہ سنائی دی تو وہ گھر کو کھلا دیکھ کر اس کے اندر آئی۔ اس نے دیکھا نہ وہاں کوئی شخص ہی نہ صندوق، نہ مال، اُسے یقین ہو گیا کہ اس کا بیٹا کھو گیا اور جو کچھ قسمت میں بدی تھی پوری ہو گئی۔ وہ اپنا مُنھ پیٹنے لگی۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور داویلا کرنا شروع کر دیا۔ کبھی روتی کبھی کہتی کہ ہائے میرے بیٹے اور میرے دل کے پھل! جب وہ صبح تک اسی طرح روتی رہی تو پڑوسیوں نے آکر اُس کے بیٹے کا حال پوچھا۔ اس نے وہ سارا ماجرا بیان کر دیا جو اُسے عجمی کے ساتھ پیش آیا تھا اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اب اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکے گی۔ وہ گھر میں دیوانوں کی طرح پھرتی اور اسی طرح روتی پیٹتی رہی، پڑوسیوں نے دعا کی کہ اُسے صبر آجائے اور اس کا بیٹا مل جائے اور اس سے رخصت ہو کر چلے گئے مگر وہ دن رات برابر روتی رہی اور گھر کے بیچ میں ایک قبر بنا کر اس پر حسن کا نام اور اُس کے کھوئے جانے کی تاریخ لکھ دی۔ وہ ہمیشہ اُسی قبر کے پاس پڑی رہتی اور جس دن سے اس کا بیٹا اس سے جدا ہوا تھا اُس کا یہی دستور تھا۔

یہ تو ماں کا قصہ ہوا، اب سنو کہ حسن کو عجمی کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا۔ یہ عجمی مجوسی تھا۔ مسلمانوں سے اس کو بڑی نفرت تھی۔ جب اس کا داؤ کسی مسلمان پر چل جاتا تو وہ اُسے بے تباہ کیے نہ چھوڑتا کیوں کہ وہ خبیث اور ملعون اور خود غرض اور کیمیاگر تھا۔ اس مردود کا نام

بہرام مجوسی تھا۔ وہ ہر سال کسی نہ کسی مسلمان کو پکڑ کر کسی خاص مطلب کے لیے ذبح کر ڈالتا تھا۔ جب اس کی چال سنار حسن پہ چل گئی اور وہ اُسے لے کر چلا۔ صبح سے شام تک اور پھر شام سے دوسری صبح تک۔ چلنے کے بعد کشتی نے ایک ساحل پر لنگر ڈالا۔ دم لے کر کشتی آگے چلی۔ جب دن نکل آیا تو عجمی نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ صندوق لے آئیں جس کے اندر حسن بند ہے۔ وہ لے آئے تو اس نے صندوق کھول کر حسن کو نکالا۔ اسے سرکہ سنگھایا اور اُس کی ناک میں کوئی سفوف پھونکا۔ حسن کو چھینک آئی اور جو چیز میٹھائی میں ملا کر اسے کھلائی تھی منہ کے ذریعے سے نکل پڑی۔ حسن آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بیچ سمندر میں ہے۔ کشتی چلی جا رہی ہے اور عجمی اس کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اُسے یقین آگیا کہ عجمی کا فریب کارگر ہو گیا اور وہ اسی بلا میں گرفتار ہو جس سے اُس کی ماں اُسے ڈراتی تھی۔ اس نے لاحول پڑھ کر خدا سے دُعا مانگی کہ اے عالموں کے پروردگار، میری تقدیر میں مہربانی سے کام لے اور اپنے امتحان میں مجھے صبر عطا کر۔ اس کے بعد اس نے عجمی کی طرف نرمی کے ساتھ مخاطب ہو کر کہا کہ اے میرے والد، یہ تو نے کیا حرکت کی اور کیا ہوا اس روٹی اور نمک کو اور کہاں گئی وہ قسم جو تو نے میرے ساتھ کھائی تھی؟ عجمی نے آنکھیں نکال کر کہا او کُتے! کیا دنیا میں لوگ روٹی اور نمک کا پاس کرتے ہیں! میں نے تیری طرح ایک کم ہزار لڑکوں کو قتل کیا ہے اور تیرے بعد پورے ہزار ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے حسن کو ڈانٹا۔ حسن نے زبان روک لی اور اُسے یقین ہو گیا کہ قسمت کا تیر اُس پر آ پڑا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوئی . . . .

سات سو بیاسیویں رات

جب سات سو بیاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
حسن کو یقین ہو گیا کہ قسمت کا تیر اس کے آ لگا ہے۔ عجمی ملعون نے اب
حکم دیا کہ اُس کی مشکیں کھول دی جائیں اور لوگوں نے اُسے تھوڑا تھوڑا
پانی پلانا شروع کیا۔ مجوسی ہنس رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ آگ اور
روشنی، سائے اور گرمی کی قسم میں یہ نہ سمجھتا تھا کہ تو میرے جال میں
پھنس جائے گا لیکن آگ کے طفیل میں نے تجھ پر قابو پا لیا اور اُس کی
مدد سے تجھے رام کر لیا یہاں تک کہ میری حاجت پوری ہو گئی۔ اب میں
گھر واپس جا کر تجھے آگ پر قربان کروں گا تاکہ وہ مجھ سے راضی ہو جائے۔
حسن نے کہا کہ تو نے روٹی اور نمک کے معاملے میں مجھ سے خیانت کی۔
وہ شاید کچھ اور بھی کہتا لیکن مجوسی نے ہاتھ اٹھا کر اُسے ایسی دھول
ماری کہ اُس کے دانت زمین پر گر گئے۔ اس پر غشی طاری ہو گئی اور
اُس کے آنسو بہنے لگے۔ مجوسی نے اپنے غلاموں سے کہا کہ آگ جلائیں،
حسن نے پوچھا کہ تو آگ میں جلا کر کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا
کہ یہ آگ روشنی اور چنگاریوں کی ساخت ہے اور میں اسی کی عبادت
کرتا ہوں۔ اگر تو بھی میری طرح اس کی پرستش کرے تو میں اپنی آدھی
دولت تجھے دے دوں اور اپنی بیٹی کی شادی تیرے ساتھ کر دوں۔ حسن
نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ مردود! تو کافر مجوسی ہے اور اس خدا کو چھوڑ کر
جس نے دن رات پیدا کیے ہیں آگ کو پوجتا ہے۔ انھی وجہوں سے تمام
مذہبوں پر مصیبت آتی ہے۔ یہ سن کر مجوسی طیش میں آ گیا اور کہنے لگا کہ

اے عرب کے بیٹے کیا تو میرا کہنا نہ مانے گا اور میرے مذہب کی پیروی نہ کرے گا؟ لیکن حسن نے بالکل اس کی بات نہ مانی۔ ملعون مجوسی نے اُٹھ کر آگ کے آگے سجدہ کیا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ حسن کو اوندھا لٹائیں اور جب انھوں نے اُسے پیٹ لٹا دیا تو مجوسی نے اُسے ایسے کوڑے سے مارنا شروع کیا جو چمڑے کے تسموں سے گُندھا ہوا تھا یہاں تک کہ اُس کی کھال پھٹ گئی۔ وہ دُہائی دیتا لیکن کوئی اس کی دُہائی نہ سُنتا اور وہ مدد کے لیے چلّاتا مگر کوئی اُس کی مدد کو نہ آتا۔ بالآخر اس نے اپنی نظر اُوپر خدا کی طرف اٹھائی اور اُسے رسول اللہ کا واسطہ دیا۔ اس کا صبر جاتا رہا۔ آنسو رُخساروں پر مینہہ کی طرح برسنے لگے۔ مجوسی نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اُسے بٹھائیں اور اس کے آگے کھانا پینا رکھیں۔ غلام کھانا پینا لے آئے لیکن حسن نے نہ دانہ کھایا نہ پانی پیا۔

مجوسی راستے بھر اُسے دن رات تکلیفیں دیتا اور وہ صبر کرتا۔ جتنا حسن خدا کے آگے گڑگڑاتا مجوسی کا دل اُس کی طرف سے سخت ہوتا جاتا۔ اسی طرح وہ تین مہینے تک سمندر میں سفر کرتے اور حسن کو تکلیف پہنچاتے رہے۔ جب پورے تین مہینے گزر چکے تو خدا کی طرف سے ایک آندھی آئی، سمندر تاریک ہو گیا۔ کشتی اُچھلنے لگی۔ ناخدا اور ملاحوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم پر اسی لڑکے کا صبر پڑا ہے جسے مجوسی تین مہینے سے تکلیف دے رہا ہے۔ خدا ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجوسی پر بلوہ کر دیا۔ اس کے غلام اور ساتھیوں کو مار ڈالا۔ جب مجوسی نے دیکھا کہ اُس کے غلام مار ڈالے گئے ہیں تو وہ ڈرا کہ کہیں میں بھی نہ مار ڈالا جاؤں۔ اس نے حسن کی مشکیں کھول دیں۔ اس کے پھٹے پُرانے کپڑے اُتار کر اُسے دُوسرے کپڑے پہنا دیے۔ اس سے صلح کی درخواست کی اور کہا کہ میں تجھے وہ فن سکھا دوں گا

اور تجھے تیرے وطن پہنچا دوں گا۔ بیٹا میں نے جو کچھ کیا ہو اس کا بدلہ مت نکال۔ حسن بولا کہ اب میں تیرا کیوں کر یقین کر سکتا ہوں! اس نے کہا کہ بیٹا! اگر دنیا میں گناہ نہ ہوتا تو مغفرت بھی نہ ہوتی۔ اور میں تو تیرے صبر کا امتحان کر رہا تھا اور تجھے یہ تو معلوم ہی ہو کہ جو خدا کرتا ہو وہی ہونا ہو۔

حسن کی رہائی پر ملاح اور ناخدا خوش ہوگئے۔ حسن نے ان کو دعا دی اور خدا کی تعریف کی۔ اس کا شکر بجالایا۔ اب آندھی رک گئی اور اندھیرا جاتا رہا۔ کشتی بادِ موافق کے ساتھ چلنے لگی۔ حسن نے مجوسی سے پوچھا کہ ای عجمی! تو کہاں جا رہا ہو؟ اس نے کہا کہ بیٹا! میں جبل السحاب جا رہا ہوں جہاں وہ اکسیر ملتی ہو جس سے ہم کیمیا بناتے ہیں۔ اس کے بعد مجوسی نے حسن کے آگے آگ اور روشنی کی قسم کھا کر کہا کہ اب تجھے مجھ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مجوسی کی یہ باتیں سن کر حسن خوش ہوگیا اور اسے اطمینان ہوگیا اب مجوسی اس کے ساتھ کھانے پینے بیٹھنے اٹھنے لگا۔ اُسے اپنے کپڑے پہننے کو دیے۔ تین مہینے سفر کرنے کے بعد کشتی نے ایک بہت لمبی خشکی پر لنگر ڈالا جہاں سفید، زرد، نیلے، کالے اور باقی تمام رنگوں کے کنکر پتھر تھے۔ جوں ہی کشتی نے وہاں لنگر ڈالا، عجمی اُٹھ کھڑا ہوا اور حسن سے کہنے لگا کہ اُتر، ہم جہاں پہنچنا چاہتے تھے پہنچ گئے۔ حسن اُٹھ کھڑا ہوا اور عجمی کے ساتھ اتر پڑا۔ مجوسی ناخدا کو اپنا سامان سپرد کر کے حسن کے ساتھ چل دیا۔ چلتے چلتے دونوں کشتی سے دور نظروں سے غائب ہو گئے۔ ایک جگہ ایسی آئی جہاں مجوسی بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا طبلہ نکالا جو تانبے کا تھا اور ایک ریشمی ڈوری جو سنہری تاروں سے بٹی ہوئی تھی اور اس پر طلسمات لکھے ہوئے تھے پھر اس نے اس طبلے کو بجایا۔ طبلہ بجتے ہی جنگل کے پیچھے سے

گرد اُٹھی۔ یہ دیکھ کر حسن کو تعجب ہوا۔ وہ مجوسی سے ڈرنے لگا اور اُس کے ساتھ اُترنے پر پشیمان ہوا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مجوسی نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا کہ بیٹا! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ قسم ہے آگ اور روشنی کی اب تجھے مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر میری مراد بغیر تیرے نام کے پوری ہو سکتی تو میں تجھے ہرگز کشتی سے نہ اُتارتا۔ خوش ہو کہ اب تیرے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اور یہ گرد وہ ہے جس پر ہم سوار ہوں گے اور جو ہمیں اس جنگل کے طے کرنے میں مددگار ہو گی اور ہماری مشکل کو آسان کر دے گی۔ اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو تراسیویں رات

جب سات سو تراسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! عجمی نے حسن سے کہا کہ اس گرد کی وجہ سے ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ چناں چہ تھوڑی دیر کے بعد گرد پھٹی اور اس میں سے تین اصیل اونٹنیاں نکلیں، ایک پر عجمی سوار ہو گیا اور دوسری پر حسن اور تیسری پر انھوں نے سفر کے لیے کھانے پینے کا سامان رکھ لیا اور سات دن تک چلتے رہے۔ ایک بڑے میدان میں پہنچ کر وہ ٹھیر گئے اور ایک گنبد دیکھ کر جو چار سُرخ سونے کے کھمبوں پر کھڑا تھا اونٹنیوں پر سے اتر پڑے۔ گنبد کے نیچے بیٹھ کر کھایا پیا اور سستانے لگے۔ اتنے میں حسن کی نظر ایک اونچی عمارت پر پڑی وہ کہنے لگا کہ چچا! یہ کیا ہے؟ مجوسی بولا کہ یہ ایک محل ہے۔ حسن نے کہا کہ آؤ اس کے اندر جا کر ہم آرام کریں اور اُس کی

سیر کریں۔ مجوسی اس کے پاس منھ لاکر کہنے لگا کہ میرے آگے اس محل کا ذکر مت کر کیوں کہ اس میں میرا ایک دشمن رہتا ہے، اس کے ساتھ مجھے ایک قصہ درپیش ہے جس کے بیان کرنے کا یہ وقت نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے طبلہ بجایا اور اونٹنیاں آ موجود ہوئیں۔ دونوں پھر سوار ہوگئے اور سات دن تک چلتے رہے۔ جب آٹھواں دن ہوا تو مجوسی نے کہا کہ اے حسن! تجھے کیا دکھائی دیتا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے بادل ہی بادل دکھائی دیتے ہیں جو پورب سے پچھم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مجوسی بولا کہ یہ بادل نہیں بلکہ ایک بڑا اونچا پہاڑ ہے جس پر بادل آکر ٹکراتے ہیں۔ وہ اتنا اونچا ہے کہ اس کے اوپر کوئی بادل نہیں جا سکتا۔ ہماری منزلِ مقصود یہی پہاڑ ہے کیوں کہ جس چیز کی ہمیں تلاش ہے وہ اسی پر ملتی ہے۔ اسی وجہ سے میں تجھے اپنے ساتھ لایا ہوں کیوں کہ تیرے ہی ہاتھوں میری مراد پوری ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر حسن اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور مجوسی سے کہنے لگا کہ تجھے قسم ہے اپنے معبود کی اور اپنے دین کی جس پر تیرا ایمان ہے وہ تیرا کون سا مقصد ہے جس کی وجہ سے تو مجھے یہاں لایا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیمیا کی صنعت بلا ایک بوٹی کے مکمل نہیں ہوتی جو ایسی ہی جگہ اُگتی ہے جہاں بادل ٹکرا کر الگ ہو جاتے ہیں اور وہ یہی پہاڑ ہے اور اسی کے اوپر وہ بوٹی ہے۔ جب ہمیں وہ بوٹی مل جائے گی تو میں تجھے وہ فن سکھا دوں گا۔ مارے ڈر کے حسن نے کہہ دیا کہ اے میرے آقا! ہاں مگر وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ماں اور رشتے داروں اور وطن کی جدائی پر رونے لگا اور اس بات پر پشیمان تھا کہ اس نے اپنی ماں کا کہنا نہ مانا۔

آخر دونوں چلتے چلتے اس پہاڑ کے پاس جا پہنچے اور اس کے نیچے

ٹھیر گئے۔ حسن نے دیکھا کہ پہاڑ کے اوپر ایک محل ہو وہ مجوسی سے پوچھنے لگا کہ
یہ محل کیسا ہی؟ اس نے جواب دیا کہ یہ جنّوں اور بھوت پریتوں اور شیطانوں کے
رہنے کی جگہ ہو۔ اب مجوسی اپنی اونٹنی پر سے اُترا اور حسن سے کہا کہ تو بھی اتر پڑ
اور اُٹھ کر اس کا سر چوما اور کہنے لگا کہ جو کچھ میں نے تیرے ساتھ کیا ہو اُس کا بُرا
نہ مان۔ جب تو محل میں داخل ہوگا تو میں تیری حفاظت کروں گا مگر میں تجھے
قسم دیتا ہوں کہ تجھے جو چیز وہاں سے ملے اُس میں میرے ساتھ دھوکے بازی مت
کیجیو اس میں میرا اور تیرا حصہ برابر کا ہو۔ حسن نے کہا کہ سر آنکھوں پر۔ مجوسی نے
ایک تھیلا کھولا اور اس میں سے ایک چکّی نکالی اور تھوڑے سے گیہوں نکال کر
اسی چکّی میں پیسے اور تین ٹکیاں بنائیں اور آگ جلا کر انھیں پکایا پھر وہی
تانبے کا طبلہ اور کالا جوتی ڈوری نکال کر طبلہ بجایا۔ اونٹنیاں آ موجود ہوئیں۔
اس نے اُن میں سے ایک اونٹنی کو پچھاڑ کر ذبح کیا اور اُس کی کھال کھینچ کر
حسن سے کہا کہ اے میرے بیٹے اے حسن! جو میں کہتا ہوں اُسے کان دھر کر سُن۔
اس نے کہا کہ کہیے۔ مجوسی بولا کہ اس کھال کے اندر گھس جا۔ میں اُسے سی کر
تجھے زمین پر ڈال دوں گا اور سفید گدھ آ کر تجھے اٹھا لے جائیں گے اور
تجھے اڑا کر اس پہاڑ کے اوپر لے جائیں گے۔ لے اس چھری کو اپنے ساتھ رکھ لے۔
جب وہ اُڑا کر رک جائیں اور تجھے یقین ہو جائے کہ تو پہاڑ پر پہنچ گیا ہو
تو تو کھال چاک کر کے نکل آئیو۔ گدھ تجھ سے ڈر کر بھاگ جائیں گے اور تو
پہاڑ پر سے مجھے دیکھ کر مجھ سے بات کیجیو تاکہ میں بتا دوں کہ تجھے کیا کرنا ہی۔
اس کے بعد اس نے تینوں ٹکیاں اور ایک کوزہ پانی کا اُس کے ساتھ کھال
کے اندر رکھ دیا اور کھال کو سی دیا۔ سفید گدھوں نے آ کر اُسے اٹھا لیا اور
اڑ کر پہاڑ پر پہنچے اور اُسے وہاں رکھ دیا۔ جب حسن کو یقین ہو گیا کہ گدھوں

نے اُسے پہاڑ پر رکھ دیا ہو تو اس نے کھال چاک کر دی اور اس میں سے
نکل کر مجوسی کو آواز دی۔ اس کی آواز سن کر مجوسی اتنا خوش ہوا کہ مارے
خوشی کے ناچنے لگا اور کہا کہ پیچھے کی طرف جا اور جو کچھ تجھے نظر پڑے مجھ
سے کہہ۔ حسن نے جا کر دیکھا کہ بہت سی سڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہیں اور
اُن کے پاس بہت سی لکڑیاں۔ اس نے مجوسی سے کہا کہ اُسے یہ یہ چیزیں
دکھائی دیتی ہیں۔ مجوسی بولا کہ یہی میرا مقصد ہے۔ ان لکڑیوں کے چھ
گٹھر باندھ کر میرے پاس پھینک دے۔ انہی سے ہم کیمیا بناتے ہیں۔ جب
حسن نے چھ گٹھر پھینک دیے اور مجوسی نے دیکھ لیا کہ وہ اس کے پاس پہنچ
گئے ہیں تو وہ حسن سے کہنے لگا کہ او موت کے شکار، جو میری ضرورت تجھ
سے تھی وہ پوری ہو گئی اب خواہ تو پہاڑ پر بیٹھا رہ اور خواہ زمین پر کود کر
مرجا۔ یہ کہہ کر مجوسی چلتا بنا۔ حسن نے لاحول پڑھی اور کہا کہ یہ کتا میرے
ساتھ چال چل گیا اور بیٹھ کر اپنے اوپر واویلا کرنے لگا۔ اور شہرزاد کو صبح
ہوئی .....

سات سو چوراسیویں رات

جب سات سو چوراسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
حسن نے لاحول پڑھ کر کہا کہ اس مردود بڈھے کی چال مجھ پر چل گئی اور وہ
کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے۔ کبھی پہاڑ پر اِدھر جاتا کبھی اُدھر اُسے یقین
تھا کہ اب میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ اسی اثنا میں جب وہ پہاڑ کے دوسری
طرف پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پہاڑ سے ملا ہوا ایک نیلا سمندر ہے جو پہاڑ کے

برابر موجیں مار رہا ہے۔ وہ بیٹھ کر جو کچھ قرآن میں سے یاد تھا پڑھنے لگا اور خدا سے دعا مانگی کہ میری مشکل آسان کردے خواہ موت سے یا ان مصیبتوں سے چھٹکارے سے۔ پھر خود اپنے اوپر جنازے کی نماز پڑھ کر سمندر میں کود پڑا۔ موجوں نے اسے بے جان خدا کی قدرت سے صحیح وسلامت خشکی پر پہنچا دیا۔ اس نے خدا کی تعریف کی، شکر بجا لایا اور اٹھ کر کھانے کی کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں مجوسی نے اسے کھال میں سیا تھا۔ آگے بڑھا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بڑے اونچے محل کے پاس جا نکلا۔ یہ وہی محل تھا جس کے بارے میں اس نے مجوسی سے پوچھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اس میں میرا ایک دشمن رہتا ہے۔ حسن اپنے دل میں کہنے لگا کہ اس محل میں ضرور جانا چاہیے، ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے خوشی حاصل ہو۔ اس نے دیکھا کہ محل کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور وہ داخل ہو گیا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا کہ ایک چوکی پر دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں جو چاند کی طرح ہیں۔ ان کے بیچ میں شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہے اور وہ کھیل رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے سر اٹھایا اور مارے خوشی کے چلا اٹھی کہ خدا کی قسم یہ انسان ہے اور میرے خیال میں یہ وہی ہے جسے مجوسی بہرام اس سال لایا ہوگا۔ اس کی باتیں سن کر حسن ان کے آگے گر پڑا اور زار زار رونے لگا اور کہا کہ اے پری زادو خدا کی قسم میں بے چارہ وہی ہوں۔

اب چھوٹی لڑکی نے اپنی بڑی بہن سے کہا کہ بہن، تو گواہ رہیو کہ میں خدا سے عہد و پیمان کرتی ہوں کہ یہ میرا بھائی ہے، اس کی موت میری موت ہے اور اس کی زندگی میری زندگی۔ اس کی خوشی میری خوشی اور اس کا غم میرا غم۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اسے گلے لگا کر بوسہ دیا اور اس کا ہاتھ

پکڑ کر اپنی بہن کے ساتھ ساتھ محل میں داخل ہوئی۔ اُس کے پیچھے پُرانے کپڑے اُتار کر شاہانہ پوشاک لائی اور اُسے پہنائی اور طرح طرح کے کھانے تیار کرکے اُس کے آگے رکھے۔ اُس نے اور اُس کی بہن نے حسن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اس سے کہا کہ جب سے تو اُس کافر جادوگر کے پنجے میں پھنسا ہے اُس وقت سے لے کر اس سے چھٹکارا پانے تک کی داستان سُنا ۔ اس کے بعد ہم بھی سُنائیں گے کہ ہمیں اس کے ساتھ شروع سے لے کر آخر تک کیا پیش آیا تاکہ اگر تو پھر اُسے دیکھے تو اُس سے خبردار رہے۔ اُن کی یہ باتیں سُن کر اور اُن کی آؤ بھگت دیکھ کر حسن کی جان میں جان آئی اور اس کے ہوش درست ہوئے اور اس نے اپنا سارا قصہ شروع سے لے کر آخر تک سُنا دیا۔ لڑکیوں نے کہا کہ تو نے اُس سے اِس محل کے بارے میں بھی پوچھا تھا؟ اس نے جواب دیا ہاں پوچھا تھا اور اس نے جواب دیا تھا کہ میں اسے پسند نہیں کرتا کیوں کہ اس میں شیطان اور ابلیس رہتے ہیں۔ یہ سُن کر لڑکیاں طیش میں آگئیں اور کہنے لگیں کہ یہ کافر ہمیں شیطان اور ابلیس کہتا ہے؟ حسن نے جواب دیا کہ ہاں۔ چھوٹی لڑکی جو حسن کی بہن بنی تھی بولی کہ قسم ہے خدا کی میں اسے ایسی بُری مار ماروں گی کہ پھر اسے دُنیا کی ہوا نصیب نہ ہو۔ حسن نے پوچھا کہ تیری پہنچ اُس تک کیسے ہوگی اور تو اسے کس طرح قتل کرے گی؟ وہ تو بڑا مکار جادوگر ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ مشید نامی باغ میں رہتا ہے اور میں اسے عنقریب مار ڈالوں گی۔ اس کی بہن بولی کہ حسن سچ کہتا ہے اور جو کچھ بھی اُس نے اس کُتّے کے بارے میں کہا ہے ٹھیک ہے لیکن اُسے ہماری ساری داستان بھی سُنا دے تاکہ وہ بھی اس کے ذہن میں رہے۔

اب چھوٹی بہن نے بیان کرنا شروع کیا کہ اے میرے بھائی! ہم شہزادیاں ہیں اور ہمارا باپ جنوں کا ایک عظیم الشان بادشاہ ہے اور اس کے پاس دیوؤں کا بہت بڑا لشکر ہے۔ خدا نے اُسے ایک ہی بیوی سے سات بیٹیاں دی ہیں اور اس میں

انتی غیرت اور رشک اور حمیّت ہو کہ اس نے ہماری شادی بھی اب تک کسی سے
نہیں کی۔ ایک بار اس نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں کو اکٹھا کر کے پوچھا کہ کیا تم
مجھے کسی ایسی جگہ کا پتا دے سکتے ہو جہاں تک کسی کی رسائی نہ ہو سکتی ہو نہ انسانوں
کی اور نہ جنات کی اور جہاں بہت سے درخت اور میوے اور چشمے ہوں؟ انھوں نے
کہا کہ جہاں پناہ! تو اُسے کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا کہ میں اپنی ساتوں بیٹیوں
کو وہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جبل قاف کا محل ان کے لیے مناسب
ہوگا جسے ان جنوں میں سے ایک جن نے بنایا تھا جنھوں نے حضرت سلیمانؑ کی
نافرمانی کی تھی۔ جب سے وہ مارا گیا ہو اس میں کوئی نہیں رہا نہ انسان نہ جن کیوں کہ
وہ اتنی دور ہو کہ کسی کی پہنچ نہیں۔ اس کے اردگرد درخت اور پھل اور چشمے ہیں
جن کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سرد ہو۔ اگر کسی کو کوڑھ وغیرہ
ہو اور وہ اس پانی کو پی لے تو فوراً اچھا ہو جاتا ہو۔ جب ہمارے باپ نے یہ سُنا
تو ہمیں اس محل میں بھیج دیا اور ہمارے ساتھ بڑا لاؤ لشکر کر دیا اور ضرورت کی ہر چیز
مہیا کر دی۔ جب وہ سوار ہونا چاہتا ہو تو ڈھول بجتا ہو اور ساری فوجیں آ کر اس کے
پاس حاضر ہو جاتی ہیں اور وہ ان میں سے چن لیتا ہو کہ کون کون اس کے ساتھ سوار ہوں
باقی لوگ لوٹ جاتے ہیں اور جب ہمارا باپ چاہتا ہو کہ ہم اس کی خدمت میں
حاضر ہوں تو وہ اپنے ماتحت جادوگروں کو حکم دیتا ہو کہ ہمیں آ کر لے جائیں اور
وہ ہمارے پاس آ کر ہمیں اس کی خدمت میں لے جاتے ہیں تاکہ وہ ہمیں دیکھ کر
[illegible] اس کے بعد ہم اس جگہ
واپس آ جاتے ہیں۔ ہماری باقی پانچ بہنیں [illegible] جو اس وقت جنگل میں
شکار کھیلتی ہیں کیوں کہ یہاں بے شمار جنگلی جانور ہیں۔ ہم میں سے دو باری باری
کھانا پکانے کے لیے یہاں ٹھیر جاتی ہیں۔ آج میری اور میری اس بہن کی باری ہو

اور ہم کھانا پکانے کے لیے ٹھیرے ہیں۔ ہم خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ وہ کسی انسان کو یہاں بھیج دے تاکہ ہم اس کے ساتھ بیٹھ کر خوش ہوں۔ اس کا شکر ہو کہ اس نے تجھے ہمارے پاس بھیج دیا۔ خوش اور دل شاد ہو، تجھے یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔
یہ سن کر حسن خوش ہوگیا اور کہنے لگا کہ شکر ہو خدا کا کہ اس نے مجھے چھٹکارے کے راستے پر لگا دیا اور اپنے بندوں کے دلوں کو میری طرف سے نرم کر دیا۔ اب اس کی بہن اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک کمرے میں لے گئی اور وہاں سے ایسے ایسے لباس اور فرش نکال کر لائی جو دنیا میں کسی کے پاس نہ ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بہنیں بھی سیر و شکار سے لوٹیں اس نے اُن سے حسن کا ذکر کیا۔ وہ بھی خوش ہوئیں اور کمرے میں جا کر اسے سلام کیا اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دی۔ حسن ان کے ساتھ بڑے عیش و عشرت سے رہنے لگا اُن کے ساتھ سیر و شکار کو جاتا اور شکار مار کر ذبح کرتا۔ غرض کہ بہت جلد وہ اُن سے مانوس ہوگیا اور اُن کے ساتھ اس طرح اُس جگہ رہتے رہتے اس کے بدن میں توانائی بھی آگئی رنگ روپ نکل آیا۔ وہ ان کے ساتھ اس خوب صورت محل میں سیر کرتا باغوں اور پھولوں کے مزے لیتا اور وہ اُس کی خاطر تواضع کرتیں، بات چیت سے اس کا دل بہلاتیں۔ اس سے اُس کے دل کی گھبراہٹ جاتی رہی اور لڑکیاں اس کی وجہ سے خوش و خرم رہنے لگیں جتنی اُن کو اُس سے خوشی ہوتی تھی اس سے زیادہ اُسے اُن سے۔ اس کے بعد چھوٹی بہن نے اپنی بہنوں سے بہرام مجوسی کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اس نے اسے شیطان اور ابلیس اور بھوت بتایا ہے۔ اس پر سب نے قسم کھا کر کہا کہ ہم اُسے بے قتل کیے نہ مانیں گے۔
جب دوسرا سال ہوا تو وہ ملعون ایک خوب صورت مسلمان جوان کو لے کر آیا جو چاند کا ٹکڑا تھا۔ اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس جوان کو لے کر وہ اسی محل کے نیچے اُترا جہاں حسن لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ حسن درختوں

کے نیچے ایک چشمے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی حسن کا دل دھڑکنے لگا اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی۔۔۔۔۔۔

سات سو پچاسیویں رات

جب سات سو پچاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ ای نیک نہاد بادشاہ! مجوسی کو دیکھ کر حسن سنار کا دل دھڑکنے لگا اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہاتھ ملنے لگا اور اس نے لڑکیوں سے کہا کہ بہنو! خُدا کے لیے اس ملعون کو قتل کرنے میں میری مدد کرو۔ دیکھو وہ آگیا ہے اور تمھارے قبضے میں ہے۔ اُس کے ساتھ ایک جوان مسلمان قیدی ہے جو کسی بڑے آدمی کا لڑکا معلوم ہوتا ہے مجوسی اسے سخت تکلیف پہنچا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے قتل کر دوں تاکہ میرا دل ٹھنڈا ہو جائے اور جوان کو اس کے ہاتھوں تکلیف سے چھٹکارا ملے، میں ثواب لوں اور مسلمان جوان اپنے وطن واپس جاکر اپنے بھائیوں اور رشتے داروں اور دوستوں سے ملے۔ یہ تمھاری طرف سے خیرات ہوگی اور خُدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔ لڑکیاں بولیں کہ ای حسن! تیرا اور خُدا کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈالیں اور ہتھیار لگا کر کمر سے تلواریں باندھ لیں اور حسن کے لیے بہترین گھوڑا منگوا کر اس پر چار جامہ کسا اور حسن کے عمدہ عمدہ ہتھیار باندھے۔ اس کے بعد سب چل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ مجوسی ایک اونٹ کو ذبح کر کے اس کی کھال کھینچ چکا ہے اور جوان کو سخت تکلیف دے رہا اور اس سے کہہ رہا ہے کہ اس کھال کے اندر گھس۔ اتنے میں حسن پیچھے سے آ پہنچا مجوسی کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور اس زور سے للکارا کہ اس کی عقل جاتی رہی وہ بدحواس ہو گیا۔ اب حسن نے آگے بڑھ کر کہا کہ ای ملعون، ای خُدا اور مسلمانوں کے دشمن، ای کُتّے، ای

دھوکے باز، اے آتش پرست، اے گنہ گاروں کے راستے پر چلنے والے، اپنا ہاتھ روک۔ کیا تو آگ اور روشنی کی پرستش کرتا اور دھوپ چھاؤں کی قسم کھاتا ہے؟ مجوسی نے مُڑ کر دیکھا اور جوں ہی اس کی نظر حسن پر پڑی وہ کہنے لگا کہ بیٹا! تو کیسے چھوٹ کر زمین پر اُتر آیا ہے؟ حسن نے جواب دیا کہ اے کافر زندیق، مجھے اس خُدا نے چھڑایا ہے جو تیری جان اسی طرح تیرے دشمنوں کے ہاتھ سے لے گا جس طرح تو نے مجھے راستے بھر تکلیفیں پہنچائی ہیں۔ اب تو مصیبت میں آ پھنسا ہے اور راستہ بھول گیا ہے، اب نہ ماں تجھے فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ بھائی نہ دوست نہ کوئی پکا عہد و پیمان۔ تیرا ہی قول ہے کہ جو کوئی روٹی اور نمک میں خیانت کرتا ہے خدا اُس کا بدلا لیتا ہے، تو نے روٹی اور نمک میں خیانت کی ہے اس لیے خُدا نے تجھے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور اب تیرا چھٹکارا مجھ سے ناممکن ہے۔ مجوسی نے کہا کہ بیٹا! خُدا کی قسم میں تجھے اپنی جان اور اپنی آنکھوں کی روشنی سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

حسن نے کچھ نہیں سُنا بڑھ کر اس پھُرتی سے اُس کی گُدّی پر وار کیا کہ تلوار چمکتی ہوئی اس کی گردن کے آر پار ہو گئی اور خُدا نے اس کی روح فوراً دوزخ میں پہنچا دی جو بُری رہنے کی جگہ ہے۔ اس کے بعد حسن نے وہ تھیلا لیا جو مجوسی کے پاس تھا اور اُسے کھول کر اس میں سے طبلہ اور ڈوری نکالی اور ڈوری سے طبلہ بجایا۔ اس پر اونٹنیاں بجلی کی طرح حسن کے پاس آ پہنچیں۔ اس نے جوان کی مُشکیں کھول کر اُسے ایک اونٹنی پر بٹھا دیا اور دوسری پر کھانے پینے کا سامان باندھ کر اس سے کہا کہ اپنے وطن جا۔ جوں ہی خُدا نے اسے حسن کی بہ دولت تکلیف سے نجات دی وہ روانہ ہو گیا۔ جب لڑکیوں نے دیکھا کہ حسن نے مجوسی کی گردن اُڑا دی ہے تو وہ مارے خوشی کے اس کے اِرد گرد پھرنے لگیں اور انھیں اس کی بہادری اور قوت پر بڑا تعجب ہوا انھوں نے اس کارگزاری پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی سلامتی پر مبارک باد

دی اور کہا کہ ای حسن، تو نے وہ کام کیا جس سے بیمار شفا پاتے ہیں اور خدا خوش ہوتا ہے۔
اب وہ لڑکیوں کو لے کر محل میں گیا اور ان کے ساتھ کھانے پینے ہنسی مذاق میں مشغول
ہو گیا اور ان کی صحبت میں اُسے اتنا مزا آیا کہ وہ اپنی ماں کو بھول گیا۔

وہ ان کی صحبت کے مزے اُڑا ہی رہا تھا کہ اتنے میں جنگل کی طرف سے ایسی
گرد اٹھتی دکھائی دی کہ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ لڑکیوں نے کہا کہ ای حسن، اُٹھ
اور اپنے کمرے میں جا کر چھپ جا، ورنہ باغ میں جا کر درختوں اور انگور کی بیلوں میں
چھپ رہ لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ حسن جا کر اپنے کمرے میں چھپ رہا اور اسے
اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گرد پھٹی اور اس میں سے متلاطم سمندر کی طرح
ایک زبردست لشکر نکلا جو اس بادشاہ کے پاس سے آیا تھا جو ان لڑکیوں کا باپ
تھا۔ جب لشکر وارد ہوا تو لڑکیوں نے انھیں بہترین جگہ ٹھیرایا اور تین روز تک ان
کی دعوت کی۔ پھر ان سے خیریت اور خبر پوچھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم بادشاہ کے
پاس سے تمھیں لینے آئے ہیں۔ لڑکیوں نے پوچھا کہ بادشاہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟
انھوں نے جواب دیا کہ ایک بادشاہ کے ہاں جشن منایا جا رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تم
بھی آ کر اس میں شریک ہو۔ لڑکیوں نے پوچھا کہ ہمیں کتنے دن لگیں گے؟ انھوں نے
جواب دیا کہ جانا آنا اور دو مہینے۔ لڑکیاں اٹھ کر محل میں حسن کے پاس گئیں اس سے
سارا ماجرا بیان کر کے کہا کہ یہ مکان تیرا مکان ہے اور ہمارا گھر تیرا گھر ہے۔ تو خوش اور
اطمینان سے رہیو۔ ڈرنے گھبرانے کی کوئی بات نہیں کسی کی مجال نہیں کہ اس جگہ آ سکے۔
ہر قسم کا سامان یہاں موجود ہے۔ ہم اپنے کمروں کی یہ کنجیاں تیرے پاس چھوڑے جاتے
ہیں لیکن بھائی تجھے بھائی چارے کی قسم فلاں دروازے کو نہ کھولیو کیوں کہ اس کا
کھولنا تیرے لیے بے کار ہے۔ یہ کہ کر وہ حسن سے رخصت ہوئیں اور لشکر کے ساتھ روانہ
ہو گئیں۔ حسن محل میں اکیلا رہ گیا اور ان کی جدائی کی وجہ سے گھبرانے لگا۔ محل باوجود

اتنا بڑا ہونے کے اسے تنگ معلوم ہوتا تھا اسے وحشت ہونے لگی ، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو چھپاسیویں رات

جب سات سو چھپاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد جب حسن اکیلا رہ گیا تو اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ وہ اکیلا سیر و شکار کے لیے جاتا شکار مار کر اسے ذبح کرتا اور اکیلا کھاتا۔ جب تنہائی کی وجہ سے اُسے وحشت اور گھبراہٹ ہونے لگی تو وہ اٹھ کر چاروں طرف گھومنے لگا۔ دل بہلانے کی غرض سے اس نے لڑکیوں کے کمرے کھولے اور دیکھا کہ ان میں اتنی دولت بھری پڑی ہے کہ جس کا حساب عقل بھی نہیں کر سکتی لیکن لڑکیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے اُسے اس کا کوئی مزا نہ آیا۔ جس دروازے کے بارے میں اس کی بہن نے کہا تھا کہ اسے ہرگز نہ کھولیو بلکہ اس کے پاس تک نہ پھٹکیو اس کے لیے حسن کے دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ میری بہن نے اس دروازے کو نہ کھولنے کے لیے ضرور اسی وجہ سے کہا ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو وہ نہیں چاہتی کہ کوئی دیکھے۔ قسم ہے خدا کی کہ میں اُسے کھول کر دیکھوں گا کہ اس میں کیا چیز ہے خواہ موت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کہ کر اس نے کنجی سے وہ کوٹھری کھولی اور دیکھا کہ اس میں مال و دولت کچھ بھی نہیں لیکن غور جو کیا تو اندر ایک زینہ دکھائی دیا جو سلیمانی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس زینے پر چڑھ کر وہ محل کی چھت پر پہنچ گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ انھوں نے بس اسی لیے مجھے منع کیا تھا۔ اب وہ چھت پر گھومنے پھرنے لگا اور اس نے دیکھا کہ محل کے نیچے بہت

سے کھیت اور باغ اور درخت اور پھول اور جانور اور چڑیاں ہیں جو چہچہا رہی اور یکتا اور زبردست خدا کی پاکی بیان کر رہی ہیں۔ وہ ان سبزگاہوں کے متعلق سوچ میں تھا کہ اسے بہت بڑا موجزن سمندر دکھائی دیا۔

وہ اس محل کے اِرد گِرد چکر لگاتے لگاتے ایک بیٹھک کے پاس پہنچا جس کے نیچے چار کھمبے تھے اور اُوپر ایک چبوترا تھا جس میں یاقوت اور زمرد اور بلخش اور طرح طرح کے جواہرات کے نقش و نگار تھے اور ایک ایک اینٹ سونے، چاندی، یاقوت اور زمرد کی تھی۔ اس بیٹھک کے بیچ میں ایک حوض تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا جس کے اِرد گِرد صندل اور عود کی چوکھٹوں میں سُرخ سونے اور ہرے زمرد کی جالیاں لگی ہوئی تھیں جن میں کبوتر کے انڈوں کے برابر طرح طرح کے ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ حوض کے ایک طرف عود کا ایک تخت پڑا ہوا تھا جو موتی اور جواہرات سے مرصّع تھا۔ کُندن کی جالیاں تھیں اور رنگ بہ رنگ کے جواہرات سے ایسا جڑا ؤ کہ آدمی دیکھا کرے۔ حوض کے چاروں طرف چڑیاں مختلف آوازوں میں گا رہی تھیں اور ان کی خوش الحانی اور چہچہے اللّٰہ اللّٰہ۔ اپنی اپنی بولیوں میں خُدا کی پاکی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ اس محل کا جواب نہ کسریٰ کے پاس ہوگا نہ قیصر کے پاس۔ حسن اُسے دیکھ کر دنگ ہوگیا اور بیٹھ کر اپنے اِرد گِرد نظر دوڑانے لگا۔

وہ بیٹھا ہوا ان کی خوب صورتی پر تعجب کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا جنگل سے محل کی طرف دس چڑیاں آئیں۔ حسن سمجھا کہ وہ حوض پر پانی پینے آ رہی ہیں وہ اس ڈر سے چھپ گیا کہ کہیں اسے دیکھ کر وہ بھڑک نہ جائیں۔ اب چڑیاں اُتر کر ایک خوب صورت درخت کے گِرد چکّر کرنے لگیں۔ حسن نے دیکھا کہ ان میں ایک چڑیا اوروں سے بہت زیادہ خوب صورت ہے جس کے اِرد گِرد دوسری چڑیاں چڑیوں کی عزت [illegible] کر رہی ہیں۔ حسن کو بڑی حیرت تھی کہ وہ چڑیا باقی

تو چڑیوں پر چونچ مارتی اور ان پر اپنی بڑائی جتاتی ہے اور وہ اس سے بھاگتی ہیں حسن دور کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اب وہ ساری چڑیاں تخت پر بیٹھ گئیں اور پنجوں سے اپنی اپنی کھالیں پھاڑنے لگیں اور پروں کا لباس اتار کر دس پاکیزہ لڑکیاں بن گئیں۔ جن کے حُسن کے آگے چاند بھی مات تھا۔ برہنہ ہو کر وہ سب حوض میں اُتریں اور نہانے کھیلنے اور ہنسی مذاق کرنے لگیں۔ سردار چڑیا انہیں دھکیلتی اور ڈبکیاں دیتی اور وہ اس سے بھاگتیں مگر ان کی یہ مجال نہ ہوتی کہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ حسن اُس کو دیکھتے ہی لٹو ہو گیا، اس کے حواس جاتے رہے اور اسے یقین آگیا کہ لڑکیوں نے اسی وجہ سے منع کیا تھا کہ میں اس دروازے کو نہ کھولوں۔ اس کی رعنائی، بانکی ادائیں اور حسن کا انداز دیکھ کر حسن کی طبیعت بے چین ہو گئی دل ہاتھ سے جاتا رہا، کھڑا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور یہ حسرت کرنے لگا کہ کاش وہ ان کے ساتھ ہوتا! ہوش ٹھکانے نہ تھے، کلیجہ دھڑک رہا تھا، آنکھ دیکھنے میں محو تھی اور تن بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اور اس کا نفس بُرے کام کا حکم دے رہا تھا۔ وہ اس نوبہار حُسن کی گل چینی کے اشتیاق میں رونے لگا اور سر سے پانو تک بھٹی بن گیا اور ایسے شعلے اُٹھنے لگے جن کا بجھانا مشکل پڑ گیا۔ عشق نے ایسے لوکے لگائے جس کا اثر چھپائے نہ چھپ سکا۔ اب لڑکیاں حوض سے باہر آئیں، حسن انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ اُسے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ پانی سے نکل کر سب نے اپنے اپنے کپڑے اور زیور پہن لیے۔ بڑی نے ایک سبز پوشاک زیب جسم کی اور وہ دُنیا کے تمام حسینوں سے حسین تر معلوم ہونے لگی اور چال کی لچک میں وہ ٹہنیوں پر سبقت لے گئی اور عقل اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سات سو ستاسیویں رات

سات سو ستاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ ای نیک نہاد بادشاہ! بڑی لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر حسن کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ جب لڑکیاں اپنے کپڑے پہن چکیں، تو بیٹھ کر باتیں چیتیں اور ہنسی مذاق کرنے لگیں، حسن کھڑا ہوا انھیں دیکھ رہا تھا اور اپنے عشق کے سمندر میں غرق تھا اور اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میری بہن نے انھی لڑکیوں کی وجہ سے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان دروازوں کو نہ کھولوں تاکہ کہیں میں اُن میں سے کسی سے پھنس نہ جاؤں۔ اب حسن اس کے ایک ایک عضو کو دیکھنے لگا، اس کا مُنہ سلیمانؑ کی انگوٹھی کی طرح تھا، کالے کالے بال جیسے عاشق کے اوپر ہجر کی رات، پیشانی رمضان کی عید کا چاند، آنکھیں جیسے غزالوں کی آنکھیں، ناک سُتواں اور چمک دار، دونوں رخسار شقائق النعمان، دونوں ہونٹ مرجان، دانت موتی کی لڑی، گلا بید کی شاخ کے اوپر چاندی کا ڈلا، رانیں موٹے موٹے مرمر کے ستونوں کی طرح، جیسے شتر مرغ کے پروں سے بھرے ہوئے دو تکیے۔ یہ لڑکی بید کی شاخوں اور خیزراں کی چھڑیوں سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ لڑکیاں خوش فعلیاں کرتی رہیں اور حسن برابر کھڑا انھیں دیکھتا رہا وہ کھانا پینا تک بھول گیا تھا یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا اور اس لڑکی نے اپنی ہم جولیوں سے کہا کہ ای شہزادیو! رات ہونے کو آئی ہمارا ملک دور ہے اور ہم یہاں بیٹھے بیٹھے تھک بھی گئے ہیں۔ چلو اب ہم گھر چلیں۔ سب نے اُٹھ کر پروں کی پوشاک پہن لی اور پہلے کی طرح چڑیاں بن کر ایک ساتھ اُڑ گئیں، آس پاس دوسری تھیں اور بیچ میں وہ لڑکی۔ جب حسن ان سے ناامید ہو گیا تو اس نے چاہا کہ اُٹھ کر نیچے اُترے لیکن اس میں اُٹھنے تک کی سکت نہ تھی آنسو اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ بہرحال حسن آہستہ آہستہ

چلنے لگا اور آلٹا سیدھا چلتے چلتے محل کے نیچے اُترا اور بڑی مشکل سے کوٹھری کے دروازے تک پہنچا اور اندر جا کر اُسے بند کر لیا اور بیمار ہو کر لیٹ گیا، نہ کھاتا نہ پیتا بلکہ فکر میں ڈوبا رہتا۔ پھر وہ رونے پیٹنے لگا اور رات بھر روتا پیٹتا رہا۔ جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اسی جگہ پہنچا جہاں وہ کل گیا تھا اور اسی منظر کے سامنے رات تک بیٹھا رہا لیکن کوئی چڑیا نہ آئی۔ وہ زار زار رونے لگا یہاں تک کہ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو گھسٹتا ہوا محل کے نیچے اُترا، رات ہو گئی تھی اور ہر چیز اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ وہ رات بھر برابر روتا اور آہ وزاری کرتا رہا یہاں تک کہ سویرا ہو گیا۔ ٹیلوں پر اور گھاٹیوں میں دھوپ نکل آئی۔ وہ نہ کھاتا نہ پیتا نہ سوتا نہ اسے چین آتا بلکہ دن بھر پریشان رہتا اور رات بھر بیدار، مغموم اور بے چین، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔

سات سو اٹھاسیویں رات

جب سات سو اٹھاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! جب حسن سنار کا عشق بہت زیادہ بڑھ گیا تو وہ برابر اشعار پڑھا کرتا اور چونکہ وہ محل میں اکیلا تھا اس کا دل ہرگز نہ بہلتا۔ وہ اسی پریشانی میں تھا کہ اسے جنگل کی طرف سے گرد اٹھتی دکھائی دی وہ نیچے آکر چھپ گیا اور اسے یقین ہوا کہ محل والے آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لشکر اُتر کر محل کے آس پاس پھیل گیا اور ساتوں لڑکیاں اُتر کر محل کے اندر آئیں اور اپنے ہتھیار اور جنگی لباس اُتار ڈالے لیکن چھوٹی لڑکی نے اپنی جنگی وردی نہ اُتاری بلکہ اسی طرح حسن کے کمرے میں گئی اُسے وہاں نہ پایا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے ایک دوسری کوٹھری میں دیکھا۔

وہ کمزور اور دُبلا نظر آتا تھا، اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا، ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں رنگ زرد پڑ گیا تھا، آنکھیں دھنس گئی تھیں، لڑکی سے اسے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا اور آنسو جاری تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر بڑی بہن گھبرا گئی، اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہے، بھائی! کہہ تو سہی تاکہ میں تیرا علاج کروں اور تجھ پر فدا ہو جاؤں۔ اس کے جواب میں حسن بلک بلک کر رونے لگا۔

حیران ہو کر اس کی بہن بولی، بھائی، تو اس مصیبت میں کب سے گرفتار ہے اور یہ بلا تجھ پر کب سے نازل ہوئی؟ کیوں کہ میں دیکھتی ہوں کہ تو اشعار پڑھتا ہے اور تیرے آنسو برابر جاری ہیں۔ بھائی! تجھے خُدا کی قسم اور اس محبت کا واسطہ جو ہمارے درمیان میں ہے اپنا حال کہہ اور اپنے بھید سے مجھے مطلع کر اور مجھ سے کچھ نہ چھپا جو میری غیر موجودگی میں تجھ پر گزُرا ہے کیوں کہ تیری وجہ سے میں پریشان ہوں اور میری زندگی دوُبھر ہوگئی ہے۔ یہ سُن کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، اس کے آنسو اور زیادہ بہنے لگے اور اس نے کہا کہ بہن، میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں تجھ سے کہوں گا تو تو میرے مقصد کے حاصل کرنے میں میری مدد نہ کرے گی اور مجھے چھوڑ دے گی اور میں اپنے غم سے مر جاؤں گا۔ اس نے کہا کہ بھائی، میں تجھے ہرگز نہ چھوڑوں گی خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔ یہ سُن کر اس نے سارا ماجرا اور دروازہ کھولنے کے بعد جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا اور کہا کہ تمام مصیبت اور بلا اُس لڑکی کی محبت اور عشق کی وجہ سے پیش آئی ہے جسے میں نے دیکھا ہے اور یہ کہ دس دن سے میں نے نہ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ یہ کہہ کر اس کی ہچکی لگ گئی۔ اسے اس طرح بے تحاشا روتا دیکھ کر اس کی بہن بھی رو پڑی اور اس کی حالت پر غمگین ہوگئی اور اس کی غربت پر اُسے ترس آنے لگا۔ اس نے کہا کہ بھائی، خوش ہو اور غم مت کر کیوں کہ تیرے مقصد کے حاصل

ہونے میں میں دل و جان سے کوشش کروں گی اور اپنی جان لڑا دوں گی اور کوئی نہ کوئی ترکیب ڈھونڈ نکالوں گی خواہ اس میں میری جان اور میرا مال ہی کیوں نہ صرف ہو جائے انشاءاللہ۔ لیکن بھائی، میرا مشورہ مان، میری بہنوں پر یہ راز نہ کھلنے پائے۔ اگر تو نے ان میں سے کسی سے بھی کہا تو میری اور تیری دونوں کی جان جائے گی۔ اگر وہ تجھ سے پوچھیں کہ تو نے دروازہ کھولا ہے تو کہیو بالکل نہیں، میں محض اس وجہ سے پریشان خاطر ہوں کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں اور میں محل میں اکیلا بیٹھا تمھارا انتظار کر رہا تھا۔

حسن نے کہا یہ بہت ٹھیک ہے اور اس کے سر کو بوسہ دیا وہ خوش ہو گیا اور اس کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اب تک تو وہ اپنی بہن سے ڈر رہا تھا کہ اس نے دروازہ کیوں کھولا اور مارے ڈر کے مرا جا رہا تھا لیکن اب اس کی جان میں جان آ گئی اور اس نے اپنی بہن سے کھانا مانگا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر غمگین اور روتی ہوئی اپنی بہنوں کے پاس گئی۔ انھوں نے اس کی خیریت پوچھی اور اس نے جواب دیا کہ میں اپنے بھائی کی وجہ سے سخت پریشان ہوں کیوں کہ وہ بیمار ہے اور دس دن سے اس کے پیٹ میں کوئی دانہ نہیں اترا۔ انھوں نے اس کی بیماری کا سبب پوچھا، اس نے کہا کہ سبب یہی ہے کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے اور ہماری غیر موجودگی کے دن اس پر ہزار سال سے بھی زیادہ سخت گزرے۔ اس میں اس کی کوئی خطا نہیں کیوں کہ وہ پردیسی ہے اور اکیلا، اور ہم اسے تنہا چھوڑ کر چل دیے اور اس کے پاس کوئی نہ تھا جو اس کا دل بہلاتا اور اسے گھبرانے نہ دیتا۔ بہرحال وہ ابھی کم سن جوان ہے اور جب کبھی وہ اپنے خاندان والوں اور خاص کر اپنی بوڑھی ماں کی یاد کرتا ہے تو اسے خیال ہوتا کہ وہ دن رات رو رو کر گزارتی اور غمگین رہتی ہوگی اور محض ہماری صحبت سے اسے ذرا ڈھارس سی بندھی رہتی ہے۔ اس کی یہ باتیں سن کر

اُس کی بہنیں بھی رونے لگیں اور انھیں اس پر بڑا ترس آیا اور وہ کہنے لگیں کہ واللہ
وہ معذور ہے۔ اب لشکر کو رخصت کر کے وہ حسن کے پاس گئیں اور اسے سلام کیا
اور دیکھا کہ اس کی خوب صورتی ماند پڑ گئی ہے، رنگ زرد ہو گیا ہے اور جسم گھُل گیا ہے
اُن کا دل بھر آیا، اُس کے پاس بیٹھ کر باتوں سے اس کی پریشانی دور کرنے اور اس
کا دل بہلانے لگیں اور اس سے وہ تمام عجیب و غریب باتیں بیان کیں جو انھوں
نے دیکھی تھیں اور دُلھا اور دُلہن میں پیش آئی تھیں۔ اسی طرح پورے ایک
مہینے تک وہ اس کی دل جوئی کرتی رہیں مگر اس کا مرض روز بہ روز بڑھتا گیا۔
جب کبھی وہ اُسے اس حالت میں دیکھتیں تو آنسو بہائے بغیر نہ رہتیں اور چھوٹی
لڑکی سب سے زیادہ روتی۔ مہینہ گزر نے کے بعد لڑکیوں کا جی سیر و شکار کے لیے
چاہنے لگا اور جب انھوں نے پکا ارادہ کر لیا تو اپنی چھوٹی بہن سے کہا کہ تو بھی
ہمارے ساتھ سوار ہو کر چل۔ لیکن اس نے کہا کہ بہنو! واللہ جب تک میرا بھائی
اچھا نہ ہو جائے اور اس کی بیماری جاتی نہ رہے میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر
تمھارے ساتھ نہیں چل سکتی بلکہ اس کے پاس ٹھیر کر اس کا دل بہلانا چاہتی ہوں۔
یہ سُن کر انھوں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ بڑی با مروّت ہے اور کہا کہ جو بھلائی
بھی تو اس پردیسی کے ساتھ کرے گی تجھے اس کا اجر ملے گا۔ یہ کہ کر انھوں نے بہن
کو اسی کے پاس رہنے دیا اور بیس دن کا توشہ لے کر سوار ہو گئیں، اور شہرزاد کو
صبح ہوتی ۔۔۔۔۔۔

سات سو نواسیویں رات

جب سات سو نواسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ!

لڑکیاں اپنی چھوٹی بہن کو محل میں حسن کے پاس چھوڑ کر سیر و شکار کے لیے سوار ہو گئیں۔ جب وہ محل سے دور ہو گئیں اور اُن کی بہن کو یقین ہو گیا کہ اب وہ دور نکل گئی ہیں تو اس نے اپنے بھائی کے پاس آکر کہا کہ بھائی! اُٹھ کر مجھے وہ جگہ دکھا جہاں تو نے لڑکیوں کو دیکھا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ بسر و چشم، بسم اللہ اور وہ اس کی باتیں سُن کر خوش ہوا اور اسے یقین آ گیا کہ اب میری مُراد بر آئے گی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اُٹھ کر اُسے وہ جگہ دکھائے لیکن اس میں چلنے کی بالکل سکت نہ تھی اس لیے اسے لڑکی اپنی گود میں اٹھا کر لے گئی اور زینے کا دروازہ کھول کر محل کے اوپر چڑھ گئی۔ اوپر پہنچ کر حسن نے وہ مقام اور بیٹھک اور پانی کا حوض دکھایا جہاں اس نے لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ اس کی بہن نے کہا کہ بھائی، اب یہ بتا کہ وہ کس طرح سے آئی تھیں۔

حسن نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا خاص کر اس لڑکی کے متعلق جس پر وہ عاشق ہو گیا تھا۔ اس کی تعریف سُن کر لڑکی سمجھ گئی کہ وہ کون ہے اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور حالت دگرگوں ہو گئی۔ اس نے کہا کہ بہن، تیرا چہرہ کیوں اُتر گیا اور تیری حالت ابتر کیوں ہو گئی۔ وہ بولی کہ بھائی، سُن۔ یہ لڑکی جنوں کے بادشاہوں میں سے ایک عظیم الشان بادشاہ کی بیٹی ہے جس کی حکومت انسانوں اور جنوں اور جادوگروں اور کاہنوں اور قبیلوں اور اقلیموں اور مُلکوں اور بہت سے جزیروں پر ہے اور جس کے پاس بہت مال و دولت اور لشکر ہے۔ ہمارا باپ بھی اسی کے نوابوں میں سے ایک نواب ہے۔ اس کے پاس اتنی زیادہ فوجیں اور اتنا بڑا ملک اور اتنی زیادہ دولت ہے کہ کسی کا بس اس پر نہیں چلتا۔ اس نے اپنی اولاد کے لیے جو وہی لڑکیاں ہیں جنھیں تو نے دیکھا ہے ملک کا اتنا بڑا حصہ الگ کر دیا ہے جس کی لمبائی چوڑائی سال سال بھر کے راستے کی ہے اور جس کے اِرد گرد ایک بڑا سمندر ہے، وہاں تک کسی کی پہنچ نہیں نہ انسان کی نہ جن کی۔ اس کے پاس پچیس[۲۵۰۰۰] ہزار لڑکیوں کا ایک لشکر ہے

جو شمشیر زن اور نیزہ باز ہیں اور جن میں سے ہر ایک ایسی ہے کہ جب وہ ہتھیار باندھ کر
گھوڑے پر سوار ہوتی ہے تو ہزار بہادر سواروں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کی سات
بیٹیاں ہیں جو بہادری اور شہ سواری میں دوسری لڑکیوں سے کم نہیں بلکہ زیادہ
ہیں۔ اس نے اپنے ملک کے اس حصّے کی حکومت اپنی بڑی بیٹی کو دے رکھی ہے جو
ساتوں میں بڑی ہے اور اتنی بہادر اور شہسوار اور مکّار اور سیاست داں اور جادوگر
ہے کہ اس کے ملک کے تمام لوگ بھی اسے زیر نہیں کر سکتے، اور جو لڑکیاں اس کے
ساتھ تھیں وہ اس کی درباری اور سردار اور مصاحب ہیں۔ جن پروں کی کھالوں کو
وہ پہن کر اڑتی ہیں وہ جن جادوگروں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ اس
لڑکی کو اپنے بس میں لا کر اس سے شادی کرے تو یہاں ٹھہر کر اس کا انتظار کر کیوں کہ
وہ ہر چاند رات کو یہاں آتی ہے۔ جب ان لڑکیوں کو تو دوبارہ دیکھے تو چھپ جائیو
اس طرح سے کہ وہ تجھے ہرگز نہ دیکھ سکیں ورنہ ہم سب کی جان جائے گی۔ میری بات
پلّے باندھ اور اسے اچھی طرح یاد کر لے۔ ان کے قریب کسی ایسی جگہ بیٹھ کر انتظار کر
کہ وہ تیری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ جب وہ اپنے کپڑے اتار ڈالیں تو اس لڑکی
کے کپڑوں پر نگاہیں جمائے رہیو جو سب سے بڑی ہے اور جسے تو چاہتا ہے اور آنکھ
بچا کر انھیں اٹھا لیجیو مگر اور کسی کے نہ اٹھائیو کیونکہ وہ اپنے ہی کپڑے پہن کر
اپنے وطن جا سکتی ہیں۔ اگر یہ کپڑے تیرے قبضے میں آ گئے تو لڑکی بھی تیرے قبضے میں
آ جائے گی۔ لیکن خبردار اس کی [illegible] میں نہ آئیو جب وہ کہے گی کہ او ظالم،
جس نے میرے کپڑے چرائے ہیں، مجھے واپس کر دے اور میں تیرے پاس تیری
ہو کر رہوں گی۔ اگر تو نے اسے کپڑے دے دیے تو وہ تجھے مار ڈالے گی اور ہمارا محل غارت
کر دے گی اور ہمارے باپ کو قتل کر دے گی۔ بس سمجھ لے کہ تیری کیا گت بنے گی۔
جب اس کی بہنیں دیکھیں گی کہ اس کے کپڑے چوری گئے تو وہ اسے اکیلا چھوڑ [illegible]۔

اُڑ جائیں گی۔ اُس وقت تو اُس کے پاس جائیو اور اُس کے بال پکڑ کر کھینچیو۔ جب تو اس طرح اُسے کھینچے گا تو اُس کے جادو کا زور ٹوٹ جائے گا اور وہ تیرے بس میں آجائے گی۔ اس کے بعد پروں والا لباس حفاظت سے رکھیو۔ جب تک وہ تیرے قبضے میں رہے گا وہ بھی تیری قید میں رہے گی کیوں کہ بغیر اس لباس کے اپنے ملک کو اُڑ کر نہیں جا سکتی۔ جب تو لڑکی کو پکڑ لے تو اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جائیو لیکن اس سے یہ نہ کہیو کہ تو نے اس کے کپڑے لیے ہیں۔

اپنی بہن کی باتیں سُن کر حسن کو اطمینان ہوا اور ڈر جاتا رہا اور رنج و غم دور ہو گیا اور اس نے اٹھ کر اپنی بہن کا سر چوما اور دونوں محل پر سے اُتر کر اپنی اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے۔ حسن رات بھر اپنے دل پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ جب سویرا ہوا تو وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر اوپر چڑھ گیا اور بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ جب بیٹھے بیٹھے عشا کا وقت ہو گیا تو اُس کی بہن اس کے لیے کچھ کھانا پینا لائی اور اس کے کپڑے بدلے اور وہ سو گیا۔ ہر روز اس کا یہی دستور تھا، یہاں تک کہ چاند نکلا اور چاند دیکھتے ہی وہ ان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ لڑکیاں بجلی کی طرح آ پہنچیں اور انھیں دیکھتے ہی وہ ایسی جگہ جا کر چھپ گیا جہاں سے وہ انھیں دیکھ سکے مگر وہ اسے نہ دیکھ سکیں۔ اب چڑیاں اُتریں اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ بیٹھ گئی۔ انھوں نے اپنے اپنے کپڑے اُتار ڈالے اور اسی طرح اس لڑکی نے بھی جسے وہ چاہتا تھا اور اپنی بہنوں کے ساتھ حوض میں اُتر گئی۔ اب حسن اٹھا اور چپکے چپکے آہستہ آہستہ بڑھا۔ خدا نے اس کی پردہ پوشی کی اور اس نے کپڑے اٹھا لیے۔ کسی ایک لڑکی کی بھی نظر اس پر نہ پڑی بلکہ وہ آپس میں کھیلتی اور چہلیں کرتی رہیں۔ جب وہ فارغ ہوئیں تو باہر آئیں اور ہر ایک نے اپنا اپنا پروں کا لباس پہن لیا۔ اس کی محبوبہ بھی اپنا چولا پہننے آئی لیکن اسے نہ پایا، وہ چیخنے چلانے اور

اپنا مُنہ پیٹنے لگی اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کی بہنوں نے آکر پوچھا تو اس نے کہا کہ میرے پروں کا لباس کوئی اٹھالے گیا ہے۔ یہ سُن کر وہ بھی رونے پیٹنے اور مُنہ پر طمانچے مارنے لگیں۔ جب رات ہوئی تو وہ اس کے ساتھ ٹھیر نہ سکتی تھیں اس لیے انھوں نے اسے محل کے اوپر چھوڑ دیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سونویں رات

سات سونویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! لڑکی کی بہنیں اُسے اکیلا چھوڑ کر اُڑ گئیں۔ جب حسن نے دیکھا کہ وہ اُڑ گئیں اب نظر نہیں آتیں اور لڑکی اکیلی رہ گئی تو اس نے اسے یہ کہتے سُنا کہ اے وہ شخص جو میرے کپڑے لے گیا ہے اور مجھے ننگا کر گیا ہے، میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرا چولا مجھے واپس دے دے اور میرے بدن کو چھپا، خدا تجھے وہ حسرت نہ دے جو اس نے مجھے دی ہے! جب حسن نے اس کی یہ باتیں سُنیں تو اس کی محبت کے مارے اس کی عقل جاتی رہی اور اس کا عشق دوبالا ہو گیا اور اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا، جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچا اور اسے لے کر محل کے نیچے اُترا اور اپنے کمرے میں لے جاکر اپنی عبا اس کے اوپر ڈال دی۔ وہ روتی جاتی اور دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹتی جاتی تھی۔ حسن اسے بند کر کے اپنی بہن کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ میرے ہاتھ آگئی ہے میں کامیاب ہو گیا ہوں اسے اپنے کمرے میں لے آیا ہوں اور اس وقت وہ میرے کمرے میں بیٹھی دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹ رہی ہے۔ یہ سُن کر اس کی بہن اٹھی اور جاکر کمرے کے اندر داخل ہوئی اور دیکھا کہ وہ غم زدہ بیٹھی رو رہی ہے۔ اس کے آگے زمین چوم کر اسے سلام کیا۔ لڑکی نے کہا کہ اے

شہزادی، کیا تم جیسے لوگ شہزادیوں کے ساتھ ایسی ناشائستہ حرکت کرتے ہیں؟ تجھے معلوم ہو کہ میرا باپ ایک بہت بڑا بادشاہ ہو اور تمام جن بادشاہ اس سے ڈرتے ہیں اور اس کا لوہا مانتے ہیں۔ اس کے پاس اتنے جادوگر اور حکیم اور کاہن اور شیطان اور دیو ہیں کہ کسی کا زور اس کے اوپر نہیں چلتا۔ اس کے ماتحت اتنی مخلوقات ہو کہ جن کی گنتی سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ ای شہزادی! یہ تمھارے لیے کہاں تک زیبا ہو کہ تم انسانوں کو اپنے یہاں پناہ دو اور ان سے اپنا اور ہمارا حال کہہ دو، ورنہ یہ انسان یہاں آیا کیسے؟ حسن کی بہن بولی کہ ای شہزادی، یہ انسان مروّت کا پکا ہو اور وہ کوئی بُرا کام نہیں چاہتا، اسے تجھ سے محبت ہوگئی ہو اور عورتیں تو مردوں ہی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر وہ تجھ پر عاشق نہ ہوتا تو تیری وجہ سے وہ بیمار نہ پڑتا اور تیری محبت میں اس کی جان نہ جاتی۔ غرض کہ اس نے وہ تمام باتیں اس سے کہہ دیں جو حسن نے اپنے عشق کے بارے میں اس سے کہی تھیں کہ لڑکیاں کس طرح اُڑتی ہوئی آئیں اور نہائیں اور اسے اُن میں سے سوائے تیرے کوئی پسند نہ آئی۔ کیوں کہ وہ سب تیری کنیزیں تھیں، تو انھیں حوض میں ڈبکیاں دیتی تھی لیکن ان کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنا ہاتھ تیری طرف بڑھائیں۔

یہ باتیں سُن کر اُسے رہائی کی اُمید بالکل جاتی رہی۔ اب حسن کی بہن اٹھی اور جاکر اس کے لیے ایک نفیس پوشاک لائی اور اسے پہنا کر اس کے لیے کھانا پینا لائی اور دونوں نے بیٹھ کر کھایا اور لڑکی کے دل کو اطمینان ہوا اور اس کا ڈر جاتا رہا۔ حسن کی بہن برابر نرمی سے باتیں کرتی جاتی اور کہتی کہ رحم کرکے اسے ایک نظر دیکھ لے، کیوں کہ وہ تیری محبت کا مارا ہو۔ وہ اسے ڈھارس دیتی اور راضی کرتی اور اچھی اچھی باتیں کرتی لیکن لڑکی برابر روئے جاتی۔ جب سویرا ہوا تو اسے ذرا تسکین ہوئی اس نے رونا بند کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ پھنس گئی ہو چھٹکارا ناممکن ہو اور

وہ حسن کی بہن سے کہنے لگی کہ اے شہزادی، اگر میری قسمت میں یہی بدا ہے کہ میں پردیس میں رہوں اور اپنے وطن اور خاندان والوں اور بہنوں کو چھوڑ دوں تو خدا کے حکم پر صبر ہی کرنا بہتر ہے۔ اب حسن کی بہن نے اس کے لیے ایک کمرہ خالی کر دیا جس سے زیادہ خوب صورت محل میں نہ تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر برابر اس کی دل داری کرتی اس کا غم غلط کرتی، یہاں تک کہ وہ مان گئی۔ اسے اطمینان ہو گیا اور وہ ہنسنے لگی اور جو رنج و غم اسے اپنے خاندان والوں اور وطن اور بہنوں اور ماں باپ اور ملک کی جدائی سے ہوا تھا جاتا رہا۔ اب حسن کی بہن اٹھ کر حسن کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ اس کے کمرے میں جا کر اس کے ہاتھ پانو چوم۔ حسن نے جا کر ایسا ہی کیا اور اس کے بعد اس کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا کہ اے حسینوں کی سرتاج اور روحوں کی جان اور دیکھنے والوں کی مسرت، اطمینان رکھ میں نے تجھے محض اس واسطے لیا ہے کہ قیامت تک میں تیرا غلام بن کر رہوں اور یہ میری بہن تیری لونڈی۔ اے میری روح رواں، میرا ارادہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا اور رسول کے طریقے کے موافق میں تجھ سے نکاح کر لوں اور اپنے وطن جا کر ہم دونوں بغداد میں رہیں اور میں تیرے لیے غلام اور باندیاں خرید دوں۔ میری ماں جو بہت نیک عورت ہے تیری خدمت کرے گی۔ ہمارا ملک دنیا میں سب سے اچھا ہے اور جو کچھ اس میں ہے کسی اور ملک میں نہیں اور وہاں کے لوگ اچھے اور خوب صورت ہوتے ہیں۔

وہ اس قسم کی باتیں کر کے اس کا دل بہلانا چاہتا تھا اور وہ اس سے بات تک نہ کرتی تھی کہ کسی نے محل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حسن نکل کر باہر گیا اور دیکھا کہ لڑکیاں سیر و شکار سے آگئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر وہ خوش ہو گیا اور خوش آمدید کہہ کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے اسے اور اس نے انھیں سلامتی اور خیر و عافیت

کی دُعا دی۔ اس کے بعد وہ گھوڑوں پر سے اُتر کر محل کے اندر آئیں اور اپنے اپنے
کمروں میں داخل ہو گئیں اور میلے کچیلے کپڑے اُتار کر خوب صورت پوشاکیں پہنیں
اور ہرن، نیل گائیں، خرگوش، شیر اور بجو وغیرہ جو جو شکار مار کر لائی تھیں ان میں
سے ایک حصّہ ذبح کرنے کے لیے دے دیا اور باقی کو اپنے پاس محل میں رہنے دیا۔
حسن کمر کسے چھری ہاتھ میں لیے ذبح کرتا جاتا تھا اور وہ کھیل کود رہی اور خوش
ہو رہی تھیں۔ اس سے فارغ ہو کر وہ کھانا پکانے میں لگ گئیں۔ حسن نے
بڑھ کر بڑی لڑکی کے سر کو بوسہ دیا، اسی طرح وہ ایک ایک کر کے سب کا سر
چومتا اور وہ کہتیں کہ بھائی، تو ہمارے ساتھ بہت انکسار کرتا ہو اور ہمیں
تعجّب ہوتا ہو کہ تجھے ہم سے اتنی محبّت کیوں ہو؟ بھائی، تجھے ایسا ہرگز نہ چاہیے
بلکہ یہ عاجزی تو ہمیں کرنی چاہیے، کیوں کہ تو انسان ہو اور انسان ہم سے برتر
ہو کیوں کہ ہم جن ہیں۔ یہ سُن کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ زور زور سے
رونے لگا۔ انھوں نے پوچھا کہ خیر تو ہو تو کیوں روتا ہو؟ تیرے رونے سے
ہماری خوشی مٹّی میں مل جاتی ہو۔ غالباً تو اپنی ماں اور وطن کی تمنّا رکھتا ہو۔ اگر
ایسا ہو تو ہم ابھی تیار ہو کر تجھے تیرے وطن دوستوں کے پاس پہنچائے آتے
ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں تم سے جُدا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بولیں کہ ہم
میں سے کس نے تجھے پریشان کر رکھا ہو کہ تو اتنا غمگین ہو؟ حسن کو جواب
میں یہ کہتے شرم معلوم ہوئی کہ مجھے اس لڑکی کی محبّت نے پریشان کر رکھا ہو۔
کیوں کہ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ یہ سوچ کر وہ چُپ ہو گیا اور
اپنی حالت ان پر بالکل ظاہر نہ کی۔ اب اس کی بہن اٹھی اور کہنے لگی کہ اس
نے ایک اُڑتی ہوئی چڑیا پکڑی ہو اور چاہتا ہو کہ تم اس چڑیا کے سدھانے
میں اس کی مدد کرو۔ سب نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ہم سب

تیری خدمت کے لیے حاضر ہیں اور تیرا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن اپنا ماجرا تو بیان کر اور اپنی حالت ہم سے بالکل مت چھپا۔ اس نے اپنی بہن سے کہا کہ میرا قصہ انھیں سنا دے کیوں کہ میں ان سے شرماتا ہوں اور ان کے آگے ایسی باتیں بیان نہیں کر سکتا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

سات سو اکیانویں رات

جب سات سو اکیانویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! حسن نے اپنی بہن سے کہا کہ تو ہی سنا دے کیوں کہ میں اُن کے آگے ایسی باتیں کرتا شرماتا ہوں۔ اس کی بہن بولی کہ بہنو! جب ہم اس بے چارے کو یہاں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے تو وہ محل کے اندر گھبرانے لگا اور اسے ڈر لگا کہ کہیں کوئی گھس نہ آئے۔ تمھیں معلوم ہے کہ انسانوں کی عقل کم ہوتی ہے اس لیے جب وہ اکیلا بیٹھے بیٹھے گھبرایا تو اس دروازے کو کھول کر جو اوپر کی طرف جاتا ہے چھت پر چڑھ گیا اور وہاں بیٹھ کر گھاٹی کی سیر کرنے لگا لیکن دروازے کی طرف برابر دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی محل میں نہ گھس آئے۔ ایک دن وہ بیٹھا ہی ہوا تھا کہ دس چڑیاں محل میں اتریں اور پھرتے پھرتے حوض پر آ بیٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ ان میں سے ایک چڑیا ان سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور وہ ان سب کے چونچیں مارتی ہے لیکن کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اسے ٹھونگ تک لگائے۔ اس کے بعد وہ اپنے پنجے کرسیاں کے پاس لے گئیں اور پروں کے لباس کو کھول کر اُس میں سے نکل آئیں اور ہر ایک ان میں سے ایک ایسی لڑکی بن گئی جیسے چودھویں رات کا پورا چاند۔ حسن اُن کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ کپڑے اُتار کر پانی کے اندر گھس گئیں اور کھیلنے کودنے لگیں۔ بڑی لڑکی انھیں غوطے دیتی مگر

کوئی اُسے ہاتھ نہ لگا سکتی۔ اس کا چہرہ ان سب سے زیادہ خوب صورت تھا اور جسم
سب سے زیادہ سڈول اور پوشاک سب سے زیادہ صاف ستھری۔ حسن کھڑا ہوا
انھیں اس حالت میں برابر دیکھتا رہا کہ عصر کا وقت ہو گیا اور انھوں نے حوض میں
سے نکل کر اپنے کپڑے پہنے اور پروں کا لباس پہن کر ایک ساتھ اُڑ گئیں۔ بڑی لڑکی
کی وجہ سے اس کے دل میں ایک آگ بھڑک اٹھی اور اسے افسوس ہوا کہ اس
نے اس کا پروں کا لباس کیوں نہیں چرا لیا۔ اس پر وہ بیمار پڑ گیا اور محل کے اوپر
بیٹھے بیٹھے ان کا انتظار کرنے لگا اور کھانا پینا بند اور سونا سوگند ہو گیا۔ چاند رات
تک اس کی یہی حالت رہی کہ موافق دستور کے وہ پھر آئیں اور اپنے کپڑے اُتار کر
حوض میں چلی گئیں۔ اب اس نے بڑی لڑکی کا چولا چرا لیا اور جب اسے معلوم ہوا
کہ وہ بغیر ان کے نہیں اُڑ سکتی تو اسے لے کر چھپا دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں خبر
ہو جائے اور وہ مجھے مار ڈالیں۔ جب باقی چڑیاں اُڑ گئیں تو وہ نکلا اور لڑکی کو
پکڑ کر محل پر سے نیچے لے آیا۔

اس کی بہنوں نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے پاس
فلاں کمرے میں۔ انھوں نے کہا کہ بہن، ذرا اس کی تعریف تو بیان کر۔ وہ بولی کہ وہ
چودھویں رات کے چاند سے زیادہ حسین ہے اور اس کا چہرہ سورج سے زیادہ
چمک دار ہے، اس کا لعاب شہد سے زیادہ میٹھا ہے، اس کا قد بید سے زیادہ لچک دار
ہے، اس کی آنکھیں کالی کالی ہیں اور چہرہ آب دار اور پیشانی چمک دار اور سینہ جیسے
جوہر اور دونوں پستانیں جیسے انار، اور دونوں رخسار جیسے سیب، اس کے پیٹ
میں شکنیں پڑی ہوئی ہیں اور اس کی ناف ہاتھی دانت کا ڈبہ ہے جس میں مشک بھرا
ہوا ہو، اس کی پنڈلیاں ایسی ہیں جیسے مرمر کے دو کھمبے۔ سرمئی آنکھوں اور پتلی کمر
اور بھاری کولھوں اور میٹھی میٹھی باتوں سے وہ دلوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ تعریف

سُن کر لڑکیوں نے حسن کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ ہمیں لے چل اور دکھا۔ وہ گرتا پڑتا انھیں لے گیا اور اس کمرے کو کھولا جس میں شہزادی تھی اور آگے آگے اس میں داخل ہوا۔ جب ان کی نظر اس پر پڑی اور انھوں نے دیکھا کہ وہ کیسی حسین ہو تو وہ اس کے آگے زمین چومنے لگیں اور اس کی ظاہری اور باطنی خوب صورتی پر متعجب ہوئیں اور اسے سلام کرکے کہا کہ ای بڑے بادشاہ کی بیٹی! یہ عجیب بات ہو لیکن اگر تو اس انسان کی تعریف عورتوں سے سُنے تو عمر بھر تعجب کرے۔ وہ تجھ سے بے حد محبت کرتا ہو لیکن ای شاہ زادی، وہ کوئی بُری حرکت نہیں کرنا چاہتا بلکہ حلال طریقے سے تیرا طالب ہو۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑکیاں مردوں سے مستغنی ہیں تو ہم اسے باز رکھتے۔ بہ جائے اس کے کہ وہ تیرے پاس کوئی قاصد بھیجے وہ خود آیا ہو۔ اس نے ہم سے کہا ہو کہ اس نے پروں کا لباس جلا دیا ورنہ وہ ہم اس سے لے لیتے۔ اب ان میں سے ایک لڑکی شہزادی کی مرضی سے اس کی وکیل بن گئی اور اس کا نکاح حسن سے کرا دیا، حسن نے اس سے مصافحہ کیا اور انھوں نے شہزادیوں کی شان کے موافق جشن منایا۔ اب اسے اس سے اور زیادہ محبت ہو گئی اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سات سو بانویں رات

سات سو بانویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اعلاحضرت جب تخت کی رات ختم ہوئی اور صبح کو دُلہن دُلہا دونوں خوش خوش اٹھے تو حسن کی محبت پہلے سے دو بالا تھی۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی سے نکلا تو شہزادی کی تعریف میں اشعار پڑھتا ہوا۔ لڑکیاں خود دروازے ہی پر کھڑی تھیں اشعار سُن کر کہنے لگیں کہ ای شہزادی، سُنا کہ یہ انسان تیری تعریف کس طرح شعر میں کرتا ہو۔ شہزادی یہ سُن کر باغ باغ ہو گئی۔

حسن نے چالیس دن اس کے ساتھ بڑے مزے سے گزارے اور لڑکیاں روز اس کی دعوتیں کرتیں، اس کو نئے نئے تحفے دیتیں اور وہ ان کے درمیان بڑا خوش و خرم رہتا۔ شہزادی بھی ان کے ساتھ رہ کر اتنی خوش ہوئی کہ اپنے لوگوں کو بھول گئی۔

چالیس دن کے بعد حسن نے خواب میں اپنی ماں کو دیکھا کہ وہ اس کے لیے غم گین ہے، اس کی ہڈیاں نکل آئی ہیں اور بدن گھل گیا ہے اور حال سے بے حال ہو گئی ہے لیکن وہ خود بڑی اچھی حالت میں ہے۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر ماں نے کہا کہ اے حسن میرے بیٹے، تو دُنیا کے عیش میں پڑ کر مجھے کیوں بھول گیا؟ دیکھ تیرے پیچھے میرا کیا حال ہوا ہے۔ میں تجھے بھولی نہیں اور مرتے دم تک میری زبان تیرا ذکر نہ چھوڑے گی۔ میں نے گھر میں تیری قبر بنا رکھی ہے تاکہ تجھے کبھی نہ بھولوں۔ کاش میں اتنے دنوں زندہ رہوں کہ تجھے اپنے پاس دیکھ لوں اور ہم پہلے کی طرح مل جائیں! آنکھ کھلی تو آنسو اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ وہ بے حد غم گین تھا، ماں کی یاد اسے تڑپا رہی تھی۔ لاکھ کروٹیں بدلیں پھر نیند نہ آئی۔ جب سویرا ہوا تو لڑکیاں دستور کے موافق اس کے پاس آئیں اور اسے صباح بہ خیر کہا اور حسب معمول اس سے مذاق کرنے لگیں لیکن وہ ان کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوا۔ انھوں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی حالت پوچھ۔ وہ اس کے پاس گئی اور کہا کہ اے میرے شوہر، خیریت تو ہے؟ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر اس سے اپنا خواب بیان کر دیا۔ بیوی نے ان سے وہ باتیں کہ دیں جو اس نے کہی تھیں۔ یہ سُن کر لڑکیوں کو اس کے حال پر ترس آگیا اور انھوں نے کہا کہ بسم اللہ چل، ہم تجھے ماں کی زیارت سے روک نہیں سکتے بلکہ جس طرح ہم سے ہو سکے گا تیری مدد کریں گے تاکہ تو اپنی ماں سے ملے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تو ہم سے بھی ملتا رہے، خواہ سال میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو۔

بالکل ہم میں جُدائی نہ ہو جائے۔ اس نے کہا کہ سر آنکھوں پر۔ لڑکیوں نے فوراً اٹھ کر راہ کا توشہ اس کے لیے تیار کیا اور اس کی دُلہن کو گہنوں اور پوشاکوں اور ایسی ایسی بیش بہا چیزوں کا جہیز دیا جن کی تعریف نہیں ہو سکتی اور حسن کو ایسے ایسے تحفے تحائف دیے جنھیں لکھنے سے قلم عاجز ہے۔

اس کے بعد انھوں نے طبلہ بجایا اور ہر طرف سے اونٹنیاں آ پہنچیں۔ ان میں سے انھوں نے اتنی اونٹنیاں چُن لیں جو سارا جہیز لے جا سکیں۔ اب انھوں نے لڑکی اور حسن کو سوار کیا اور ان کے ساتھ پچیس تخت سونے کے اور پچاس چاندی کے کر دیے اور تین دن تک ان کے ساتھ گئیں اور تین مہینے کی راہ طے کی۔ اس کے بعد انھوں نے دونوں کو رخصت کر کے لوٹنے کا قصد کیا لیکن اس کی چھوٹی بہن اس کے گلے لپٹ کر اتنی روئی کہ اسے غش آ گیا۔ جب اسے پھر ہوش آیا تو وہ اس سے رخصت ہوئی اور اس سے تاکید کر دی کہ جب تجھے ماں سے مل کر تسلّی ہو جائے تو ہر چھٹے مہینے مجھ سے ملنے ضرور آئیو، اور اس سے یہ بھی کہا کہ جب تجھے کوئی خطرناک بات پیش آئے اور تجھے اس سے ڈر لگے تو مجوسی کا طبلہ بجائیو تو یہی اونٹنیاں حاضر ہو جائیں گی اور تو ان پر سوار ہو کر ہمارے پاس آ جائیو۔ حسن نے اس کی قسم کھالی اور انھیں قسم دی کہ وہ لوٹ جائیں۔ وہ اس سے رخصت ہو کر لوٹ گئیں لیکن اس کی جُدائی پر بے حد غمگین تھیں اور سب سے زیادہ غم اس کی چھوٹی بہن کو تھا، اسے بالکل قرار اور چین نہ آتا بلکہ وہ دن رات روتی رہتی۔

یہ تو لڑکیوں کا قصہ ہوا، اب حسن کا ماجرا سنو۔ وہ دن رات اپنی بیوی کے ساتھ جنگل اور بیابان اور گھاٹیاں اور پہاڑیاں طے کرتا صحیح و سلامت بصرے پہنچ گیا اور وہاں سے روانہ ہو کر اونٹنیوں کو اپنے گھر کے دروازے پر لا بٹھایا

اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس نے سنا کہ اس کی ماں زخمی دل سے آہستہ آہستہ رو رہی ہے۔ ماں کو روتے سن کر حسن بھی رونے پیٹنے لگا اور زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ ماں نے پوچھا کہ دروازے پر کون ہے؟ اس نے کہا کہ کھول تو سہی۔ ماں دروازہ کھول کر اسے دیکھنے لگی اور اسے پہچان کر بے ہوش ہوگئی۔ حسن اسے پیار کرنے لگا، یہاں تک کہ اُسے ہوش آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو گلے سے لگالیا اور ماں اسے بوسے دینے لگی۔ اس کے بعد حسن اپنا سارا ساز و سامان مکان کے اندر لانے لگا اور لڑکی کھڑی اُسے اور اس کی ماں کو دیکھتی رہی اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔۔۔۔۔۔۔

سات سو ترانویں رات

جب سات سو ترانویں رات ہوئی تو اُس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! حسن اور اس کی ماں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور ماں نے کہا کہ بیٹا! عجمی کے ساتھ تیری کیسی گزری؟ وہ بولا کہ اماں وہ عجمی تو مجوسی نکلا جو خدا کو چھوڑ کر آگ کی پرستش کرتا تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے اس کی ساری حرکتیں بیان کیں کہ اس نے مجھے لے جاکر اونٹ کی کھال میں بند کیا اور اسے سی دیا، چڑیاں مجھے وہاں سے اٹھالے گئیں اور پہاڑ کے اوپر جاکر اُتار دیا۔ پہاڑ پر میں نے بہت سے انسانوں کی لاشیں دیکھیں جن سے مجوسی اپنا مقصد پورا کرتا اور پھر انھیں وہیں پہاڑ پر پڑا رہنے دیتا۔ وہاں سے میں سمندر میں کود پڑا اور خدا نے مجھے صحیح وسلامت لڑکیوں کے محل تک پہنچا دیا اور ایک لڑکی نے مجھے بھائی بنالیا اور میں انھی لڑکیوں کے پاس رہ پڑا۔ اس کے بعد پھر وہ مجوسی وہاں پہنچا اور میں نے اُسے

قتل کر دیا۔ پھر مجھے اس لڑکی سے عشق ہو گیا اور ریش نے اسے پکڑ لیا اور پھر یہ واقعات پیش آئے یہاں تک کہ اب ہم پھر مل گئے ہیں۔

ماں اس کی سرگزشت سن کر حیران ہو گئی اور اس کی سلامتی پر خدا کا شکر بجالائی اور جا کر سامان دیکھا اور بیٹے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جب اس نے بتایا کہ ان میں کیا کیا ہے تو ماں بہت خوش ہوئی اور لڑکی کے پاس چلی تاکہ اس سے ملے۔ جوں ہی اس کی نظر لڑکی کے چہرے پر پڑی تو اس کا حسن دیکھ کر ہوش جاتے رہے نہال ہو گئی۔ اس کی آنکھ، ناک، قد و قامت بہت پسند آیا۔ اس نے کہا کہ بیٹا، خدا کا شکر ہے کہ تو خیریت سے رہا اور خیریت سے لوٹ آیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کے پاس جا بیٹھی اور پیار کی باتیں کر کے اس کا دل بہلانے لگی۔ دوسرے دن صبح کو وہ بازار جا کر دس جوڑے پوشاک کے خرید لائی جن سے بہتر شہر بھر میں نہ تھے اور قالینیں خریدیں اور لڑکی کو پوشاک پہنائی اور خوب صورت گہنوں سے اُسے آراستہ کیا۔ پھر وہ اپنے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ بیٹا! ہم لوگ اتنے مال و دولت کے ساتھ اس شہر میں نہیں رہ سکتے۔ ہم غریب ہیں لوگ ہم پر کیمیاگری کا الزام لگائیں گے۔ چل ہم چل کر دارالسلام بغداد میں رہیں جو خلافت کی جگہ ہے اور تو وہاں دکان میں بیٹھ کر خرید و فروخت کیجیو اور خدا سے ڈر کر رہیو، وہ اس مال میں تجھے برکت دے گا۔

حسن کو اپنی ماں کی رائے ٹھیک معلوم ہوئی اور وہ فوراً اس کے پاس سے اٹھا اور جا کر مکان کو فروخت کر دیا اور اونٹنیوں پر اپنا سارا مال متاع لادا اور اپنی ماں اور بیوی کو سوار کر کے چل دیا اور چلتے چلتے دجلے پر پہنچا اور ایک کشتی کو بغداد کے لیے کرائے پر لیا اور سارا مال اور سامان اس میں رکھ کر ماں اور بیوی کو اس میں بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ہوا موافق تھی۔ کشتی دس دن میں بغداد پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر سب بہت خوش ہوئے۔ جب کشتی شہر کے اندر داخل ہوئی تو وہ شہر

میں اُتر پڑے اور ایک سرائے میں ایک کوٹھری کرایے پر لی اور کشتی میں سے سارا سامان لاکر اس میں رکھ دیا، سرائے میں اُتر کر ایک رات آرام کیا۔ جب سویرا ہوا تو اُس نے اپنے کپڑے بدلے اور دلال نے اُسے دیکھ کر پوچھا کہ تجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ میں ایک مکان چاہتا ہوں جو خوب صورت اور بڑا ہو۔ دلال نے اسے تمام مکان دکھلائے جو اس کے پاس تھے اور حسن کو ان میں سے ایک گھر پسند آیا جو کسی وزیر کا تھا، اس نے اسے ایک لاکھ دینار میں خرید کر اُس کی قیمت ادا کردی۔ اس کے بعد وہ اس سرائے میں آیا جہاں اُترا تھا اور وہاں سے سارا مال اور سامان منتقل کردیا اور پھر بازار جاکر گھر کے لیے ضروری برتن اور فرش وغیرہ خریدا، غلام مول لیے، منجملہ ان کے اندر کے لیے ایک غلام بچہ۔ یہاں اس نے اطمینان سے اپنی بیوی کے ساتھ تین سال تک نہایت عیش وعشرت سے زندگی بسر کی اور بیوی سے اس کے دو لڑکے ہوئے جن میں سے ایک کا نام اس نے ناصر رکھا اور دوسرے کا منصور۔

اس مدت کے بعد اسے اپنی بہنوں کی یاد آئی اور یہ سوچ کر کہ ان کا کتنا احسان اُس پر ہے اور انھوں نے کس طرح اس کا مقصد حاصل کرنے میں اس کی مدد کی ہے وہ انھیں دیکھنے کا مشتاق ہوگیا اور شہر کے بازار میں جاکر اُن کے لیے کچھ گہنے اور عمدہ عمدہ کپڑے اور میوے خریدے جو انھوں نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے بلکہ انھیں جانتی تک نہ ہوں گی۔ ماں نے ان تحفوں کے خریدنے کا سبب پوچھا، اس نے کہا کہ میں اپنی بہنوں کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہوں جنھوں نے مجھ پر ہر طرح کا احسان کیا ہے اور جو روزی آج مجھے مل رہی ہے انھی کی عنایت اور احسان کی بہ دولت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں جاکر دیکھوں اور اگر خدا کو منظور ہے تو جلد لوٹ آؤں گا۔ ماں بولی کہ بیٹا، دیر نہ کیجیو۔ اس نے کہا کہ اماں، تجھے ایک بات جتانی چاہتا ہوں۔ سُن، جو صندوق زمین میں دفن ہے اس میں اس کا پروں کا لباس ہے، اسے حفاظت سے رکھیو تاکہ کہیں

ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اُسے پہن کر اُڑ جائے اور اپنے بیٹوں کو ساتھ لیتی جائے اور مجھے ان کا پتا نہ چلے اور میں ان کی وجہ سے مارے غم کے مر جاؤں۔ امّاں، خبردار اُس سے اِس کا ذِکر مت کیجیو اور سُن، وہ جنوں کے ایک بادشاہ کی بیٹی ہی، کوئی جن بادشاہ نہ اُس سے بڑا ہی اور نہ کسی کے پاس اس سے زیادہ لشکر اور مال و دولت ہی۔ اور سن، وہ اپنی قوم کی سردار ہی اور اپنے باپ کی سب سے زیادہ چہیتی۔ وہ بڑی خوددار ہی، اس کی خدمت خود اپنے ہاتھ سے کیجیو اور اسے نہ گھر سے نکلنے دیجیو اور نہ کھڑکی یا دیوار پر سے جھانکنے دیجیو کیوں کہ مجھے اس بات سے ڈر ہی کہ کہیں اسے ہوا نہ لگ جائے۔ اگر اس کا ذرا بال بیکا ہوا تو میں جان دے دوں گا۔ ماں نے کہا کہ بیٹا، خُدا نہ کرے کہ میں تیرے کہنے کے خلاف کروں۔ کیا میں پاگل ہو گئی ہوں کہ تیرا کہنا نہ مانوں۔ بیٹا، تو بے دھڑک سفر پر جا اور خُدا نے چاہا تو جب تو لوٹ کر آئے گا سب خیریت ہوگی اور تو اسے دیکھے گا اور وہ تجھ سے کہے گی کہ میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ لیکن بیٹا، آنے جانے سے زیادہ نہ ٹھیریو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

سات سو چورانویں رات

جب سات سو چورانویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! حسن نے چلتے وقت ماں سے بیوی کے بارے میں سارا دستورالعمل بتا دیا۔ خُدا کا کرنا کہ اس کی بیوی وہ تمام باتیں سُن رہی تھی جو اُس نے ماں سے کیں مگر ماں بیٹوں کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ اس کے بعد حسن اُٹھ کر روانہ ہو گیا اور شہر کے باہر پہنچ کر طبلہ بجایا اور اونٹنیاں آ پہنچیں۔ ان پر اس نے عراق کے تحفوں کے بیس گٹھے

لادے اور ماں اور بیوی بچوں سے رخصت ہوا۔ ایک لڑکے کی عمر ایک سال کی تھی اور دوسرے کی دو سال کی۔ اس کے بعد وہ پھر ماں کے پاس گیا اور اُسے دوبارہ وہی باتیں سمجھا کر سوار ہو گیا اور اپنی بہنوں کی طرف چل دیا اور دس روز تک دن رات گھاٹیوں اور پہاڑوں اور میدانوں اور پتھریلی زمین پر چلنے کے بعد گیارھویں روز محل میں پہنچ کر بہنوں سے ملا اور جو وہ لایا تھا انھیں پیش کیا۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دی۔ اس کی چھوٹی بہن نے محل کو اندر اور باہر سے آراستہ کیا، سوغاتیں لیں اور اسے پرانے دستور کے موافق ایک کمرے میں اُتارا اور اس کی ماں اور بیوی کی خیریت پوچھی۔ اُس نے کہا کہ بیوی سے میرے دو بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی چھوٹی بہن یہ دیکھ کر کہ وہ خوش اور بہ خیریت ہے بہت خوش ہوئی اور وہ اُن کے ساتھ تین مہینے تک دعوتیں کھاتا اور خوشیاں مناتا اور سیر و شکار میں مشغول رہا۔

یہ تو اس کا قصہ ہوا، اب اس کی ماں اور بیوی کی داستان سنو حسن کے چلے جانے کے بعد اس کی بیوی دو روز تو اس کی ماں کے ساتھ چُپ چاپ ٹھیری رہی لیکن تیسرے روز اس نے کہا کہ سبحان اللہ، میں تین سال سے اس کے ساتھ ہوں مگر آج تک حمام جانا نصیب نہیں ہوا اور رونے لگی۔ ماں کو اس کی حالت پر ترس آیا اور کہنے لگی کہ بیٹی، ہم لوگ اس جگہ پردیسی ہیں اور تیرا شوہر شہر کے باہر گیا ہوا ہے، اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو تیری خدمت کے لیے حاضر تھا۔ میرا تو حال یہ ہے کہ میں یہاں کسی کو بھی نہیں جانتی۔ بیٹی، میں پانی گرم کر کے تیرا سر یہیں گھر کے حمام میں دھلائے دیتی ہوں۔ وہ بولی اے میری آقا! اگر تو کسی باندی سے یہ بات کہتی تو وہ ہرگز تیرے پاس نہ ٹھیرتی بلکہ تجھے مجبور کر دیتی کہ تو اسے بازار لے جا کر بیچ ڈالے۔ اے میری آقا! مرد تو اپنی غیرت کی وجہ سے مجبور ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اگر عورت گھر سے باہر گئی تو

وہ ضرور عصمت فروشی کرے گی۔ لیکن ای میری آقا! تمام عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہو کہ اگر عورت کوئی کام کرنا چاہے تو کوئی اسے منع نہیں کر سکتا نہ روک سکتا نہ بچا سکتا ہو، نہ وہ حمام جانے سے رُک سکتی ہو نہ کسی اور کام سے بلکہ جو وہ چاہے کر گزرتی ہو۔ یہ کہہ کر وہ رونے اور اپنے آپ کو کوسنے اور اپنی غربت پر افسوس کرنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر ساس کو اس پر ترس آگیا، سمجھ گئی کہ وہ ٹھیک کہتی ہو اور اس نے حمام کی ضروری چیزیں تیار کیں اور بہو کو لے کر حمام گئی۔ جب وہ حمام میں داخل ہوئی اور کپڑے اُتارے تو تمام عورتیں اسے دیکھنے، خُدا کی پاکی بیان کرنے اور سوچنے لگیں کہ خدا نے یہ کیسی حسین صورت بنائی ہو! جو عورت بھی حمام کے پاس سے گزرتی اندر جا کر تماشا دیکھتی۔ اس طرح سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ عورتوں کے ٹھٹ لگ گئے، راستہ رُک گیا۔

اتفاق کی بات ہو کہ اُس روز امیر المومنین ہارون الرشید کی ایک کنیز بھی اُدھر سے گزری، جس کا نام تحفۃ العوادہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہزاروں آدمی کھڑے ہیں، حمام میں آنے جانے کا راستہ بند ہو تو اس کا سبب پوچھا۔ لوگوں نے لڑکی کا ذکر کیا۔ کنیز اس کے پاس گئی اور اُس کے حُسن و جمال کو دیکھ کر ہوش اُڑ گئے، خُدا کی پاکی بیان کرنے لگی کہ اس نے کیسی کیسی صورتیں بنائی ہیں۔ اتنے میں لڑکی غسل میں مصروف ہو گئی۔ جب وہ نہا چکی اور باہر نکل کر کپڑے پہنے تو اس کا حُسن اور دوبالا ہو گیا۔ تھوڑی دیر وہ مسند پر بیٹھی، عورتیں اسے برابر دیکھا کیں، پھر وہ ان کی طرف دیکھتی ہوئی چل دی۔ خلیفہ کی کنیز تحفۃ العوادہ اس کے ساتھ ساتھ چلی اور اس کا گھر دیکھ کر خلیفہ کے محل کو لوٹ گئی اور شہزادی زبیدہ کے پاس پہنچ کر اُس کے آگے زمین چومی۔ شہزادی زبیدہ نے کہا ای تحفہ تجھے حمام میں اتنی دیر کیوں لگی؟ اس نے کہا ای میری آقا! میں نے ایک اعجوبہ دیکھا ہو جس کی مثال نہ مردوں میں پائی جاتی ہو نہ عورتوں میں۔ اُس

میں میں اتنی مشغول اور حیران رہی کہ میں نے سر تک نہیں دھویا۔ زبیدہ بولی ای تحفہ، وہ کیا؟ کنیز نے جواب دیا ای میری آقا، میں نے حمام میں ایک لڑکی دیکھی جس کے ساتھ چاند جیسے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے، جس کی نظیر نہ پہلے کسی نے دیکھی ہوگی اور نہ آیندہ کبھی کوئی دیکھے گا۔ اس کی شکل و صورت کی مثال تمام دنیا میں موجود نہیں۔ ای میری آقا، تیرے احسانوں کی قسم اگر امیرالمومنین کو اس کی خبر ہو جائے تو وہ اس کے شوہر کو قتل کرکے اسے چھین لے کیوں کہ اس جیسی دنیا میں کوئی عورت نہیں۔ میں نے اس کے شوہر کے متعلق بھی پوچھا ہے، وہ ایک تاجر ہے جس کا نام حسن بصری ہے۔ جب تک وہ حمام سے نکل کر اپنے گھر نہ پہنچ گئی میں اس کے پیچھے پیچھے لگی رہی۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ اس گھر میں رہتی ہے جو وزیر کا ہے اور جس کے دو دروازے ہیں، ایک سمندر کی طرف اور دوسرا خشکی کی طرف۔ ای میری آقا، میں ڈرتی ہوں کہ اگر امیرالمومنین کے کانوں تک یہ خبر پہنچ گئی تو کہیں وہ شرع کے خلاف اس کے شوہر کو قتل کرکے اس سے شادی نہ کرلے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

سات سو پچانویں رات

جب سات سو پچانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! کنیز سے لڑکی کی تعریف سن کر شہزادی زبیدہ نے کہا کہ دور ہو کیا وہ ایسی خوب صورت ہے کہ امیرالمومنین اپنے دین کو دنیا کے ہاتھ سے بیچ ڈالے اور اس کے پیچھے شرع کی مخالفت کرے! خدا کی قسم میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی ہوں اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسا تو کہتی ہے تو میں تیری گردن ماردوں گی۔ چھوکری، سال میں تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں اور امیرالمومنین کے محل میں اتنی ہی کنیزیں ہیں کیا ان میں سے کسی میں وہ خوبیاں

نہیں جو اس میں ہیں۔ کنیز بولی اے میری آقا، خدا کی قسم نہیں، نہ کُل بغداد میں اس کی مثال ہے اور نہ عجم و عرب میں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ خدا نے اس کی مثال پیدا ہی نہیں کی۔

یہ سُن کر شہزادی زبیدہ نے مسرور کو بلایا۔ مسرور نے آکر اس کے آگے زمین چومی۔ زبیدہ نے کہا کہ اے مسرور! وزیر کے اس گھر کو جا جس کے دو دروازے ہیں ایک سمندر کی طرف دوسرا خشکی پر اور فوراً اس لڑکی کو جو وہاں ہے مع اس کے دونوں بچوں اور بڑھیا کے لے آ دیر نہ کر۔ مسرور حکم پاتے ہی وہاں سے روانہ ہو کر مکان کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی حسن کی بڑھیا ماں نے پوچھا کہ دروازے پر کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ امیر المومنین کا غلام مسرور۔ بڑھیا نے دروازہ کھول دیا، مسرور نے اندر جا کر اسے سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ کیا چاہتا ہے؟ مسرور نے کہا کہ قاسم کی بیٹی اور نبیؐ کے چچا عباس کی اولاد کے ساتویں خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی شہزادی زبیدہ نے تجھے تیری بہو اور اس کے بچوں کو بلایا ہے کیوں کہ عورتوں نے اس کے آگے تیری بہو اور اس کے حُسن کی تعریف کی ہے۔ حسن کی ماں بولی کہ اے مسرور! ہم پردیسی ہیں اور لڑکی کا شوہر جو میرا بیٹا ہے یہاں موجود نہیں۔ اس کا حکم ہے کہ نہ میں اور نہ اس کی بیوی گھر سے نکل کر کسی شخص کے پاس جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی بات پیش آئی تو میرا بیٹا اپنی جان دے دے گا۔ اے مسرور! تیری مہربانی ہوگی اگر تو ہم سے کوئی ایسی بات نہ کرے جس کی ہم میں طاقت نہیں۔ مسرور نے کہا اے میری آقا! اگر میں جانتا کہ اس میں تیرے لیے کوئی اندیشہ ہے تو تجھے ہرگز تکلیف نہ دیتا۔ شہزادی زبیدہ بس اتنا چاہتی ہے کہ اسے دیکھ لے اس کے بعد وہ واپس چلی آئے۔ اس کی مخالفت نہ کر ورنہ پچھتانا پڑے گا۔ میں تمھیں جس طرح لے جاؤں گا اگر خدا کو منظور ہے تو اسی طرح واپس پہنچا جاؤں گا

حسن کی ماں سے مسرور کی مخالفت بن نہ پڑی اور اس نے اندر جا کر لڑکی کو

بنایا، سنوارا اور پھر وہ سب مسرور کے پیچھے پیچھے خلیفہ کے محل کی طرف روانہ ہوگئے۔ مسرور نے انھیں اندر لے جاکر شہزادی زبیدہ کے آگے کھڑا کر دیا۔ انھوں نے زبیدہ کے آگے زمین چومی اور اسے دُعا دی لیکن لڑکی نے اپنا مُنہ نہ کھولا۔ زبیدہ نے کہا ذرا اپنا مُنہ تو کھول کہ میں دیکھوں۔ لڑکی نے زمین چوم کر اپنا مُنہ کھول دیا جسے دیکھ کر آسمان پر چاند شرما جائے۔ زبیدہ کی نظر جب اس پر پڑی تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اس کے نور اور چہرے کی روشنی سے محل چمک اٹھا۔ زبیدہ اس کا حسن دیکھ کر دنگ ہوگئی اور یہی حال سارے محل والوں کا ہوا۔ جو اُسے دیکھتا ہواس باختہ ہو جاتا۔ اور اس کے منھ سے بات تک نہ نکلتی۔ اب شہزادی زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی، لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر سینے سے لگا لیا اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور حکم دیا کہ محل میں لے جایا جائے اس کے بعد اس نے ایک نہایت شان دار جوڑا اور بہترین جواہرات کا ایک ہار منگوا کر اُسے پہنایا اور کہا ای حسینوں کی سرتاج، تو مجھے پسند ہی، تو نے میری آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔ تیرے پاس کون سی عمدہ چیز ہی؟ لڑکی بولی ای میری آقا میرے پاس پروں کا ایک لباس ہی کہ اگر میں اسے تیرے سامنے پہنوں تو اس کی کاری گری پہ تجھے تعجب ہوگا اور جو کوئی اسے دیکھے گا اس کا ذکر نسلاً بعد نسلاً کرتا رہے گا۔ زبیدہ نے پوچھا وہ تیرا لباس کہاں ہی؟ اس نے جواب دیا کہ وہ میری ساس کے پاس ہی اس سے مانگ لے۔

شہزادی زبیدہ نے کہا ای میری ماں تجھے میری جان کی قسم جاکر اس کا پروں کا لباس لے آتا کہ ہم اس کا تماشا دیکھیں، پھر تو اسے لے جائیو۔ بڑھیا بولی ای میری آقا یہ جھوٹی ہی کبھی تو نے کسی عورت کے پاس پروں کا لباس بھی دیکھا ہی! وہ تو محض چڑیوں کی پوشاک ہی۔ لڑکی نے شہزادی زبیدہ سے کہا ای میری آقا، تیری جان کی قسم میرا پروں کا لباس اس کے پاس ہی اور وہ گھر کی ایک کوٹھری میں دفن ہی۔

شہزادی زبیدہ نے اپنے گلے سے ہیروں کا ایک ہار اُتارا جو کسرا اور قیصر کے خزانوں کے برابر ہوگا اور کہنے لگی اے میری والدہ! یہ ہار لے .... یہ کہہ کر اس نے اسے وہ ہار دے دیا اور کہا کہ میری جان کی قسم جاکر وہ لباس لے آ، جب ہم اسے دیکھ لیں تو پھر لے جائیو۔ بڑھیا نے قسم کھائی کہ میں نے وہ لباس کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ میں یہ جانتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ شہزادی زبیدہ نے اسے ڈانٹا اور اس سے کنجیاں لے لیں اور مسرور کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو زبیدہ نے کہا یہ کنجیاں لے اور اس کے گھر جاکر اسے کھول اور اس کوٹھری میں داخل ہو جس کا دروازہ اس اس طرح کا ہے۔ اس کے بیچ میں ایک صندوق ہے، اسے توڑ کر اس میں جو پروں کا لباس ہے اسے میرے پاس لے آ، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی اور اس نے وہ ....

سات سو چھیانویں رات

سات سو چھیانویں رات ہوئی تو اس نے کہا کہ اے نیک نہاد بادشاہ! زبیدہ نے مسرور کو حکم دیا کہ جاکر اس کا لباس لے آ اور وہ شہزادی زبیدہ کے ہاتھ سے کنجیاں لے کر چل دیا۔ حسن کی ماں بھی روتی پیٹتی اس کے ساتھ ہولی۔ وہ پشیمان تھی کہ لڑکی کا کہنا مان کر اسے حمام کیوں لے گئی، لڑکی کا حمام جانے کا ارادہ محض ایک فریب تھا۔ اتنے میں گھر آگیا، بڑھیا اور مسرور اندر گئے، کوٹھری کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوئے، مسرور نے صندوق کھول کر اس میں سے پروں کا لباس نکالا اور اسے ایک رومال میں لپیٹ کر شہزادی زبیدہ کے پاس لے آیا۔ زبیدہ نے اسے ملاحظہ کیا اور اس کی کاری گری پر تعجب کرنے لگی، پھر اسے لڑکی کو دے کر

کہا کیا یہی تیرا پروں کا لباس ہی؟ وہ بولی ای میری آقا! ہاں، اور خوش خوش ہاتھ بڑھا کر اُسے لے لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھا کہ وہ پہلے کی طرح مکمل ہی اور اس کا ایک پر بھی ضائع نہیں ہوا۔ اپنا ہر طرح سے اطمینان کر کے وہ شہزادی زبیدہ کے پاس سے اٹھی اور لباس کو لے کر کھولا اور بچّوں کو گود میں لے کر اسے پہن لیا، خدا کی قدرت سے وہ چڑیا بن گئی۔ زبیدہ اور تمام حاضرین تعجب کرنے لگے سب کو اچنبھا تھا۔ اب لڑکی مٹکنے، چلنے اور ناچنے کودنے لگی، لوگ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور تعجب کرتے۔ لڑکی نے پوچھا ای میری آقا! کیوں یہ خوب صورت ہی نا؟ حاضرین نے کہا ای حسینوں کی سرتاج! بہت خوب صورت۔ لڑکی بولی ای میری آقا! جو کچھ میں کروں گی وہ اس سے بھی زیادہ نیا کرشمہ ہوگا۔ یہ کہ کر اس نے اپنے پر کھولے اور اپنے بیٹوں کو لے کر اُڑی اور اُڑ کر گنبد پر بیٹھ گئی۔ لوگ اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور کہتے خدا کی قسم یہ عجیب و غریب کاری گری ہی، ایسی بات ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔

اب لڑکی چاہتی تھی کہ اُڑ کر اپنے وطن چلی جائے لیکن اسے حسن کی یاد آگئی، وہ رونے لگی۔ شہزادی زبیدہ نے کہا ای حسینوں کی سرتاج، اتر کر ہمارے پاس آ، تاکہ ہم تیرا حُسن دیکھ کر خوش ہوں۔ پاک ہی وہ ذات جس نے تجھے فصاحت اور حُسن دونوں عطا کیے۔ لڑکی نے جواب دیا کہ کہیں کوئی جا کر بھی آیا ہی۔ اس کے بعد اس نے حسن کی ماں سے کہا جو بے چاری غمگیں کھڑی تھی کہ ای میری آقا، ای حسن کی ماں، واللہ تجھ پر مجھے ترس آتا ہی۔ جب تیرا بیٹا لوٹ کر آئے، جُدائی کے دن اس پر کٹھن گزریں، اسے مجھ سے ملنے کی تمنّا ہو، محبت اور عشق کی ہوا کے جھونکے چلنے لگیں تو وہ میرے پاس جزائر واق میں آجائے۔ یہ کہ کر وہ مع اپنے بچّوں کے اُڑی اور اپنے وطن کی طرف چل دی۔ یہ دیکھ کر حسن کی ماں رونے اور اپنا منھ پیٹنے لگی اور اتنی آہ و بکا کی کہ اسے غش آگیا۔ ہوش آیا تو شہزادی زبیدہ نے کہا، ای میری پردیسن، مجھے یہ نہیں

معلوم تھا کہ ایسا ہوگا۔ اگر تو مجھے پہلے سے بتا دیتی تو میں تجھ سے ضد نہ کرتی۔ میں یہ نہیں
جانتی تھی کہ وہ اُڑنے والے جِنوں میں سے ہے۔ اگر مجھے یہ حال معلوم ہوتا تو میں اُسے
کبھی وہ لباس نہ پہننے دیتی اور نہ اسے بچوں کو لے جانے دیتی۔ بہر حال ای میری آقا،
مجھے معاف کر دے۔ بڑھیا کے لیے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا، اس نے کہا کہ
میں تجھے معاف کرتی ہوں، اور یہ کہہ کر وہ محل سے نکلی، اپنے گھر پہنچی اور اپنے منھ
پر اتنے طمانچے مارے کہ بے ہوش ہو گئی۔ جب اُسے ہوش آیا تو وہ اس لڑکی اور
اس کے بچوں پر افسوس اور اپنے بیٹے کی تمنّا کرنے لگی۔ اس نے گھر کے اندر تین
قبریں کھودیں، ان پر بیٹھ کر دن رات رویا کرتی۔ بیٹے کو گئے جتنا زمانہ گزرتا جاتا اتنا
ہی اس کے دل میں فکر اور رنج بڑھتا جاتا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سات سو ستانویں رات

سات سو ستانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! حسن
کی ماں کا حال تو یہ رہا، اب اس کے بیٹے حسن کا ماجرا سُنو۔ جب وہ لڑکیوں کے پاس
پہنچا تو انھوں نے اسے قسم دی کہ تین مہینے ٹھیرے۔ تین مہینے کے بعد انھوں نے
اس کے لیے مال کے دس گٹھر تیار کیے، پانچ سونے اور پانچ چاندی کے اور ایک
اونٹ پر کھانے پینے کا سامان ساتھ کر دیا اور اس کے ساتھ چلنے لگیں لیکن اس نے
انھیں قسم دی کہ وہ لوٹ جائیں اور وہ اسے رخصت کرنے کی غرض سے گلے ملنے لگیں۔
چھوٹی لڑکی بڑھ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اور اتنا روئی کہ اُسے غش آگیا، پھر
دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں، پھر چھٹی، پھر ساتویں ایک ایک کرکے
اس کے گلے ملیں اور حسن ان سے رخصت ہوتے وقت اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ

گئی۔ بالآخر وہ چل دیا، اور دن رات چلتے چلتے بغداد پہنچا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کے جانے کے بعد کیا پیش آیا ہے۔ جب وہ گھر کے اندر گیا اور چاہتا ہی تھا کہ اپنی ماں کو سلام کرے، تو اُس نے دیکھا کہ رونے پیٹنے اور جاگنے کی وجہ سے ماں کا جسم گھل گیا ہے اور اس کی ہڈیاں نکل آئی ہیں، وہ سوکھ کر تنکا سی ہوگئی ہے، اس کے منھ سے بات تک نہیں نکلتی۔ اونٹنیوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے وہ ماں کی طرف بڑھا اور پوچھا کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں؟ یہ سُن کر ماں اتنی روئی کہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حسن اٹھا اور بیوی بچوں کو ڈھونڈنے لگا لیکن ان کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس کے بعد وہ کوٹھری میں جا کر تلاش کرنے لگا، دیکھا کہ کوٹھری بھی کھلی پڑی ہے اور صندوق بھی۔ لباس غائب ہے۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ بیوی اپنے پروں کے لباس کو لے کر اُڑ گئی اور بچوں کو اپنے ساتھ لیتی گئی ہے۔

کوٹھری سے نکل کر حسن اپنی ماں کے پاس آیا دیکھا کہ وہ ہوش میں آگئی ہے۔ اُس نے پوچھا کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں؟ ماں نے رو کر کہا، بیٹا، خُدا ان کے بارے میں تجھے بڑا اجر دے! یہ ان تینوں کی قبریں ہیں۔ اپنی ماں کی زبان سے یہ سُن کر حسن نے زور سے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر گیا۔ صبح سے ظہر تک اسی طرح پڑا رہا۔ ماں کو اور غم پر غم ہوا اور وہ اس کے جینے سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ جب حسن کو پھر ہوش آیا تو وہ منھ پر طمانچے مارنے، کپڑے پھاڑنے اور گھر میں پاگلوں کی طرح پھرنے لگا۔ تلوار کھینچ کر ماں کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر تو نے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا تو میں تیری بھی گردن اُڑا دوں گا اور اپنے آپ کو بھی مار ڈالوں گا۔ وہ بولی بیٹا، ایسا نہ کر میں ابھی بتائے دیتی ہوں۔ تلوار کو میان میں ڈال لے، اور بیٹھ کر سارا ماجرا سُن۔ جب اس نے تلوار میان میں کر لی اور ماں کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے سارا قصہ شروع سے لے کر آخر تک سُنا دیا اور کہا بیٹا، اگر میں حمام کے بارے میں اسے روتا نہ دیکھتی اور

مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تیرے آنے پر وہ شکایت کرے گی اور تو مجھ پر ناراض ہوگا تو میں کبھی اسے حمام نہ لے جاتی، اور اگر شہزادی زبیدہ ناراض ہو کر مجھ سے زبردستی کنجی نہ لے لیتی تو میں ہرگز لباس نہ نکالتی خواہ مر ہی کیوں نہ جاتی۔ بیٹا، تو جانتا ہے کہ کسی کا ہاتھ خلیفہ کے ہاتھ سے زیادہ لمبا نہیں۔ جب اسے لباس مل گیا تو اس نے اسے لے کر اُلٹا پلٹا اور یہ سوچنے لگی کہ اس میں سے کوئی چیز جاتی تو نہیں رہی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مکمل ہے تو خوش ہوگئی، بچوں کو اپنی کمر سے باندھا اور پروں کا لباس پہن لیا کیوں کہ اس سے پہلے شہزادی زبیدہ اس کی عزت احترام اور خوب صورتی دیکھنے کی خاطر اس کے سارے کپڑے اُتروا چکی تھی۔ پروں کا لباس پہنتے ہی اسے جھرجھری سی آئی، وہ چڑیا بن گئی اور محل کے اندر اِدھر اُدھر پھدکنے لگی، لوگ اسے دیکھنے اور اس کے حسن و جمال پر تعجب کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ اُڑ کر محل کے اوپر جا بیٹھی اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی کہ اگر تیرا بیٹا آئے اور جدائی کی راتیں اس پر کٹھن گزریں، اُسے مجھ سے ملنے کی خواہش ہو اور محبت اور تمناؤں کی ہوائیں چلنے لگیں تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر جزائر واق آ جائے۔ یہ ہیں وہ باتیں جو تیرے پیچھے کیں، اور شہرزاد کو صبح ہو گئی۔۔۔۔۔۔

سات سو اٹھانویں رات

سات سو اٹھانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، اپنی ماں کی باتیں سن کر حسن نے زور سے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگیا اور شام تک بے ہوش پڑا رہا۔ ماں اس کے سرہانے بیٹھی آدھی رات تک روتی رہی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پانچ دن تک اس کی یہ حالت رہی

کہ وہ گھر میں سر ٹکراتا، روتا، پیٹتا اور ٹھنڈے سانس بھرتا۔ نہ کھاتا نہ پیتا۔ ماں اسے برابر قسمیں دیتی کہ رونا بند کردے مگر وہ اس کی بات نہ سنتا اور برابر روتا پیٹتا رہتا، ماں اسے تسلی دیتی مگر وہ نہ مانتا۔ اسی طرح ایک بار وہ رات بھر روتا رہا، جب صبح کو اس کی آنکھ جھپک گئی اس نے خواب میں اپنی بیوی کو دیکھا کہ وہ غمگین ہے اور رو رہی ہے، اس پر وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ دن نکلا تو اس کا رونا، پیٹنا اور زیادہ ہوگیا۔ پورے ایک مہینے تک وہ غمگین اور روتا رہا، رات بھر جاگتا رہتا اور بہت کم کھاتا پیتا۔ مہینہ ختم ہونے پر اسے خیال آیا کہ بہنوں کے پاس چلنا چاہیے تاکہ وہ اس کی مطلب برآری میں مددگار ہوں۔ یہ ارادہ کرکے اس نے اونٹنیوں کو بلایا پچاس کے اوپر عراق کے تحفے لادے اور ایک اپنی سواری کے لیے رکھ لی۔ پھر اس نے گھر کو ماں کے سپرد کرکے اپنی بہنوں کی طرف روانہ ہوگیا کہ شاید ان کی کوشش سے اس کی بیوی مل جائے اور چلتے چلتے لڑکیوں کے محل میں پہنچ گیا جو جبل سحاب میں تھا۔

بہنوں کے پاس پہنچ کر حسن نے انھیں تحفے دیے، وہ خوش ہوگئیں اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دینے لگیں اور کہا کہ بھائی، تو اتنی جلدی کیوں لوٹ آیا؟ ابھی تو تجھے گئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے۔ یہ سن کر اس نے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر گیا۔ لڑکیاں اس کے اردگرد بیٹھ کر رونے لگیں۔ کئی بار اسے ہوش آیا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔ اس کی بہن نکل کر اس کے پاس آئی اور یہ دیکھ کر کہ وہ بے ہوش پڑا ہے چیخنے اور منھ پیٹنے لگی۔ یہ سن کر اس کی دوسری بہنیں بھی نکل آئیں، انھوں نے دیکھا کہ حسن پر غشی طاری ہے تو وہ بھی اس کے اردگرد بیٹھ کر رونے لگیں مگر اسے دیکھ کر ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ ساری مصیبت محبت اور عشق، شوق اور تمنا کی لائی ہوئی ہے۔ جب انھوں نے ماجرا پوچھا تو اس نے رو رو کر بیان کیا کہ میری غیر موجودگی میں میری بیوی اپنے بچوں کو لے کر اڑ گئی ہے۔

انھیں اس پر بڑا افسوس ہوا اور انھوں نے پوچھا کہ جاتے وقت اس نے کیا کہا تھا؟ حسن نے کہا بہنو! اس نے میری ماں سے کہا تھا کہ اپنے بیٹے سے کہہ دیجیو کہ اگر جُدائی کی راتیں اس کے لیے کٹھن ہو جائیں اور وہ میرے ملنے کا مشتاق ہو، محبت اور تمنا زور کرے تو وہ میرے پاس جزائر واق واق میں آ جائے۔ اُس کی باتیں سُن کر وہ سر ہلانے لگیں اور سوچ میں پڑ گئیں۔ حسن نے دیکھا کہ وہ ایک دوسری کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ سر جھکائے رہیں پھر سر اٹھا کر انھوں نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا، اگر وہ آسمان تک پہنچ گیا تو تیری بیوی مل جائے گی، اور شہزاد کو صبح ہوتی . . . .

سات سو ستانویں رات

سات سو ستانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب لڑکیوں نے حسن سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا، اگر وہ آسمان تک پہنچ گیا تو تجھے بیوی بچے مل جائیں گے تو اس کے آنسو مینہ کی طرح اس کے رُخساروں پر بہنے لگے یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ اسے روتا دیکھ کر لڑکیاں بھی رونے لگیں، انھیں اس پر ترس بھی آنے لگا اور رشک بھی۔ وہ اس کے ساتھ نرمی سے باتیں کرتیں، صبر دلاتیں اور دعا کرتیں کہ اس کے بچے اسے مل جائیں۔ اب اس کی بہن نے آگے بڑھ کر کہا بھائی، اگر تو اطمینان رکھے گا اور صبر سے کام لے گا تو تیری مُراد بر آئے گی۔ جو صبر اور انتظار کرتا ہے اس کی تمنا بر آتی ہے کیوں کہ صبر خوشی کی کنجی ہے۔ اپنا دل مضبوط اور ارادہ پکا رکھ۔ دس برس والا نویں برس میں نہیں مرتا ہے، غم اور رنج سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے

ہاں ٹھیر کر آرام کر، میں کوئی نہ کوئی تدبیر نکال کر خدا نے چاہا تو تیرے بیوی بچوں سے ملا دوں گی۔ حسن بلک بلک کر رونے لگا اور اپنی بہن کے پاس بیٹھ گیا۔ بہن اس سے باتیں کرتی، اسے تسلی دیتی اور پوچھتی کہ وہ کس وجہ سے اُداس ہے، وہ اس کی وجہ بتاتا۔ اس نے کہا بھائی، میں تجھ سے کہنے والی تھی کہ پروں کے لباس کو آگ لگا دے لیکن شیطان نے مجھے بھلا دیا۔ جب اس کی بہن نے دیکھا کہ وہ محبت اور عشق کا مارا ہے تو وہ روتی ہوئی اپنی بہنوں کے پاس گئی اور نڈھال ہو کر ان پر گر پڑی ان کے قدم چومنے لگی اور ان سے کہا کہ میرے بھائی کی مدد کرو تاکہ اس کے بچے بیوی اسے مل جائیں اور انھیں قسم دی کہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکال کر اسے جزائر واق پہنچا دو۔ یہ کہہ کر وہ اپنی بہنوں کے آگے اتنا روئی کہ وہ بھی رونے لگیں اور انھوں نے کہا کہ اطمینان رکھ ہم کوشش کریں گے اور اگر خدا نے چاہا تو اسے اس کی بیوی سے ملا دیں گے۔ حسن ان کے ساتھ ایک سال تک رہا اور ایک روز بھی اس کے آنسو نہ تھمے۔

اس کی بہنوں کا عبدالقدوس نامی ایک سگا چچا تھا، اسے اپنی بڑی بھتیجی سے بہت محبت تھی۔ وہ ہر سال ایک بار آتا اور جو اسے ضرورت ہوتی پورا کر دیتا۔ لڑکیوں نے ایک مرتبہ اس سے حسن کا قصہ بھی بیان کیا تھا اور یہ کہ اسے مجوسی کے ساتھ کیا پیش آیا اور اس نے اسے کس طرح قتل کیا۔ چچا نے یہ کہانی سنی تو بہت خوش ہوا اور اس نے بڑی لڑکی کو ایک تھیلا دے کر جس میں خوش بوئیں تھیں کہا کہ بھتیجی، اگر تجھے کوئی مشکل پیش آئے یا تکلیف ہو یا اور کسی قسم کی ضرورت پڑے تو ان خوش بوؤں کو آگ میں ڈال کر میرا نام لیجیو۔ میں فوراً آ کر تیری حاجت پوری کر دوں گا۔ یہ باتیں سال کے پہلے روز ہوئی تھیں۔ اب لڑکی نے اپنی ایک بہن سے کہا کہ سال پورا ہو گیا ہے اور چچا نہیں آیا۔ جا کر خوش بوؤں کی تھیلی لے آ

اور چقماق سے آگ جلا۔ لڑکی خوش خوش اٹھی اور خوش بوؤں کی تھیلی لاکر اسے کھولا اور اس میں سے تھوڑی سی خوش بوئیں نکال کر اپنی بہن کو دے دیں۔ اس نے انھیں آگ میں ڈال دیا اور اپنے چچا کا نام لینے لگی۔ ابھی خوش بوئیں جل بھی نہیں چکی تھیں کہ گھاٹی کی طرف سے ایک گرد اٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد اس میں سے ایک ہاتھی چنگھاڑتا ہوا اور اس پر ایک بوڑھا سوار دکھائی دیا۔ جونہیں لڑکیوں کی نظر اس پر پڑی انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے ان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ چند لمحے نہ گزرے تھے کہ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ چومے اور سلام کیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور لڑکیاں اس سے باتیں کرنے اور اس کے نہ آنے کا سبب پوچھنے لگیں۔ اس نے کہا کہ ابھی میں اور تمھاری چچی بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ مجھے خوش بو آئی اور میں اس ہاتھی پر سوار ہو کر آ پہنچا۔ اے میری بھتیجی، تم لوگوں کو کیا ضرورت پیش آئی؟ اس نے کہا چچا، تجھے دیکھنے کا ہمیں بہت اشتیاق تھا، کیوں کہ سال گزر چکا ہے اور تو کبھی ایک سال سے زیادہ غائب نہیں رہتا۔ اس نے کہا کہ میں کام میں لگا ہوا تھا اور کل تمھارے پاس آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لڑکیوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے دعا دی اور اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو ویں رات

آٹھ سو ویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب لڑکیاں بیٹھ کر اپنے چچا کے ساتھ باتیں کرنے لگیں تو بڑی لڑکی نے کہا چچا، ہم نے تجھے حسن بصری کا قصہ تو سنایا ہے جسے مجوسی بہرام لایا تھا اور جس نے اسے

قتل کیا ہے اور ملک اکبر کی بیٹی کا ماجرا بھی بیان کیا ہے کہ کیسی کیسی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر اس نے اسے پکڑا، اس سے نکاح کیا اور پھر وہ اسے لے کر اپنے وطن گیا؟ چچا بولا ہاں، پھر کیا ہوا؟ لڑکی نے کہا کہ اس کی اس بیوی سے دو بچے ہوئے اور پھر اس کی غیر موجودگی میں لڑکی نے اس کے ساتھ بے وفائی کی، بچوں کو لے کر اپنے وطن چلی گئی اور چلتے چلتے اس کی ماں سے یہ کہتی گئی کہ اگر اسے مجھ سے ملنے کی تمنا ہو تو وہ میرے پاس جزائر واق میں آجائے۔ چچا اپنا سر ہلانے اور دانتوں سے انگلیاں کاٹنے لگا۔ پھر سر نیچا کر کے اپنی انگلی سے زمین پر لکیریں کھینچیں۔ اس کے بعد وہ پھر اپنا سر ہلانے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حسن اس کی نظروں سے پوشیدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکیوں نے چچا سے کہا ہمیں جواب دے کیوں کہ ہمارا دل پھٹا جا رہا ہے۔ اس نے ان کی طرف سر ہلا کر کہا کہ اے میری بیٹیو، اس شخص نے بے کار اپنی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے اور مفت میں خطرناک چیزوں کا سامنا کر رہا ہے کیوں کہ جزائر واق تک اس کا پہنچنا ناممکن ہے۔ لڑکیوں نے حسن کو آواز دی، وہ نکل کر آیا اور شیخ عبدالقدوس کی طرف بڑھ کر اس کا ہاتھ چوما، اُسے سلام کیا۔ شیخ نے خوش ہو کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ لڑکیوں نے چچا سے کہا، جو کچھ تو نے ہم سے کہا ہے ہمارے بھائی سے بھی تفصیل کے ساتھ بیان کردے۔ شیخ حسن سے مخاطب ہو کر بولا بیٹا، اس سخت تکلیف اور عذاب میں اپنی جان نہ ڈال، جزائر واق تک تیرا پہنچنا ناممکن ہے، خواہ تیرے قبضے میں اُڑنے والے جن اور چلنے والے ستارے ہی کیوں نہ ہوں کیوں کہ تیرے اور ان جزیروں کے درمیان سات گھاٹیاں، سات بڑے پہاڑ اور سات سمندر ہیں۔ تو اُس جگہ کیسے پہنچ سکتا ہے اور تجھے وہاں تک کون پہنچا سکتا ہے! خدا کے لیے فوراً لوٹ جا اور اس بکھیڑے میں نہ پڑ۔

شیخ عبدالقدوس کی یہ باتیں سُن کر حسن اتنا رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔ لڑکیاں بھی اس کے آس پاس بیٹھ کر رونے لگیں چھوٹی لڑکی نے تو اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اتنا منہ پیٹا کہ غش کھا کر گر پڑی۔ ان کے رنج و غم کو دیکھ کر شیخ عبدالقدوس کو ترس آ گیا، اس کا دل کڑھنے لگا اور اس نے کہا کہ چُپ ہو جاؤ اور حسن کی طرف مخاطب ہو کر بولا، غم نہ کر، خُدا نے چاہا تو تیری مُراد بر آئے گی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ بیٹا، اُٹھ اور دل مضبوط کر کے میرے ساتھ چل حسن لڑکیوں سے رخصت ہوا اور اپنا دل مضبوط کر کے شیخ کے ہمراہ ہو لیا۔ وہ خوش تھا کہ اب میری مُراد بر آئے گی۔ شیخ عبدالقدوس ہاتھی منگوا کر اس پر سوار ہو گیا حسن کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور برابر تین دن اور تین رات بجلی کی طرح چلنے کے بعد ایک بہت بڑے پہاڑ کے پاس پہنچا جو نیلا تھا۔ اس پہاڑ کے بیچ میں ایک کھوہ تھی جس میں چینی لوہے کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ شیخ نے حسن کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہاتھی پر سے اتارا اور اس کے بعد خود اُتر کر ہاتھی کو چلتا کیا اور کھوہ کے دروازے پر دستک دی دروازہ کُھلا اور اس میں سے دیو کی طرح ایک کالا بھجنگ ننگا غلام نکلا، اس کے داہنے ہاتھ میں تلوار اور بائیں میں فولادی ڈھال تھی۔ شیخ عبدالقدوس کو دیکھتے ہی اس نے تلوار اور ڈھال ہاتھ سے پھینک دی اور شیخ کی طرف بڑھ کر اس کا ہاتھ چوُما۔ شیخ، حسن کا ہاتھ پکڑ کر اندر گیا اور غلام نے ان کے پیچھے دروازے میں تالا ڈال دیا۔ حسن نے دیکھا کہ غار بڑا لمبا چوڑا ہے اور اس کی دہلیز ڈاٹ کی ہے۔ ایک میل تک برابر چلنے کے بعد وہ ایک بڑے میدان میں پہنچے جہاں ایک ستون میں پیتل کے ڈھلے ہوئے دو بڑے دروازے لگے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالقدوس نے ان میں سے ایک دروازہ کھولا اور حسن سے یہ کہہ کر کہ یہیں دروازے پر بیٹھا رہیو، خبردار اندر نہ آئیو میں اب لوٹ کر آتا ہوں دروازے کے اندر گیا اور

اسے پھر بھیڑ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ ایک گھوڑا لے کر نکلا جس پر زین اور لگام لگی ہوئی تھی۔ وہ گھوڑا ایسا تھا کہ اگر چلتا تو معلوم ہوتا کہ اُڑ رہا ہے اور جب وہ اُڑتا تو گرد بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ شیخ نے اسے حسن کو دے کر کہا کہ سوار ہو جا۔ اب شیخ نے دوسرا دروازہ کھولا، اس میں ایک بہت بڑا جنگل دکھائی دیا۔ حسن گھوڑے پر سوار ہوا اور دونوں اس دروازے سے نکل کر جنگل میں داخل ہوگئے۔ شیخ نے حسن سے کہا بیٹا، یہ خط لے اور اس گھوڑے پر سوار ہو کر جہاں تک وہ جائے چلا جا۔ جب تو دیکھے کہ وہ اسی غار کی طرح ایک غار کے دروازے پر ٹھیر گیا ہے تو اس کی پیٹھ پر سے اتر کر اور اس کی باگ اس کی زین پر ڈال کر اسے جانے دیجیو۔ وہ اسی غار کے اندر چلا جائے گا لیکن تو اس کے ساتھ نہ جائیو بلکہ پانچ روز تک غار کے دروازے پر ٹھیرا رہیو گھبرائیو نہیں۔ چھٹے دن ایک سیاہ فام بڈھا نکل کر تیرے پاس آئے گا جس کا سیاہ لباس اور سفید داڑھی ناف تک ہوگی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ہاتھ چومیو، اس کا دامن اپنے سر پر رکھیو اور اس کے آگے اتنا رویو کہ اسے رحم آجائے۔ وہ تجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ جب وہ یہ سوال کرے تو اسے یہ خط دے دیجیو۔ وہ تجھ سے خط لے لے گا مگر کوئی بات نہیں کرے گا اور تجھے اکیلا چھوڑ کر اندر چلا جائے گا۔ پھر تو اور پانچ روز اطمینان سے رہیو۔ چھٹے دن اس کی راہ دیکھیو اگر وہ خود نکل کر تیرے پاس آئے تو جان جائیو کہ تیری مراد بر آئی اور اگر اس کا کوئی غلام نکل کر آئے تو سمجھ لیجیو کہ وہ شخص تجھے قتل کر دینا چاہتا ہے اور بس۔ بیٹا تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص اپنی جان پر کھیلتا ہے اس کا انجام موت ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو کے بعد پہلی رات

آٹھ سو کے بعد پہلی رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! شیخ عبدالقدوس نے کہا کہ جو شخص اپنی جان پر کھیلتا ہے اس کا انجام موت ہے۔ اگر تجھے اپنی جان پیاری ہے تو ہلاکت میں نہ پڑ اور اگر تو مرنے سے نہیں ڈرتا تو بسم اللہ، میں نے ہر بات صاف صاف بتا دی ہے۔ اگر تو اپنی بہنوں کے پاس جانا چاہتا ہے تو یہ ہاتھی حاضر ہے، وہ تجھے میری بھتیجیوں کے پاس پہنچا دے گا پھر وہ تجھے تیرے وطن پہنچا دیں گی اور خدا تجھے اس لڑکی سے بہتر عطا کرے گا جس میں تیرا دل اٹکا ہوا ہے۔ حسن نے شیخ سے کہا جب تک میں اپنی مراد نہ پالوں زندگی میں کیا مزا آئے گا! خدا کی قسم میں لوٹوں گا تو اپنی محبوبہ کو لے کر لوٹوں گا ورنہ یہیں جان دے دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگا، شیخ کو یقین ہو گیا کہ جب تک اس کی مراد نہ بر آئے وہ نہیں لوٹے گا، کسی کے کہنے سننے کا اس پر اثر نہ ہوگا اور وہ اپنی جان کو ضرور خطرے میں ڈالے گا، خواہ جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔ اب اس نے کہا کہ بیٹا سُن، جزائر واق سات جزیرے ہیں اور وہاں بہت بڑا لشکر ہے جس میں محض کنواری لڑکیاں ہیں۔ اندرونی جزائر میں صرف شیطان، جن، جادوگر اور بھانت بھانت کے دیو بستے ہیں اور جو کوئی بھی ان کے ملک میں جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا، کم از کم اب تک تو کوئی ایسا نہیں کہ جا کر لوٹ آیا ہو۔ خدا کے لیے تو اپنے عزیزوں کے پاس واپس چلا جا۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جس لڑکی کی تجھے تلاش ہے وہ ان تمام جزیروں کے بادشاہ کی بیٹی ہے پھر بھلا اس تک تیری پہنچ کیوں کر ہو سکتی ہے! بیٹا، میری بات مان لے، خدا ضرور اس کے بدلے تجھے اس سے بہتر دے گا۔ حسن نے کہا اے میرے آقا، میں مرنے سے نہیں ڈرتا اس کی محبت میری جان کے ساتھ ہے۔ میں جزائر واق میں جا کر

اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر رہوں گا اور اگر خدا نے چاہا تو بیوی بچوں کو لے کر لوٹوں گا۔

یہ سن کر شیخ عبدالقدوس نے کہا پھر تو بغیر گئے چارہ نہیں۔ حسن بولا، ہاں، اور تجھ سے میں محض دعا اور مدد چاہتا ہوں تاکہ خدا مجھے بیوی بچوں سے جلد ملا دے۔ یہ کہہ کر وہ اتنا رویا کہ اسے غش آگیا۔ جب اسے ہوش آیا تو شیخ عبدالقدوس نے کہا، بیٹا، تیری ایک ماں ہے اسے اپنی موت کا غم نہ دے۔ حسن نے شیخ سے کہا۔ اے میرے آقا! خدا کی قسم یا تو میں اپنی بیوی کو لے کر لوٹوں گا اور یا جان دے دوں گا۔ اس سے زیادہ مجھ میں کچھ کہنے کی تاب ہے نہ سننے کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شیخ کو یقین ہو گیا کہ اس پر کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوگا۔ اب اس نے وہ خط دے دیا اور اس کے لیے دعا کی۔ اسے سمجھا دیا کہ اسے ایسا کرنا چاہیے اور کہا کہ میں نے تیرے بارے میں ابوالرویش بن بلقیس بنت معین کو تاکید کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ وہ میرا پیر اور استاد ہے۔ تمام جن وانس اس کی اطاعت کرتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اب چار وانہ ہو جا، خدا برکت دے! حسن رخصت ہوا اور اس نے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور وہ بجلی سے تیز اڑنے لگا۔ دس دن تک چلنے کے بعد ایک بہت بڑی کالی سی چیز دکھائی دی جو رات سے بھی زیادہ تاریک تھی اور جس نے پورب سے لے کر پچھم تک روک رکھا تھا۔ جب حسن اس کے پاس پہنچا تو اس کا گھوڑا ہنہنانے لگا۔ اس کے ہنہناتے ہی لاکھوں گھوڑے آپہنچے جن کا گننا ناممکن اور جن سے بچنا محال تھا۔ وہ اپنے جسموں کو اس گھوڑے سے رگڑنے لگے۔ انھیں دیکھ کر حسن ڈرا اور سہم گیا۔ حسن چلا جاتا تھا اور گھوڑے اس کے آس پاس تھے یہاں تک کہ وہ اس غار کے قریب جا پہنچا جس کا ذکر شیخ عبدالقدوس نے کیا تھا۔ وہاں پہنچ کر گھوڑا غار کے دروازے پر ٹھہر گیا اور حسن نے اس پر سے اتر کر لگام زین پر ڈال دی۔ گھوڑا غار کے اندر چلا گیا اور حسن دروازے پر

کھڑا رہا جس طرح کہ شیخ عبدالقدوس نے کہا تھا اور سوچنے لگا کہ آخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو کے بعد دوسری رات

آٹھ سو کے بعد دوسری رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! حسن اسی طرح سے پانچ روز تک دروازے پر کھڑا رہا۔ نہ اسے نیند آئی نہ آنسو رکے اور نہ دل کی گھبراہٹ کم ہوئی، وہ حیران و پریشان تھا۔ اس کے گھر والے، وطن، ساتھی اور دوست سب چھوٹ گئے۔ پھر اسے اپنی ماں یاد آئی اور وہ اپنی مصیبتوں، بیوی بچوں کی جدائی اور اپنی تکلیفوں کو سوچنے لگا۔ اسی حالت میں تھا کہ شیخ ابوالرویش نکل کر اس کے پاس آیا۔ وہ کالا تھا اور اس کے کپڑے بھی کالے تھے۔ حسن اسے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ شیخ عبدالقدوس نے اس کا رنگ روپ بتا دیا تھا۔ حسن خود اٹھ کر اس کے قدموں پر گر پڑا، اپنے رخسار اس کے قدموں سے ملنے لگا۔ اس کا پاؤں اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔ اس نے حسن سے کہا بیٹا! تو کیا چاہتا ہے؟ حسن نے ہاتھ بڑھا کر خط اسے دے دیا اور وہ خط لے کر بغیر جواب دیئے قلعہ کے اندر چلا گیا۔ شیخ عبدالقدوس کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ دروازے پر کھڑا [illegible] رہا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی اور [illegible] بالکل [illegible] آتی تھی۔ ایک رات جب [illegible] اسی حالت میں [illegible] شیخ ابوالرویش نکل کر اس کے پاس آیا۔ اس وقت وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ سے حسن کو اشارہ کیا اندر آ، وہ آگے بڑھا۔ شیخ اس کا ہاتھ پکڑ کر [illegible] اندر لے چلا۔ حسن کا دل اچھلنے لگا، اسے یقین آ گیا

کہ اس کی مُراد بر آئی۔ آدھے دن تک چلنے کے بعد وہ ایک محراب دار دروازے پر پہنچے جس میں فولاد کے کواڑ لگے ہوئے تھے۔ شیخ نے دروازہ کھولا اور حسن کو لے کر ایک دہلیز میں داخل ہوا جس پر سلیمانی پتھر کی ڈاٹ تھی اور سونے کی مینا کاری۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے مرمر کے صحن میں پہنچے جس کے بیچ میں ایک باغ تھا جہاں طرح طرح کے درخت، پھول، پھل تھے، چڑیاں درختوں پر بیٹھی چہک رہی اور زبردست خُدا کی پاکی بیان کر رہی تھیں۔

اس صحن میں آمنے سامنے چار چبوترے تھے اور ہر چبوترے پر ایک ایک بیٹھک، جن میں ایک ایک حوض تھا اور ہر حوض کے ستونوں پر سونے کے شیر بنے ہوئے تھے۔ ہر بیٹھک میں ایک ایک کُرسی پڑی ہوئی تھی جن پر ایک ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ہر ایک کے سامنے بہت سی کتابیں تھیں اور سونے کی انگیٹھیاں جن میں انگارے اور خوشبوئیں، شاگرد کتابیں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ دونوں ان کے پاس پہنچے تو وہ کھڑے ہو گئے۔ شیخ نے آگے بڑھ کر ان سے اشارے سے کہا کہ حاضرین کو چلتا کرو۔ شاگرد چلے گئے تو وہ چاروں اُستاد آکر شیخ ابوالرویش کے آگے بیٹھ گئے اور حسن کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ شیخ نے حسن کی طرف اشارہ کر کے کہا ان لوگوں کو اپنا سارا قصہ اور ماجرا شروع سے لے کر آخر تک سُنا۔ حسن نے رو رو کر انھیں اپنا سارا قصہ سُنا دیا۔ جب حسن سُنا چکا تو سب بوڑھوں نے چلّا کر کہا کہ یہ تو وہی شخص ہے جسے مجوسی نے اونٹ کی کھال میں سی کر گِدھوں کے ذریعے سے جبل السحاب بھیجا تھا۔ حسن بولا ہاں۔ ان سب نے شیخ ابوالرویش سے مخاطب ہو کر کہا اے شیخ! بہرام نے تو اس کے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی۔ پھر یہ پہاڑ پر سے کس طرح نیچے آیا۔ شیخ ابوالرویش نے کہا اے حسن! ان لوگوں سے بیان کر کہ تو نے کیا کیا عجیب باتیں دیکھیں اور کیسے نیچے اُتر آیا۔

حسن نے شروع سے لے کر آخر تک سارا حال انھیں سنایا اور یہ بھی بیان کیا کہ مجوسی پھر کس طرح اس کے پیچھے چڑھا اور کیسے اس نے اسے قتل کیا اور کس صورت سے اس دوسرے شخص کو اس نے بہرام کے پنجے سے چھڑایا اور وہ لڑکی اسے کہاں ملی اور پھر وہ اس کے ساتھ بے وفائی کرکے اور بچوں کو لے کر اڑ گئی اور اسے تکلیف اور مصیبت میں چھوڑ گئی۔ اس کی سرگزشت سن کر حاضرین کو تعجب ہوا اور انھوں نے شیخ کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے شیخوں کے شیخ! خدا کی قسم یہ جوان مصیبت زدہ ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ تو اس کی مدد کرکے اس کے بیوی بچوں کو اس سے ملا دے گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو تیسری رات

آٹھ سو تیسری رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! انھوں نے شیخ ابو الریش سے کہا کہ یہ جوان مصیبت زدہ ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ تو اس کی مدد کرکے اس کے بیوی بچوں کو اس سے ملا دے گا۔ شیخ بولا اے میرے بھائیو! یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے [illegible] کسی کو نہیں دیکھا جو اپنی جان سے تنگ آ چکا ہو۔ تمھیں معلوم ہو کہ وہاں تک پہنچنا آسان کام نہیں اور بغیر اپنی جان پر کھیلے کوئی وہاں تک نہیں پہنچا۔ تم جانتے ہو کہ وہ لوگ بڑے قوی ہیں ان کے پاس بہت بڑا لشکر ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ نہ میں خود ان کی زمین پر قدم رکھوں گا نہ ان کی کسی بات میں مداخلت کروں گا۔ پھر یہ جوان ملک اکبر کی بیٹی تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ کس کی مجال ہے کہ اس لڑکی تک اس کو پہنچائے یا اس معاملے میں اس کی کچھ بھی مدد کر سکے! وہ بولے اے شیخ! یہ شخص

محبت کا مارا ہی، جان پر کھیل کر آیا اور تیرے بھائی عبدالقدوس کا خط لایا ہی، اس لیے اس کی مدد کرنا تجھ پر لازمی ہی۔ اب حسن نے اٹھ کر شیخ ابوالرویش کے قدم پکڑ لیے، اس کا دامن لے کر اپنے سر پر رکھا اور رو رو کر کہنے لگا، خدا کے لیے میری بیوی بچوں کو مجھ سے ملا دے خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اسے روتا دیکھ کر سب حاضرین رونے لگے اور انھوں نے شیخ ابوالرویش سے کہا اس بے چارے کا تو اب غنیمت جان اور اپنے بھائی عبدالقدوس کے طفیل میں اس کے ساتھ بھلائی کر۔ شیخ بولا یہ جوان واقعی بے یار و مددگار ہی اور اسے خبر نہیں کہ اس پر کیا کچھ گزرنے والی ہی لیکن خیر جہاں تک ہو سکے گا ہم اس کی مدد کریں گے۔ یہ سُن کر حسن خوش ہو گیا، اس کے ہاتھ چومے۔ دوسرے کے ہاتھوں پر بھی بوسے دیے اور ان سے مدد کی درخواست کی۔

اب ابوالرویش نے کاغذ اور قلم دوات لے کر ایک خط لکھا اور مہر لگا کر حسن کو دے دیا۔ پھر اسے چمڑے کی ایک تھیلی دے کر جس میں خوش بوئیں اور آگ جلانے کا سامان مثلاً چقماق وغیرہ تھا کہا کہ اس تھیلی کو حفاظت سے رکھیو جب تجھ پر کوئی مصیبت آئے تو تھوڑی سی خوش بو لے کر جلائیو اور میرا نام لیجیو، میں فوراً تیرے پاس آ کر مدد کروں گا۔ بعدازاں اس نے حاضرین میں سے ایک شخص سے کہا کہ اُڑنے والے جنوں میں سے ایک دیو لے آئے۔ دیو حاضر ہوا تو شیخ نے پوچھا تیرا نام کیا ہی؟ اس نے جواب دیا تیرا غلام دہنش بن نقطش ہی۔ ابوالرویش بولا کہ پاس آ، وہ پاس آیا تو شیخ ابوالرویش نے اپنا منھ اس کے کان کے پاس لے جا کر کچھ کہا اور دیو نے اپنا سر ہلایا۔ اب شیخ نے حسن سے کہا کہ بیٹا، اُٹھ کر اس اڑنے والے دیو دہنش پر سوار ہو جا، جب وہ تجھے لے کر آسمان پر پہنچے اور تیرے کان میں فرشتوں کی تسبیح کی آواز پہنچے تو تو تسبیح نہ پڑھیو ورنہ تو بھی

ہلاک ہو جائے گا اور وہ بھی۔ حسن نے کہا کہ میں ہرگز کچھ نہ کہوں گا۔ شیخ نے کہا اے حسن! یہ دیو تجھے لے جا کر کل صبح ایک سفید ملک میں اُتارے گا جو کافور کی طرح صاف ہوگا۔ جب وہ تجھے وہاں اُتار دے تو تنہا روانہ ہو جائیو، دس دن کے بعد تو ایک شہر کے دروازے پر پہنچے گا۔ وہاں پہنچ کر اندر داخل ہو جائیو بادشاہ کا پتا پوچھیو اور اس سے مل کر اُسے سلام کیجیو اور اس کا ہاتھ چومیو اور اسے یہ خط دیجیو وہ جو کچھ اشارے سے کہے اسے سمجھیو۔ حسن نے کہا کہ سر آنکھوں پر اور جا کر دیو کے پاس کھڑا ہو گیا اور سب بزرگوں نے اسے دُعا دی اور دیو سے کہا کہ اس کی نگہبانی کیجیو۔

دیو اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ ایک دن اور ایک رات اُڑتا رہا یہاں تک کہ حسن کو آسمان میں فرشتوں کی تسبیح سنائی دینے لگی۔ دوسرے دن صبح کو دیو نے اسے ایک ملک میں جا اُتارا جو کافور کی طرح سفید تھا اور اُسے وہاں چھوڑ کر لوٹ گیا۔ جب حسن کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ زمین پر ہے اور اس کے ساتھ کوئی اور نہیں تو وہ برابر دس دن اور دس رات چلتا رہا۔ چلتے چلتے ایک شہر کے دروازے پر پہنچا۔ اندر جا کر اس نے بادشاہ کا پتا پوچھا۔ لوگوں نے اس کا پتا بتایا اور کہا کہ اس کا نام ملک حسون ہے، وہ ارض کافور کا بادشاہ ہے اور اس کے پاس اتنا لشکر ہے کہ زمین کی لمبائی اور چوڑائی اس سے بھر جائے۔ حسن نے اندر آنے کی اجازت مانگی بادشاہ نے اجازت دے دی، حسن نے دیکھا کہ وہ بہت بڑا بادشاہ ہے اُس کے آگے زمین چومی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کس ضرورت سے آیا ہے؟ حسن نے خط کو چوم کر اسے دے دیا۔ اس نے خط پڑھا اور تھوڑی دیر تک سر ہلاتا رہا پھر اپنے ایک مصاحب غلام سے کہا کہ اس جوان کو لے جا کر دارالضیافت میں اُتار۔ غلام اسے وہاں لے گیا وہ

تین دن تک کھانے میں مشغول رہا، سوا اس ایک غلام کے اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہی اس سے بات چیت کرتا، اس کا دل بہلاتا، اس کا حال دریافت کرتا اور پوچھتا کہ تو اس ملک میں کس طرح پہنچا اور حسن اس سے بیان کرتا کہ اس پر کیا کیا مصیبتیں گزر چکی ہیں اور اب وہ کن کن بلاؤں میں گرفتار ہے۔

چوتھے روز غلام حسن کو لے کر بادشاہ کے پاس گیا، بادشاہ نے کہا اے حسن تو میرے پاس اس لیے آیا ہے کہ یہاں سے جزائر واق جائے جیسا کہ شیخ الشیوخ نے ہمیں لکھا ہے۔ بیٹا! اگر تو چاہے تو میں تجھے آج ہی روانہ کردوں مگر یہ جان لے کہ راہ میں بے حد مخدوش مقامات ہیں اور بڑے بڑے خطرناک بیابان۔ لیکن صبر کر تیرے لیے بھلائی ہوگی اور خدا نے چاہا تو میں کسی نہ کسی تدبیر سے تجھے تیرے مقصد تک پہنچادوں گا اور بیٹا سن، مدت سے دیلم کا ایک لشکر پڑا ہوا ہے جن کے پاس ہتھیار اور گھوڑے اور جنگی سامان ہے پھر بھی وہ جزائر واق میں داخل نہیں ہو سکتے مگر بیٹا! شیخ الشیوخ ابوالرویش بن بلقیس بنت معین کی خاطر میں تجھے ناکام لوٹا نہیں سکتا۔ عنقریب یہاں جزائر واق سے کشتیاں آئیں گی، ان کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی آگئی تو میں تجھے اس میں بٹھا کر ملاحوں سے تاکید کردوں گا کہ وہ تجھے حفاظت کے ساتھ جزائر واق میں پہنچادیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ تو کون ہے تو کہیو کہ میں ارض کافور کے بادشاہ ملک حسون کا داماد ہوں۔ جب وہ کشتی جزائر واق میں لنگر ڈالے اور ناخدا کہے کہ خشکی پر اتر تو اتر پڑیو۔ خشکی پر ہر طرف تجھے چوکیاں ہی چوکیاں پڑی نظر آئیں گی، ان میں سے ایک کے نیچے جاکر بیٹھ جائیو اور ہلیو نہیں۔ جب رات ہو جائے اور تو دیکھے کہ عورتوں کا لشکر آکر سامان کے ارد گرد جمع ہو گیا ہے تو اس چوکی والی کا دامن پکڑ کر جس کے نیچے تو ہو کہیو کہ مجھے پناہ دے۔ اور بیٹا، سن! اگر اس نے تجھے پناہ

دے دی تو جانیو تیری مُراد بر آئی اور تیری پہنچ تیرے بیوی بچوں تک ہو جائے گی۔
اور اگر اس نے پناہ نہ دی تو اپنی جان کو رو بیٹھیو، زندگی سے ہاتھ دھو ڈالیو اور موت
کا یقین کر لیجیو۔ بیٹا، سُن! تو اپنی جان کو خود خطرے میں ڈال رہا ہے اور میں اس سے
زیادہ تیری مدد نہیں کر سکتا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو چوتھی رات

آٹھ سو چوتھی رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! ملک حسون
نے حسن سے کہا کہ اس سے زیادہ میں تیری مدد نہیں کر سکتا اور بیٹا، یہ بھی سُن رکھ
کہ اگر تجھ پر آسمان کے خُدا کی مہربانی نہ ہوتی تو تو یہاں تک بھی نہ پہنچ سکتا۔
ملک حسون کی یہ باتیں سُن کر حسن رونے لگا اور اتنا رویا کہ اسے غش آ گیا۔ ہوش
آیا تو اس نے بادشاہ کے آگے زمین چومی اور کہا، اے زبردست بادشاہ! کشتیوں کے
آنے میں ابھی کتنا زمانہ باقی ہے؟ اس نے جواب دیا ایک مہینہ، اور ان کا سامان
بکنے میں دو مہینے اور لگیں گے، اس کے بعد وہ اپنے گھروں کو واپس جائیں گے۔
لہٰذا کہیں چھ مہینے کے بعد تجھے سفر کی امید ہو سکتی ہے۔ اب بادشاہ نے حسن سے
کہا کہ دارالضیافت جا اور حکم دیا کہ اس کے لیے شاہانہ انداز سے کھانے پینے اور
پہننے کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس طرح سے وہ ایک مہینے تک دارالضیافت میں
رہا کیا۔ مہینہ گزرنے کے بعد کشتیاں آئیں اور بادشاہ اور تاجر لوگ حسن کو لے کر
کشتیوں کے پاس گئے۔ حسن کی نظر ایک کشتی پر پڑی جس میں ریوڑوں کی طرح اتنے
لوگ بھرے ہوئے تھے کہ اُن کی گنتی محض اس ذات کو معلوم ہو سکتی ہے جس نے
انھیں پیدا کیا ہے۔ یہ کشتی بیچ سمندر میں کھڑی تھی اور اس کے ساتھ کی چھوٹی

چھوٹی کشتیاں سامان لے کر خشکی پر اُترتی جاتی تھیں۔ حسن ان کے پاس کھڑا رہا، یہاں تک کہ کشتی والوں نے سارا سامان اُتار کر خرید و فروخت شروع کر دی اور سفر میں محض تین روز باقی رہ گئے۔

اب بادشاہ نے حسن کو اپنے پاس بلایا اور تمام ضروری چیزیں اس کے لیے مہیا کیں، اُسے بہت کچھ انعام دیا اور اس کشتی کے ناخدا کو بلا کر کہا کہ اس جوان کو اپنے ساتھ کشتی میں لیتا جا مگر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیو اور اسے جزائر واق پہنچا کر وہیں چھوڑ دیجیو، واپس نہ لائیو۔ ناخدا نے کہا، سر آنکھوں پر۔ اس کے بعد اس نے حسن کو یہ مشورہ دیا کہ اپنا حال کشتی والوں سے بالکل نہ کہیو نہ انھیں اپنا قصہ سُنائیو ورنہ تو مارا جائے گا۔ حسن نے بادشاہ کو دعا دی کہ اس کی عمر میں برکت ہو اور اسے حاسدوں اور دشمنوں پر کامیابی ملے۔ بادشاہ نے بھی اسے دعا دی کہ وہ صحیح و سلامت رہے اور اس کی مراد بر آئے۔ یہ کہہ کر اس نے حسن کو ناخدا کے سپرد کر دیا اور ناخدا نے اسے ایک صندوق میں بند کر کے ناؤ پر رکھ دیا اور صندوق کو اس وقت کشتی میں اُتارا جب لوگ اپنا سامان چڑھانے میں مشغول تھے۔ اس کے بعد کشتیاں چل دیں اور برابر دس دن تک چلتی رہیں۔ گیارھویں دن جب کہ وہ خشکی پر پہنچے تو ناخدا نے اسے کشتی سے نکالا۔ کشتی سے اُتر کر اس نے اتنی چوکیاں خشکی پر پڑی دیکھیں جن کا شمار سوا خدا کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ چلتے چلتے حسن ایک چوکی کے پاس پہنچا جو لاجواب تھی اور اس کے نیچے جا کر چھپ گیا۔ جب رات ہوئی تو ٹڈیوں کی طرح بے حد و بے حساب عورتیں آئیں، وہ سب پیدل تھیں اُن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور وہ زرہ بکتر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تجارت کا سامان دیکھ کر عورتیں اس میں مشغول ہو گئیں اور پھر سستاتے

کے لیے چوکیوں پر آ بیٹھیں۔ ان میں سے ایک عورت اسی چوکی پر آ بیٹھی جس کے نیچے حسن چھپا ہوا تھا۔ حسن نے اس کا دامن لے کر اپنے سر پر رکھ لیا اور اس کے آگے گر پڑا اور رو رو کر اس کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ عورت بولی، ای شخص، نکل کر کھڑا ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تجھے دیکھ لے اور مار ڈالے۔

یہ سن کر حسن چوکی کے نیچے سے نکل آیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اس کے ہاتھ چومنے اور کہنے لگا کہ ای میری آقا! میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ رو رو کر کہنے لگا کہ رحم کر اس شخص پر جو اپنے گھر والوں اور بیوی بچوں سے جدا ہو گیا ہے اور ان سے ملنے کے لیے نکلا ہے اور اپنی جان پر کھیل رہا ہے۔ رحم کر میرے حال پر اور یقین کر کہ تجھے اس کے بدلے جنت ملے گی۔ اور اگر تو مجھے اپنی پناہ میں قبول نہیں کرتی تو پردہ پوش خدا کا میں تجھے واسطہ دیتا ہوں کہ میری پردہ پوشی کر۔ جب حسن اس سے یہ باتیں کر رہا تھا تو تاجرات گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جب اس عورت نے حسن کی باتیں سنیں اور اس کی عاجزی دیکھی تو اسے ترس آ گیا، اس کا دل پسیج گیا اور وہ سمجھی کہ وہ ضرور کسی دشوار کام کے لیے اس جگہ آیا ہے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے حسن سے کہا، بیٹا، پریشان نہ ہو اطمینان رکھ پہلے کی طرح چوکی کے نیچے چھپ جا اور کل رات تک چھپا رہ، جو خدا کو منظور ہے ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے حسن کو رخصت کیا اور وہ پہلے کی طرح چوکی کے نیچے چلا گیا۔ لشکر والوں نے عود اور عنبر کی شمعیں جلا کر رات گزاری۔ جب سویرا ہوا تو پھر کشتیاں خشکی پر آ لگیں اور تاجر سامان اتارنے لگے یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ حسن پریشان خاطر اور روتا چوکی کے نیچے چھپا بیٹھا رہا اسے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ نصیب میں اس کے لیے کیا پوشیدہ ہے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ وہی تاجر عورت جس کی پناہ میں حسن تھا آئی اور اسے ایک زرہ، تلوار، سونے کی پیٹی اور نیزہ دے کر

لشکر کے ڈر سے چل دی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر حسن سمجھ گیا کہ تاجر عورت نے اسے یہ چیزیں پہننے ہی کے لیے دی ہوں گی۔ اس نے اٹھ کر زرہ پہنی اور کمر سے پٹی باندھی، بغل کے نیچے تلوار لگائی اور ہاتھ میں نیزہ لے کر چوکی پر آ بیٹھا۔ زبان سے خدا کی یاد کرنے لگا اور اس سے پردہ پوشی کی درخواست کی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔

آٹھ سو پانچویں رات

آٹھ سو پانچویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، حسن نے خدا سے پردہ پوشی کی درخواست کی۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ عورتوں کا لشکر مشعلیں اور فانوس اور شمعیں لیے آ پہنچا۔ حسن اٹھ کر لشکر میں مل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا انھی میں کا ایک ہے۔ جب سویرا ہونے لگا تو حسن ان کے ساتھ ان کے خیموں میں پہنچا۔ وہ سب ایک ایک خیمے میں داخل ہو گئیں، حسن بھی ایک خیمے کے اندر چلا گیا اس نے دیکھا کہ وہ اسی عورت کا خیمہ ہے جس سے اس نے پناہ کی درخواست کی تھی۔ جب وہ عورت اندر آئی تو اس نے اپنے ہتھیار کھول دیے، زرہ اور نقاب اُتار ڈالی۔ حسن نے بھی اپنے ہتھیار اُتار کر رکھ دیے اور یہ دیکھا کہ اس کی ساتھن بُڑھیا ہے، اس کے بال سفید، آنکھیں نیلی اور ناک بڑی ہے، شکل چڑیل کی سی ہے جس سے زیادہ بد صورت ہونا ممکن نہیں، چیچک داغ منھ ہے، بھوں پر بال نہیں دانت ٹوٹے ہوئے، رخسار ڈھلے ہوئے، بال سفید ہیں، ناک سے پانی بہ رہا ہے اور منھ سے رال ٹپک رہی ہے۔ اس کی شکل گنجی قحبہ اور چتکبرے سانپ کی سی ہے۔ حسن کی طرف دیکھ کر بڑھیا کو تعجب ہوا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ آخر یہ شخص یہاں پہنچا کس طرح، کس کشتی میں بیٹھ کر آیا اور کیسے صحیح و سلامت پہنچ

گیا؟ اس کے بعد بڑھیا نے اس کا حال پوچھا اور اس کے آنے پر تعجب کیا۔ حسن اٹھ کر اس کے پاؤں سے اپنا چہرہ ملنے لگا اور اتنا رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے بڑھیا کا دامن اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ کبھی روتا اور کبھی دہائی دیتا۔ اس کی دل سوزی، تمنا، تکلیف اور مصیبت دیکھ کر بڑھیا کا دل کڑھنے لگا۔ اس نے کہا کہ تو میری پناہ میں ہے۔ ڈر نہیں۔ پھر اس نے حسن کا ماجرا پوچھا۔ حسن نے شروع سے لے کر آخر تک کہہ سنایا۔ بڑھیا کو بڑا اچنبھا ہوا، وہ کہنے لگی تو غم نہ کر، خدا نے چاہا تو تیری مراد بر آئے گی۔ یہ سن کر حسن کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے بعد بڑھیا نے لشکر کے سرداروں کو بلا بھیجا۔ یہ مہینے کا آخری دن تھا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو بڑھیا نے ان سے کہا کہ جا کر لشکر کو حکم دو کہ وہ کل صبح سویرے نکلیں اُن میں سے کوئی پیچھے نہ رہے ورنہ جان سے مارا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ سر آنکھوں پر اور باہر جا کر منادی کرا دی کہ سارا لشکر کل سویرے نکلے اور لوٹ کر بڑھیا کو خبر دی۔ حسن سمجھ گیا کہ بڑھیا لشکر کی سردار ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے۔ وہ ان کی حاکم ہے۔ حسن نے تمام دن اپنے ہتھیار نہ کھولے۔ اس بڑھیا کا نام شواہی تھا اور کنیت ام الدواہی۔ احکام صادر کرتے کرتے صبح ہو گئی اور تمام لشکر باہر نکل آیا مگر بڑھیا اندر رہی۔ جب سارا لشکر باہر آ چکا اور بڑھیا اکیلی رہ گئی تو اس نے حسن سے کہا، بیٹا میرے پاس آ۔ حسن قریب جا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا اس کی طرف مخاطب ہو کر بولی، اس کی کیا وجہ ہے کہ تو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہاں آیا ہے؟ تو نے کیوں تلا ہوا ہے؟ اپنا سارا قصہ سچ سچ بتا دے، کوئی بات چھپا نہیں، خوف نہ کر تو میری پناہ میں ہے، میں نے تجھے پناہ دی ہے اور تیرے اوپر ترس کھایا ہے۔ اگر تو مجھ سے سچ سچ کہہ دے گا تو میں تیری مطلب برآری میں مدد کروں گی خواہ اس کے ساتھ جسم و جان کی

تباہی کیوں نہ وابستہ ہو۔ اب چوں کہ تو میرے پاس پہنچ گیا ہے تیرا بال بیکانہ ہوگا اور جزائرِ واق میں کسی کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ تیرے اوپر نظر اٹھا سکے۔

یہ سُن کر حسن نے اپنی تمام سرگزشت شروع سے لے کر آخر تک سُنا دی۔ بیوی اور چڑیوں کا قصہ بھی بیان کیا کہ اس نے اسے کس طرح دس چڑیوں میں سے شکار کر کے اس سے شادی کی پھر اس نے اس کے ساتھ بہت سے دن گزارے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بالآخر اس نے اپنے پروں کے لباس کا پتا لگا لیا اور اپنے بچّوں کو لے کر اُڑ گئی۔ غرض کہ اس نے پہلے روز سے لے کر اس وقت تک کا سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ اس کی باتیں سُن کر بڑھیا نے اپنا سر ہلایا اور کہنے لگی کہ پاک ہے وہ ذات جس نے تجھے صحیح و سلامت رکھا اور یہاں تک لاکر میرے پاس پہنچا دیا۔ اگر تو کسی اور کے ہتّے چڑھتا تو نہ تیری جان بچتی نہ تیرا مقصد حاصل ہوتا لیکن تیری نیت کی سچائی، محبت اور بیوی بچوں کی تمنا تجھے تیرے مقصد تک پہنچا دے گی۔ اگر تو اس پر عاشق اور اس کی تمنا میں بے تاب نہ ہوتا تو اپنی جان پر یہ مصیبتیں نہ جھیلتا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو صحیح و سلامت بچ گیا اور اب ہمارا فرض ہے کہ تیری حاجت پوری ہونے میں تیری مدد کریں اور خدا نے چاہا تو تیری مُراد بر آئے گی۔ لیکن بیٹا حسن! تیری بیوی جزائرِ واق کے ساتویں جزیرے میں ہے اور یہاں سے وہاں تک دن رات چلنے پر سات مہینے کی راہ ہے۔ یہاں سے چل کر ہم پہلے ایک ملک میں پہنچیں گے جس کا نام ارضِ طیور ہے، وہاں چڑیوں کی آواز اور ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اتنی زیادہ ہے کہ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو چھٹی رات

آٹھ سو چھٹی رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! اس ملک میں چڑیوں کی آواز اور ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اتنی ہے کہ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتا۔ اس ملک سے گیارہ دن اور گیارہ رات چلنے کے بعد ہم دوسرے ملک میں پہنچیں گے جس کا نام ارض الوحوش ہے۔ وہاں درندوں، بچھوؤں اور وحشی جانوروں کی چیخم دھاڑ، بھیڑیوں کا شور اور شیروں کی دہاڑیں ایسی ہوں گی کہ ہمیں کچھ سنائی نہ دے گا۔ وہاں سے تین روز چلنے کے بعد ہم ایک اور ملک میں پہنچیں گے جس کا نام ارض الجن ہے۔ اس میں جنات کا شور و غل اور آگ کی لپٹ کی انتہا نہ ہوگی۔ ان کے منہ سے اس قدر انگارے اور دھواں نکلتا ہوگا کہ ہمارا راستہ رک جائے گا اور کان اتنے بہرے ہو جائیں گے اور آنکھیں اس قدر چندھیا جائیں گی کہ نہ ہم سن سکیں گے نہ دیکھ سکیں گے۔ اگر وہاں کسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہلاک ہو جائے گا اور سوار وہاں اپنا منہ تین دن تک زین پر اوندھا کیے چلتا رہے گا۔ اس کے بعد ہمیں ایک بڑا پہاڑ اور ایک بہتا ہوا دریا ملے گا جو جزائر واق سے ملے ہوئے ہیں۔ اور بیٹا سن یہ سارا لشکر باکرہ عورتوں کا ہے اور ہماری حکمراں ایک عورت ہے جو جزائر واق ہی کے ساتوں جزیروں میں سے ہے اور اگر کوئی سوار بہت تیز چلے تو پورے ایک سال میں ان جزیروں کو طے کر سکتا ہے۔ اس دریا کے کنارے ایک اور پہاڑ ہے جس کا نام جبل واق ہے۔ اور اس نام کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ایک درخت پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں آدمیوں کے سروں کی سی ہوتی ہیں اور جب ان پر دھوپ پڑتی ہے تو تمام سر چلانے لگتے ہیں اور ان میں سے واق واق سبحان الملک الخلاق کی آواز نکلتی ہے جب

ہم ان کی آواز سنتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ دھوپ نکل آئی۔ اسی طرح جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو پھر ان سروں میں سے وہی آواز نکلتی ہے کہ واق واق سبحان الملک الخلاق اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ سورج ڈوب رہا ہے، اس وقت کسی مرد کی مجال نہیں کہ ہمارے ہاں ٹھیر سکے یا باہر سے آکر ہمارے ملک میں داخل ہو۔

اس جگہ سے ملکہ تک جو ہم پر حکومت کرتی ہے ایک مہینے کی راہ ہے اس ملک کے تمام باشندے اس ملکہ کی رعیت ہیں۔ علاوہ ان کے اس کی رعیت میں جنوں، دیووں، شیطانوں کے قبیلے بھی ہیں اور اتنے جادوگر جن کی تعداد سوا اس ذات کے جس نے انھیں پیدا کیا کوئی نہیں جان سکتا۔ اگر تجھے اپنی جان کا ڈر لگتا ہو تو میں تجھے کسی کے ساتھ سمندر کے کنارے بھیجے دیتی ہوں اور وہاں ایک شخص کو اپنے ساتھ لاؤں گی جو تجھے کشتی میں بٹھا کر تیرے وطن پہنچا دے گا، اور اگر تیرا دل چاہتا ہے کہ ہمارے ساتھ رہے تو میں تجھے منع نہ کروں گی بلکہ تجھے اپنی آنکھوں میں جگہ دوں گی اور خدا نے چاہا تو تیری مراد بر آئے گی۔ اس نے جواب دیا کہ ای میری آقا! جب تک میری بیوی نہ مل جائے یا میری جان نہ چلی جائے میں تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بڑھیا بولی کہ یہ آسان کام ہے، اطمینان رکھ اور خدا کو منظور ہے تو عنقریب تیرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ میں ضرور ملکہ کو تیرے حال سے مطلع کروں گی تاکہ وہ تیری مطلب برآری میں مدد کر سکے۔ حسن نے اسے دعا دی، اس کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا اور اس کے اس سلوک اور انتہائی مروت کا شکرگزار ہوا اور اپنا انجام سوچتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ اب بڑھیا کے حکم سے کوچ کا نقارہ بجایا گیا لشکر چل کھڑا ہوا اور حسن اپنی فکروں میں غرق بڑھیا کے ساتھ ہو لیا۔ بڑھیا اُسے صبر

اور تسلی دلانے کی کوشش کرتی مگر نہ اسے افاقہ ہوتا اور نہ وہ بڑھیا کی باتوں کی طرف دھیان دیتا۔

چلتے چلتے ساتوں جزیروں میں سے پہلے جزیرے میں پہنچے جو جزیرۃ الطیور تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی حسن کو ایسا معلوم ہوا کہ شور و غل کی وجہ سے دُنیا الٹ پلٹ ہوئی جا رہی ہے۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا، ہوش جاتے رہے اور کان بہرے ہو گئے اور اسے بے حد ڈر لگنے لگا، موت کا یقین آ گیا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر ارض الطیور کا یہ رنگ ہے تو ارض الوحوش کا کیا حال ہوگا! بڑھیا شواہی اس کی یہ کیفیت دیکھ کر ہنسنے لگی اور کہا بیٹا، اگر پہلے ہی جزیرے میں تیرا یہ حال ہے تو باقی جزیروں میں پہنچ کر تیرے اوپر کیا گزرے گی۔ حسن گڑگڑا کر خدا کے آگے دُعا مانگنے لگا کہ خداوندا، جس مصیبت میں تو نے مجھے مبتلا کیا ہے اس میں میری مدد کر اور میری مُراد بر لا۔ غرض کہ ارض الطیور کو طے کر کے وہ ارض الوحوش میں پہنچے اور پھر اس سے گزر کر ارض الجان میں۔ اسے دیکھ کر حسن ڈر گیا اور اس کے ساتھ وہاں جانے پر پشیمان ہوا لیکن خدا سے مدد مانگ کر ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا اور ارض الجان کو طے کر کے دریا پر پہنچ گیا اور لوگوں نے اس اونچے پہاڑ کے نیچے دریا کے کنارے خیمے ڈال دیے۔ بڑھیا نے حسن کے لیے ایک مرمر کی چوکی بچھوا دی جس میں موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے اور دریا کے کنارے سُرخ سونے کی اینٹیں بچھا دیں۔ حسن ان پر بیٹھ گیا اور بڑھیا نے لشکر کو اس کے سامنے سے گزارا، پھر لوگوں نے اس کے ارد گرد خیمے لگائے اور ذرا ستا کر کھایا پیا اور آرام سے سو گئے کیوں کہ اب وہ اپنے وطن میں پہنچ گئے تھے۔ حسن نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی تھی، سوا آنکھوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا

تھا۔ اتنے میں لڑکیاں حسن کے خیمے کے پاس سے ہو کر گزریں اور اپنے کپڑے اُتار کر دریا میں اُتر گئیں، نہانے اور کھیلنے کودنے لگیں، انھیں یہ گمان نہ ہوا کہ کوئی مرد انھیں دیکھ رہا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں وہ کوئی شاہ زادی تھی۔ حسن نے دیکھا کہ ان کے چہرے چاند کی طرح ہیں اور بال جیسے دن پر رات، وہ سب شاہ زادیاں تھیں۔ نہر سے نکل کر وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ چودھویں رات کا چاند۔ لشکر کا لشکر آکر حسن کے آگے جمع ہو گیا کیوں کہ بڑھیا نے منادی کرا دی تھی کہ سب اس کے خیمے کے آگے آکر جمع ہوں اور کپڑے اُتار کر دریا میں اُتریں اور نہائیں تاکہ اگر اُن میں اس کی بیوی ہو تو وہ پہچان لے۔ بڑھیا ایک ایک جماعت کو اس کے سامنے لاتی اور اس سے پوچھتی لیکن وہ کہتا کہ ای میری آقا! وہ ان میں نہیں ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو ساتویں رات

آٹھ سو ساتویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب بڑھیا حسن سے پوچھتی تو وہ یہی کہتا کہ ای میری آقا، وہ ان میں نہیں ہے۔ اب سب کے بعد ایک لڑکی آئی جس کے ساتھ دس خواصیں اور تیس لونڈیاں تھیں، سب باکرہ اور سب کے سینے اُبھرے ہوئے تھے۔ وہ سب اپنے کپڑے اُتار کر لڑکی کے ساتھ دریا کے اندر چلی گئیں اور لڑکی ان کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے اور انھیں پانی میں ڈھکیلنے اور غوطے دینے لگی۔ تھوڑی دیر تک وہ یہی کرتی رہی۔ پھر دریا میں سے نکل کر وہ سب بیٹھ گئیں، لونڈیاں اس کے لیے ریشمی رومال لائیں جن پر سونے کا کام تھا۔ اس نے اپنا بدن پونچھا۔ پھر وہ اس کے لیے جنوں کی کاری گری کے کپڑے

اور گہنے لائیں اس نے انھیں پہنا اور اپنی کنیزوں کو لے کر لشکر کے درمیان ناز و انداز سے پھرنے لگی۔

اُسے دیکھ کر حسن کے ہوش اُڑ گئے اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ یہ اُس چڑیا سے بے حد مشابہ ہی جسے میں نے اپنی بہن لڑکیوں کے محل کے حوض میں دیکھا تھا اور اسی کی طرح یہ بھی اپنی ساتھنوں سے اٹھکھیلیاں کرتی تھی۔ بڑھیا بولی ای حسن! کیا یہ تیری بیوی ہی؟ حسن نے کہا ای میری آقا تیری جان کی قسم یہ میری بیوی نہیں بلکہ اسے تو میں نے آج تک دیکھا بھی نہیں، جتنی عورتوں کو میں نے اس جزیرے میں دیکھا ہی ان میں سے ایک میں بھی وہ قد و اعتدال اور حسن و جمال نہیں پایا جاتا۔ بڑھیا نے کہا اس کی تعریف تو کر اور اس کا سارا حلیہ بتا تاکہ میں دیکھوں کہ وہ کون ہی۔ میں جزائر واق کی ہر لڑکی کو جانتی ہوں کیوں کہ میں لڑکیوں کے لشکر کی سردار اور ان کی حکمراں ہوں۔ اگر تو مجھ سے تفصیل کے ساتھ بیان کرے گا تو میں اُسے پہچان جاؤں گی اور کسی نہ کسی طرح اسے لا دوں گی۔ حسن نے کہا میری بیوی کا چہرہ خوب صورت، قد سڈول اور رخسار چکنے چکنے اور سینہ اُبھرا ہوا، آنکھیں آہی بیتال، پنڈلیاں موٹی موٹی، دانت سفید سفید، زبان میٹھی اور انداز دل فریب ہی گویا وہ جھکی ہوئی ٹہنی ہی، اس کے ہونٹھ گلابی اور پتلے پتلے، آنکھیں سرمگیں ہیں۔ اس کے داہنے رخسار پر ایک تل ہی، اس کا چہرہ گول چاند کی طرح چمکتا ہوا ہی، اس کی کمر پتلی اور کولھے بھاری ہیں، اس کا لعاب بیمار کے لیے شفا ہی گویا وہ کوثر اور سلسبیل ہی۔

بڑھیا بولی کہ کچھ اور تعریف کر، خدا تجھے اس کا شوق زیادہ دے۔ حسن بولا اس کی گردن لمبی، رخسار شمع کی طرح اور منھ عقیق کی انگوٹھی کا سا ہی، اس کے دانت ایسے چمک دار ہیں کہ جام اور صراحی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سن کر

بڑھیا نے تھوڑی دیر کے لیے اپنا سر جھکا لیا اور پھر حسن کی طرف دیکھ کر کہنے لگی، سبحان اللہ! میں بھی تیرے ساتھ مصیبت میں پھنس گئی۔ اے حسن! کاش میں تجھ سے نہ ملی ہوتی! جس عورت کی تو نے تعریف کی ہے جسے تو اپنی بیوی بتاتا ہے وہ تو ملک اکبر کی بڑی بیٹی ہے جو کل جزائر واق کی حکمراں ہے۔ آنکھیں کھول اور اپنے معاملے پر غور کر۔ اگر تو سو رہا ہے تو جاگ جا کیوں کہ اس تک ہرگز تیری پہنچ نہیں ہو سکتی، اور اگر تو وہاں تک پہنچ بھی جائے تو بھی تو اسے پا نہیں سکتا کیوں کہ تجھ میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بیٹا، تو جلدی سے واپس چلا جا ورنہ ہلاک ہو جائے گا اور اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تیری قسمت میں نہیں۔ بڑھیا کو اپنی اور حسن کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس کی باتیں سن کر حسن اتنا رویا کہ اسے غش آ گیا۔ بڑھیا اس کے منہ پر برابر پانی چھڑکتی رہی یہاں تک کہ اسے ہوش آیا مگر بڑھیا کی باتوں سے اسے اتنا رنج و الم ہوا کہ روتے روتے اس کے کپڑے آنسوؤں سے بھیگ گئے اور وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر اس نے بڑھیا سے کہا، اے میری آقا، اب یہاں تک پہنچنے کے بعد میں کیسے واپس جا سکتا ہوں! پھر میرا دل بھی یہ گواہی نہیں دیتا کہ تو میرے مطلب برآری میں ناکام رہے گی، خاص کر جب کہ تو لڑکیوں کے لشکر کی سردار ہے اور ان کی حاکم۔ بڑھیا بولی، بیٹا، خدا کے واسطے تو ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی چن لے اور میں تیری بیوی کے بدلے اسے تیرے حوالے کر دوں گی ورنہ اگر تو بادشاہوں کے شکنجے میں پڑ گیا تو پھر میں کسی تدبیر سے بھی تجھے چھڑا نہیں سکتی۔ خدا کے واسطے تو میرا کہنا مان جا اور کسی دوسری اچھی سے اچھی لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر فوراً اپنے وطن کو چل دے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا غم مجھے اٹھانا پڑے۔ تو نے اپنے آپ کو ایسی بڑی بلا اور ہولناک خطرے میں ڈال رکھا

ہی کہ کوئی تجھے اس سے چھٹکارا نہیں دے سکتا۔ یہ سُن کر حسن نے سر نیچا کر لیا اور
بلک بلک کر رونے لگا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو آٹھویں رات

آٹھ سو آٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! حسن نے
سر نیچا کر لیا اور بلک بلک کر رونے لگا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ بڑھیا
برابر اس کے منھ پر پانی چھڑکتی رہی۔ جب اسے ہوش آیا تو بڑھیا نے اس سے
مخاطب ہو کر کہا اے میرے آقا! اپنے وطن کو لوٹ جا، اگر میں تجھے شہر میں لے گئی
تو تیری بھی جان جائے گی اور میری بھی، کیوں کہ اگر ملکہ کو اس کی خبر ہو گئی تو مجھے بُرا
بھلا کہے گی کہ میں تجھے اس کے ملک میں کیوں لائی، آج تک کوئی آدم زاد اس کے
جزیروں میں نہیں پہنچا ہی۔ وہ مجھے اس جرم میں قتل کر ڈالے گی کہ میں تجھے اپنے
ساتھ لائی اور تجھے ان باکرہ لڑکیوں پر نظر ڈالنے دی جنھیں تو نے دریا میں دیکھا ہی
کیوں کہ ابھی تک نہ کسی غیر مرد نے انھیں چھوا ہی نہ کوئی شوہر ان کے پاس پھٹکا ہی۔
حسن نے قسم کھائی کہ میں نے انھیں بُری نظر سے ہرگز نہیں دیکھا۔ بڑھیا بولی بیٹا
بہتر ہی کہ تو اپنے وطن کو لوٹ جا اور میں تجھے اتنا مال و دولت اور تحفے تحائف
دوں گی کہ تجھے کسی عورت کی پروا نہ رہے گی۔ میرا کہنا مان لے اور جانے میں دیر
نہ کر۔ اپنی جان پر نہ کھیل۔ بس یہی میری نصیحت ہی۔ بڑھیا کی باتیں سُن کر حسن رو
پڑا اور اپنا منھ اس کے قدموں سے رگڑنے لگا اور کہا اے میری آقا! مولی اور
آنکھ کی روشنی! یہ کیسے ہو سکتا ہی کہ میں یہاں تک آ کر بیوی سے ملے بغیر چلا جاؤں
جس کی تمنا میں آیا ہوں! اس وقت میں اپنی بیوی کے شہر کے قریب ہوں اور

اُمید ہے کہ اس کا دیدار جلد نصیب ہو اور ممکن ہے کہ وہ مجھے مل بھی جائے۔ بڑھیا کو اس پر رحم آگیا اور وہ اس کی طرف مخاطب ہو کر اُسے دلاسا دینے اور اس سے کہنے لگی کہ خوش ہو جا اور غم کو اپنے دل سے نکال ڈال، خدا کی قسم میں تیری خاطر اپنی جان لڑا دوں گی، تیری مُراد بر آئے گی یا میری جان جاتی رہے گی۔ یہ سُن کر حسن کی باچھیں کھِل گئیں اور وہ شام تک بیٹھا بڑھیا سے باتیں کرتا رہا۔ جب دن چھپ گیا تو سب لڑکیاں چلی گئیں، بعض اپنے محل میں جو شہر میں تھا اور بعض نے خیموں میں رات بسر کی۔

اب بڑھیا حسن کو ساتھ لے کر شہر میں گئی اور اسے اکیلا ایک مکان میں اُتارا کیوں کہ وہ ڈرتی تھی کہ اگر ملکہ کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ اسے بھی قتل کر ڈالے گی اور اس کے لانے والے کو بھی۔ بڑھیا خود اس کی خدمت کرتی اور اسے ملک اکبر کے دبدبے سے ڈراتی رہتی جو اس کی بیوی کا باپ تھا اور وہ بڑھیا کے آگے رو رو کر کہتا کہ ای میری آقا! میں نے تو اپنے لیے موت پسند کر لی ہے اور دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں، اگر میں اپنے بیوی بچّوں سے نہ مل سکا تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گا، یا تو میں اپنی مُراد پوری کر کے رہوں گا یا جان دے دوں گا۔ بڑھیا سوچ میں پڑ گئی کہ اس کے وصال کی کیا تدبیر نکلے اور اسے اس کی بیوی سے کیوں کر ملایا جائے اور ایسے ضدّی کا کیا علاج ہو جس نے اپنی جان تباہی میں ڈال رکھی ہے کسی ڈرانے دھمکانے پر بھی اپنے مقصد سے باز نہیں آتا اور اپنی جان کی پروا نہیں کرتا۔ مثل ہے کہ عاشق اس شخص کی بات نہیں سُنتا جسے عشق نہ ہو۔ وہ لڑکی اسی جزیرے کی ملکہ تھی جہاں یہ سب آکر اُترے تھے اور اس کا نام نورالہدا تھا۔ اس ملکہ کی سات بہنیں تھیں اور سب کنواری اور اپنے باپ ملک اکبر کے ساتھ رہا کرتیں جو واق کے جزیروں اور ملکوں کا بادشاہ تھا۔ اس

بادشاہ کا پائے تخت اس ملک کا سب سے بڑا شہر تھا جس شہر میں اس وقت حسن تھا اس پر اور اس کے گرد و نواح پر بادشاہ کی بڑی بیٹی نور الہدا کی حکومت تھی۔ جب بڑھیا نے دیکھا کہ حسن اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے تو وہ نور الہدا کے محل میں جاکر اس سے ملی اور اس کے آگے زمین چومی۔ بڑھیا کا اس پر حق تھا کیوں کہ اسی نے بادشاہ کی سب بیٹیوں کی پرورش کی تھی اور سب پر حکم چلاتی تھی۔ اس کی عزت لڑکیاں بھی کرتی تھیں اور بادشاہ بھی۔ جب بڑھیا نور الہدا کے پاس پہنچی تو اس نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر سفر کا حال پوچھا۔ بڑھیا نے کہا اے میری آقا! سفر بڑا مبارک رہا اور میں اپنے ساتھ تیرے لیے ایک ہدیہ لائی ہوں جسے ابھی پیش کروں گی۔ یہ کہہ کر بڑھیا بولی اے میری بیٹی اور دنیا جہان کی ملکہ میں اپنے ساتھ ایک عجیب و غریب چیز لائی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اس سے تجھے مطلع کروں تاکہ اس کی حاجت روا ہو۔ ملکہ نے پوچھا وہ کیا؟ بڑھیا نے حسن کی کہانی شروع سے لے کر آخر تک سنا دی اور ایسا کانپی جیسے آندھی میں بید یہاں تک کہ وہ شہزادی کے آگے گر پڑی اور کہنے لگی اے میری آقا! وہ شخص ایک چوکی کے نیچے چھپا بیٹھا تھا اس نے مجھ سے پناہ کی درخواست کی میں نے اسے پناہ دی اور اس کے ہتھیار لگا کر اس طرح اپنے ساتھ لڑکیوں کے لشکر کے ہمراہ لے کر شہر میں لائی کہ کسی نے اسے پہچانا تک نہیں۔ میں نے اسے تیرے دبدبے سے بہت ڈرایا، تیری قوت اور طاقت اسے جتلائی لیکن جب میں اسے ڈراتی تو وہ روتا اور کہتا کہ بغیر بیوی بچوں کے میرے لیے اور کوئی چارہ نہیں۔ میں یہاں کا ہنگامہ سنا لوٹوں گا نہیں۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر جزائر واق آیا ہے۔ عمر بھر میں نے اس سے زیادہ مضبوط اور قوی دل آدمی نہیں دیکھا

اس کے دل میں بے حد عشق سمایا ہوا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو نویں رات

آٹھ سو نویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، بڑھیا نے ملکہ نور الہدا سے حسن کا قصہ سنا کر کہا، میں نے اس سے زیادہ مضبوط اور قوی دل کسی کو نہیں دیکھا۔ اس کے سوا اس کے دل میں بے حد عشق سمایا ہوا ہے ملکہ نے بڑھیا کی باتیں سنیں اور حسن کا ماجرا تو وہ طیش میں آگئی اور سر نیچا کر لیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے نظر اٹھائی اور بڑھیا کی طرف دیکھ کر کہا اے منحوس بڑھیا! کیا تیری بدذاتی اس حد تک بڑھ گئی کہ تو مردوں کو جزائر واق میں میرے پاس لاتی ہے اور میرے دبدبے سے بالکل نہیں ڈرتی بادشاہ کے سر کی قسم اگر میرے اوپر تیری تربیت کا حق نہ ہوتا اور تیری عزت مجھ پر واجب نہ ہوتی تو میں تجھے اور اسے ابھی بُری طرح قتل کر دیتی تاکہ اے ملعونہ! آنے جانے والے لوگ عبرت پکڑتے اور کوئی ایسا کام نہ کرتا جیسا کہ تو نے کیا ہے اور جس کی جرأت آج تک کسی کو نہیں ہوئی۔ جا اور اُسے فوراً لے آ تاکہ میں اسے دیکھوں۔ بڑھیا اس کے پاس سے فوراً روانہ ہوگئی لیکن حیران تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائے اور دل میں کہہ رہی تھی کہ یہ ساری بلا جو خدا اس ملکہ کے ہاتھ سے میرے اوپر لایا ہے حسن کی وجہ سے ہے۔ جب وہ حسن کے پاس پہنچی تو اس نے کہا کہ چل ملکہ بُلاتی ہیں تیری زندگی کا آخری دن آ پہنچا ہے۔ حسن اٹھ کر اس کے ساتھ چل کھڑا ہوا لیکن اس کی زبان پر برابر خدا کے نام کی تسبیح تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ خداوندا، میرے

اور پر رحم اور مصیبت میں میری مدد کر۔ بڑھیا حسن کو لیے ہوئے ملکہ نورالہدا کے پاس پہنچ گئی، لیکن راہ میں اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ملکہ کے ساتھ کس طرح سے باتیں کرے۔ جب حسن نورالہدا کے سامنے حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ نقاب ڈالے ہوئے ہے، حسن نے اس کے آگے زمین چومی اور سلام کیا۔

ملکہ نے بڑھیا کی طرف اشارہ کیا کہ وہ حسن سے سوال جواب کرے۔ بڑھیا نے حسن سے کہا کہ ملکہ تیرے سلام کا جواب دیتی ہے اور پوچھتی ہے کہ تیرا کیا نام ہے، وطن کہاں ہے اور جن بیوی بچوں کی خاطر تو آیا ہے ان کا کیا نام ہے؟ یہ سن کر اس کا دل مضبوط ہو گیا اور تقدیر نے اس کی مدد کی۔ اس نے جواب دیا اے دنیا جہان کی ملکہ اور سارے زمانے کی یکتا، میرا نام غمگین حسن ہے۔ میرا وطن بصرہ ہے۔ اپنی بیوی کا نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن ایک بیٹے کا نام ناصر اور دوسرے کا منصور ہے۔ اس کا یہ جواب سن کر ملکہ نے کہا کہ وہ کون سی جگہ تھی جہاں سے وہ اپنے بیٹوں کو لے کر اڑ گئی؟ حسن نے کہا اے ملکہ! بغداد میں خلیفہ کے محل سے۔ ملکہ نے پوچھا کہ اس نے اڑتے وقت تم میں سے کسی سے کچھ کہا بھی تھا؟ حسن نے جواب دیا کہ وہ میری ماں سے کہہ گئی ہے کہ جب تیرا بیٹا آئے اور جدائی کی وجہ سے اس کے دن کٹھن ہونے لگیں اور اسے میری ملاقات کی تمنا ہو اور اشتیاق حد سے بڑھ جائے تو وہ میرے پاس جزائر واق آ جائے۔ ملکہ نورالہدا نے اپنا سر ہلایا اور کہا کہ اگر وہ تجھے نہ چاہتی ہوتی اور تیرے ملنے کی تمنا اسے نہ ہوتی تو وہ اپنے مکان کا پتا تجھے نہ بتاتی اور تجھے اپنے وطن نہ بلاتی۔ حسن نے کہا اے بادشاہوں کی سرتاج اور ہر امیر و غریب کی حاکم! ساری باتیں میں نے تجھ سے بیان کر دی ہیں اور کوئی راز باقی نہیں رکھا۔ اب میں خدا سے اور تجھ سے پناہ کی درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر ظلم نہ کر بلکہ رحم کر اور میری وجہ سے اجر و ثواب حاصل کر۔ بیوی بچوں سے ملنے میں میری مدد

کرا اور ان کا دیدار مجھے دکھا دے۔ یہ کہہ کر وہ رونے پیٹنے اور فریاد کرنے لگا۔ ملکہ نورالہدا دیر تک آنکھیں نیچی کیے اپنا سر ہلاتی رہی اور پھر سر اٹھا کر کہنے لگی کہ میں تیرے حال پر رحم کھاتی اور تجھ پر افسوس کرتی ہوں اور میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ اس شہر اور باقی تمام جزیرے کی لڑکیاں تیرے سامنے پیش کروں اور اگر تو نے اپنی بیوی کو پہچان لیا تو اسے تیرے سپرد کر دوں گی اور اگر نہ پہچانا تو تجھے قتل کر کے اسی بڑھیا کے دروازے پر لٹکا دوں گی۔ حسن نے کہا ای ساری دنیا کی ملکہ، تیری یہ شرط مجھے منظور ہے اور سوا خُدا کے اور کسی میں نہ طاقت ہے نہ زور۔

اب ملکہ نورالہدا نے حکم صادر کر دیا کہ شہر کی ہر لڑکی محل میں آکر اس کے سامنے سے گزرے اور بڑھیا شواہی سے کہا کہ تو خود شہر میں جا کر ہر لڑکی کو میرے پاس محل میں لے آ۔ ملکہ لڑکیوں کو سو سو کر کے حسن کے آگے پیش کرتی یہاں تک کہ شہر کی کوئی لڑکی نہ بچی جو حسن کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو لیکن اُن میں کوئی بھی اس کی بیوی نہ نکلی۔ ملکہ نے پوچھا ان لڑکیوں میں تو نے اپنی بیوی کو دیکھا؟ حسن بولا ای ملکہ! تیری جان کی قسم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اس پر ملکہ کا غصّہ اور تیز ہو گیا، اس نے بڑھیا سے کہا کہ محل کے اندر جا کر سب کو نکال لا اور اس کے آگے پیش کر۔ بڑھیا نے سب لڑکیوں کو اس کے سامنے پیش کیا جو محل کے اندر تھیں لیکن حسن کو اپنی بیوی ان میں بھی دکھائی نہ دی اور اس نے ملکہ سے کہا ای ملکہ! تیرے سر کی قسم وہ ان میں بھی نہیں ہے۔ ملکہ غصّے میں بھر گئی اور آس پاس کے لوگوں کو پکار کر کہا کہ اسے پکڑ کر زمین پر گھسیٹو اور اس کی گردن مار دو تاکہ پھر کوئی اپنی جان پر کھیل کر یہاں نہ آئے، ہمارے حال سے آگاہی نہ پائے، ہمارے مُلک میں داخل نہ ہو اور ہمارے جزیروں میں قدم نہ رکھے۔

لوگوں نے اسے منہ کے بل گھسیٹا، اس کا دامن اس کے اوپر ڈال کر اس کی آنکھیں باندھ دیں، تلواریں سونت کر اس کے سر پر کھڑے ہو گئے اور حکم کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں شہوا ہی نے ملکہ کی طرف بڑھ کر زمین چومی، اس کا دامن اپنے سر پر رکھ لیا اور کہنے لگی اے ملکہ! تجھے میری تربیت کی قسم اتنی جلدی نہ کر خاص کر جب کہ تو جانتی ہے کہ یہ بے چارہ پردیسی ہے اور جان پر کھیل کر آیا ہے، اس نے ایسی ایسی مصیبتیں جھیلی ہیں جو کسی نے کبھی نہ بھگتی ہوں گی مگر خدا نے اسے موت سے بچا لیا ہے اور اس کی عمر بڑھائی ہے۔ تیری انصاف پسندی سن کر وہ تیرے ملک اور وطن میں آیا ہے۔ اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو مسافر اس خبر کو لے کر دور دور پہنچا دیں گے کہ تو پردیسیوں سے بغض رکھتی اور انھیں قتل کر ڈالتی ہے۔ اگر اس کی بیوی تیرے شہر میں نہ نکلی تو وہ یوں بھی تیری تلوار کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اول تو جب کبھی تو اسے بلانا چاہے تو میں اسے لا سکتی ہوں۔ دوسرے یہ بھی سمجھ لے کہ یہ شخص تیرے احسان کی امید میں ہے، میں نے اسے پناہ دی ہے کیوں کہ میری تربیت کا حق تیرے اوپر ہے اور میں نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ تو اس کے مقصد تک پہنچا دے گی۔ تیرے انصاف اور مہربانی کا مجھے یقین ہے۔ اگر مجھے تیری طرف سے ان باتوں کا یقین نہ ہوتا تو میں اسے کبھی تیرے شہر میں نہ لاتی۔ پھر مجھے تو کمان تھا کہ تو اسے دیکھ کر خوش ہو گی۔ اس کے اشعار اور باتوں کو پسند کرے گی جو اس نے پیچ پڑے ہوئے ہوتی۔ اور اب تو وہ ہمارے ملک میں آ گیا ہے، اس نے ہمارا کھانا کھایا ہے، ہم پر اس کا حق ہو گیا ہے۔ اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی ......

آٹھ سو دسویں رات

آٹھ سو دسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! بڑھیا نے ملکہ نورالہدا سے کہا کہ ہم پر اس کا حق ہو گیا ہے اور میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اُسے تجھ سے ملاؤں گی۔ تو جانتی ہے کہ جُدائی کتنی کٹھن چیز ہے اور تجھے معلوم ہے کہ جُدائی قاتل ہے خاص کر اولاد کی جُدائی۔ اب عورتوں میں سے سوا تیرے کوئی باقی نہیں رہا، تو بھی اپنا چہرہ اسے دکھا دے۔ ملکہ نے مسکرا کر کہا کہ وہ کہاں سے میرا شوہر ہو سکتا اور مجھ سے اولاد پیدا کر سکتا ہے کہ میں اسے اپنا چہرہ دکھاؤں۔ یہ کہہ کر اس نے حسن کو بلوایا اور جب لوگ اسے لے کر آئے تو اس نے اپنا چہرہ کھول دیا۔ اسے دیکھتے ہی حسن نے زور سے چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑا۔ بڑھیا اسے برابر پیار کرتی رہی یہاں تک کہ اسے ہوش آ گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن ملکہ کو دیکھ کر اس نے پھر اس زور سے چیخ ماری کہ قریب تھا کہ محل گر پڑے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ بڑھیا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور جب اسے ہوش آیا تو بڑھیا نے اس کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ یا تو یہ ملکہ خود میری بیوی ہے یا تمام لوگوں سے زیادہ میری بیوی سے شابہت رکھتی ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو گیارھویں رات

آٹھ سو گیارھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! حسن نے بڑھیا سے کہا کہ یہ ملکہ یا تو میری بیوی ہے یا تمام لوگوں کی نسبت میری بیوی سے

زیادہ مشابہت رکھتی ہو۔ ملکہ نے بڑھیا سے کہا ای ماما، افسوس ہو کہ یہ پردیسی یا تو پاگل ہو یا کوتی فیلیا، کیوں کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہو۔ بڑھیا بولی ای ملکہ وہ معذور ہو اس لیے اس کے کسی فعل کا بُرا نہ مان۔ مثل ہو کہ محبت کا بیمار لا دوا ہوتا ہو اس میں اور دیوانے میں بالکل فرق نہیں ہوتا۔ اب حسن بلک بلک کر رونے لگا اور ملکہ سے کہا کہ خُدا کی قسم تو میری بیوی تو نہیں ہو لیکن میری بیوی سے بے حد مشابہت رکھتی ہو۔ اس پر ملکہ نور الہدیٰ ہنستے ہنستے لوٹ گئی اور کہنے لگی میرے پیارے! تو مجھے خوب دیکھ بھال لے اور میرے سوال کا جواب دے دیوانے پن اور بھولے پن کو جانے دے، تجھے جلد خوشی حاصل ہوگی۔ حسن نے کہا، ای بادشاہوں کی سرتاج اور امیر و غریب کی پناہ! جب میری نظر تجھ پر پڑی تو میں دیوانہ ہو گیا کیوں کہ یا تو تُو خود میری بیوی معلوم ہوتی تھی یا میری بیوی سے بے حد مشابہ۔ اب جو تُو چاہتی ہو پوچھ۔ ملکہ بولی کہ تیری بیوی کس بات میں میرے مشابہ ہو؟ وہ بولا ای میری آقا! تیری تمام چیزیں اُس سے مشابہت رکھتی ہیں مثلاً حُسن و جمال اور خوب روئی، شان و شوکت، سڈول بدن، شیریں کلامی، رخساروں کی سُرخی اور سینے کا اُبھار وغیرہ وغیرہ۔ اب ملکہ نے شواہی ام الدواہی کی طرف مخاطب ہو کر کہا، اُسے پھر تو اپنے گھر لے جا اور خود اس کی خدمت کر۔ میں اس کے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں اور اگر وہ مروّت والا نکلا جو دوستی، صحبت اور محبت کی پاس داری کرتا ہو تو ہم پر واجب ہو کہ اس کی حاجت روائی میں مدد کریں، خاص کر اس وجہ سے کہ وہ ہمارے مُلک میں آیا ہو اور ہمارا کھانا کھایا ہو۔ علاوہ بریں اس نے سفر کی مصیبتیں اٹھائی ہیں اور خطرے جھیلے ہیں۔ لیکن اسے اپنے گھر پہنچا کر نوکروں کے حوالے کر دیجیو اور جلدی سے میرے پاس لوٹ آئیو، خُدا نے چاہا تو اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی ہو۔

یہ سن کر بڑھیا نے حسن کو ساتھ لیا اور گھر پہنچ کر اپنی کنیزوں، غلاموں اور نوکروں چاکروں کو حکم دیا کہ اس کی خدمت کریں اور جس چیز کی اُسے ضرورت ہو مہیّا کریں اور اس کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اس کے بعد وہ فوراً ملکہ کے پاس پہنچی۔ ملکہ نے حکم دیا کہ وہ فوراً ہتھیار لگائے اور بہادروں میں سے ایک ہزار سوار چن لے۔ بڑھیا شواہی نے حکم کی تعمیل کی اور زرہ بکتر پہن کر ایک ہزار سوار لے آئی۔ جب اس نے ملکہ کے پاس آکر خبر دی کہ میں ایک ہزار سوار لے کر آئی ہوں تو ملکہ نے حکم دیا کہ میرے باپ ملک اکبر کے شہر میں جا اور وہاں پہنچ کر اس کی بیٹی منارالسنا کے ہاں اُتر جو میری سب سے چھوٹی بہن ہے اور اس سے کہیو کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو وہ زرہیں پہنا کر جو اس نے ان کے لیے بنائی ہیں اپنی خالہ کے پاس بھیج دے کیوں کہ اس کا جی انھیں دیکھنے کو چاہتا ہے، اور اے بڑھیا میں تجھے مشورہ دیتی ہوں کہ حسن کا نام ہرگز نہ لیجیو بلکہ تو انھیں لے چکے تو میری بہن سے کہیو کہ وہ بھی آکر مجھ سے مل جائے۔ جب وہ اپنے دونوں بیٹے تجھے دے دے اور تو انھیں لے کر میری طرف روانہ ہو تو انھیں بہت جلد لے کر یہاں آجائیو اور ان کی ماں کو اطمینان سے تیاری کرنے دیجیو اور جس راہ سے تو گئی ہو اس سے نہ لوٹیو۔ دن رات سفر کیجیو اور اس راز کو کسی سے نہ کہیو۔ اس کے بعد میں ہر طرح کی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ اگر میری بہن اس کی بیوی نکلی اور یہ ثابت ہو گیا کہ اس کے دونوں بیٹے حسن کے بیٹے ہیں تو میں ہرگز اسے اس بات سے نہ روکوں گی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلی جائے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو بارھویں رات

آٹھ سو بارھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ ملکہ نے کہا اگر وہ اس کی بیوی نکلی تو میں ہرگز اسے اس بات سے نہ روکوں گی کہ وہ اسے مل جائے بلکہ اس کی مدد کروں گی کہ وہ اسے لے کر اپنے وطن چلا جائے۔ بڑھیا سمجھی کہ وہ سچ کہتی ہے اور اس کی اسے خبر نہ تھی کہ اس کے دل میں کیا کھوٹ ہے۔ اس چاتر نے اپنے دل میں یہ بات چھپا رکھی تھی کہ اگر وہ اس کی بیوی نہ ہوگی اور بچے اس کے مشابہ نہ ہوں گے تو وہ اسے قتل کر دے گی۔ اس کے بعد ملکہ نے بڑھیا سے کہا، اگر میرا دل سچ کہتا ہے تو اس کی بیوی میری بہن منار السنا ہے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ میری بہن کی تعریف ہے اور جو جو خوبصورتی اور خوب روئی اس نے بیان کی ہے وہ سوا میری بہنوں کے اور کسی میں پائی نہیں جاتی خاص کر سب سے چھوٹی بہن میں۔ بڑھیا نے اس کا ہاتھ چوما اور حسن کے پاس جا کر جو کچھ ملکہ نے کہا تھا بیان کر دیا۔ مارے خوشی کے حسن دیوانہ سا ہو گیا اور اٹھ کر بڑھیا کا سر چومنے لگا۔ بڑھیا بولی بیٹا! میرے سر کو نہ چوم بلکہ میرے منھ کو، اور اس بوسے کو اپنی سلامتی کا صدقہ سمجھ، خوش ہو اور غم کو اپنے دل میں نہ آنے دے اور میرا منھ چومنے سے کراہیت نہ کر کیوں کہ تیرے ملاپ کا سبب میں ہی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اس سے رخصت ہوئی اور ہتھیار لگا ایک ہزار مسلح سواروں کو لے اس جزیرے کو روانہ ہو گئی جہاں ملکہ کی بہن تھی۔ نور الہدا اور اس کی بہن کے شہر میں تین دن کی راہ تھی۔

شہر میں پہنچ کر شواہی ملکہ کی بہن منار السنا کے پاس گئی اسے سلام کر کے اس کی بہن نور الہدا کا سلام پہنچایا اور اس سے کہا کہ تیری بہن تجھے اور تیرے

بچوں کے دیکھنے کی مشتاق ہے اور تیری ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ شہزادی منار السنا نے کہا، میری بہن کا مجھ پر حق ہے اور میں اس سے نہ ملنے کی قصوروار ہوں، اب ضرور جاکر اس سے ملوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ خیمے شہر کے باہر نکالے جائیں اور اپنے ساتھ اپنی بہن کے لیے تحفے اور ہدیے لیے۔ جب اس کے باپ بادشاہ نے محل کی کھڑکیوں میں سے دیکھا کہ خیمے لگے ہوئے ہیں تو اس نے اس کا سبب دریافت کیا۔ لوگوں نے کہا کہ شہزادی منار السنا اپنی بہن نور الہدا کی ملاقات کے لیے جانا چاہتی ہے۔ یہ سن کر بادشاہ نے اس کے لیے ایک لشکر تیار کرا دیا جو اسے اس کی بہن کے پاس پہنچا آئے اور اپنے خزانوں میں سے اتنا مال، کھانے پینے کی چیزیں ایسے ایسے تحفے تحائف اور جواہرات نکال کر دیے کہ زبان اس کی تعریف نہیں کر سکتی۔ سوا چھوٹی کے بادشاہ کی چھوں بیٹیاں سگی بہنیں تھیں، بڑی بہن کا نام نور الہدا تھا، دوسری کا نجم الصباح، تیسری کا شمس الضحیٰ، چوتھی کا شجرۃ الدر، پانچویں کا قوت القلوب، چھٹی کا شرف البنات، اور ساتویں کا منار السنا۔ یہ سب سے چھوٹی، یہی حسن کی بیوی اور محض باپ کی طرف سے ان کی بہن تھی۔ بڑھیا نے بڑھ کر منار السنا کے آگے زمین چومی، منار السنا نے پوچھا، کیا تجھے کوئی ضرورت پیش آئی ہے؟ بڑھیا نے جواب دیا، تیری بہن نور الہدا نے تجھے یہ پیغام دیا ہے کہ اپنے دونوں بیٹوں کے کپڑے بدل کر انھیں وہ زرہیں پہنا دے جو تو نے ان کے لیے بنائی ہیں اور انھیں میرے ساتھ روانہ کر دے۔ میں انھیں لے کر آگے آگے چلوں گی اور جاکر نور الہدا کو تیرے آنے کی خوش خبری دوں گی۔ یہ سن کر منار السنا نے سر جھکا لیا، اس کا رنگ بدل گیا اور بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے سر کو ہلایا اور بڑھیا کی طرف دیکھ کر کہا، بڑی بی، اپنے بیٹوں کا نام سن کر میرا دل کانپ رہا اور گھبرا رہا ہے کیوں کہ جب سے

وہ پیدا ہوئے ہیں نہ کسی جن نے انھیں دیکھا ہی نہ کسی بشر نے، نہ عورت نے نہ مرد نے بلکہ میں انھیں ہوا بھی لگنے نہیں دیتی۔ بڑھیا نے کہا اے میری آقا! یہ تو کیسی باتیں کرتی ہے؟ کیا تو ان کے بارے میں اپنی بہن سے بھی ڈرتی ہے؟ اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی اور اس نے وہ کہانی بند کردی جس کی اسے اجازت ملی تھی۔

آٹھ سو تیرھویں رات

آٹھ سو تیرھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! بڑھیا بولی اے میری آقا! خدا تیری عقل ٹھکانے رکھے! کیا تو ان کے بارے میں اپنی بہن سے بھی ڈرتی ہے؟ اس بات میں تیری مخالفت نہیں چل سکتی کیوں کہ وہ تجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ لیکن اے میری آقا! تیرے بچے چھوٹے ہیں اور ان کے بارے میں تیرا ڈرنا بجا ہے، محبت کرنے والا ہمیشہ بدگمان ہوتا ہے۔ مگر بیٹی، تو جانتی ہے کہ میں تجھے اور تیرے بچوں کو کتنا چاہتی ہوں، میں نے تجھے بھی پالا ہے اور ان کو بھی، میں خود اپنے ساتھ انھیں لے کر جاؤں گی، اپنی آنکھیں ان کے لیے بچھاؤں گی اور اپنا دل کھول کر اس کے اندر انھیں جگہ دوں گی، ان باتوں میں تیری تاکید کی ضرورت نہیں۔ تو ڈر نہیں، اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھ اور انھیں ان کی خالہ کے پاس جانے دے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارا ایک یا دو دن کا آگا پیچھا ہوگا غرض کہ اس نے اتنی خوشامد کی کہ لڑکی کا دل نرم ہوگیا۔ وہ اپنی بہن کے غصّے سے ڈرتی بھی تھی لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ غیب میں اس کے لیے کیا پوشیدہ ہے، اس لیے وہ بچوں کو بڑھیا کے ساتھ بھیجنے پر راضی ہوگئی اور بچوں کو بلوا کر انھیں گرم پانی سے نہلایا، ان کا بناؤ سنگار کیا، کپڑے بدلے اور زرہیں پہنا کر بڑھیا کے حوالے

کر دیا ۔ بڑھیا انھیں لے کر اڑی اور جیسا کہ ملکہ نورالہدا نے اس سے کہا تھا اس راستے سے نہ آئی جس سے ان کی ماں آنے والی تھی ۔ وہ بہت تیز روانہ ہوئی کیوں کہ وہ ان کے بارے میں ڈرتی تھی، یہاں تک کہ وہ نورالہدا کے شہر میں پہنچی اور دریا پار کر کے اس کے پاس جا اتری اور بچوں کو اس کے سامنے پیش کر دیا ۔ ملکہ انھیں دیکھ کر خوش ہو گئی ۔ انھیں لپٹایا چپٹایا، گلے لگایا اور ایک کو دائیں ران پر اور دوسرے کو بائیں پر بٹھایا ۔ اس کے بعد اس نے بڑھیا سے کہا اب حسن کو بلا، میں اس سے وعدہ کر چکی اور اپنی تلوار سے اسے پناہ دے چکی ہوں ۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اس نے ہمارے گھر میں آکر پناہ لی ہے، اگرچہ ابھی تک یہ یقین نہیں ہے کہ وہ موت کا جام پینے سے بچ گیا ہے اور شہرزاد کو صبح ہو تی ......

آٹھ سو چودھویں رات

آٹھ سو چودھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، ملکہ نورالہدا نے بڑھیا سے کہا کہ ابھی تک اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حسن کی جان بچ گئی تو بڑھیا بولی کہ جب میں حسن کو تیرے پاس لاؤں گی تو کیا تو اسے ان سے ملا دے گی ؟ اور اگر یہ معلوم ہوا کہ وہ اس کی اولاد نہیں ہے تو اسے اس کے وطن واپس بھیج دے گی ۔ یہ سن کر ملکہ کو طیش آ گیا ۔ وہ کہنے لگی اے منحوس بڑھیا، کب تک اس پردیسی کے بارے میں تو چالبازیاں کرتی رہے گی جو ہمارے ملک میں زبردستی گھس آیا ہے، ہماری پردہ دری کرتا ہے اور ہمارے حالات سے واقف ہو گیا ہے ۔ کیا تیرا خیال ہے کہ وہ ہمارے ملک میں آئے، ہمارے چہرے دیکھے، ہماری عزت پر دھبا لگائے اور پھر اپنے ملک کو صحیح وسالم چلا جائے، وہاں جا کر اپنے لوگوں میں ہماری فضیحت کرے، ساری دنیا

کے بادشاہوں میں ہمارا ڈھنڈورا پٹ جائے اور ناجر ہماری خبریں ہر جگہ پہنچائیں اور کہیں
کہ ایک انسان جادوگروں اور کاہنوں کے ملک سے گزر کر ارضِ جان اور ارض وحوش و
طیور سے ہو کر جزائر واق گیا اور صحیح و سالم لوٹ آیا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! قسم ہے آسمان
کے پیدا کرنے اور اس کے بنانے والے کی اور زمین کے بچھانے اور برابر کرنے والے
کی، مخلوق کے پیدا کرنے اور گننے والے کی کہ اگر وہ اس کے بچے نہ ہوئے تو میں اُسے
قتل کر دوں گی اور خود اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اُڑا دوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے بڑھیا
کو اس زور سے ڈانٹا کہ وہ مارے ڈر کے گر پڑی۔ ملکہ نے حاجب اور بیس غلاموں
کو اس پر مسلط کر دیا اور ان سے کہا کہ اس بڑھیا کے ساتھ جا کر فوراً اس جوان کو لے آؤ
جو اس کے گھر میں ہے۔ وہ لوگ گھسیٹتے ہوئے اُسے لے گئے، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا
اور اُس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

جب وہ گھر پہنچ کر حسن کے پاس گئی تو حسن نے اُٹھ کر اس کے ہاتھ چومے، اسے
سلام کیا۔ لیکن بڑھیا نے سلام کا جواب دینے کے بدلے اس سے کہا کہ ملکہ کے پاس چل۔
میں نے تجھ سے کہا نہ تھا کہ اپنے وطن کو لوٹ جا اور ان تمام باتوں سے روکا نہ تھا! لیکن
تو نے میرا کہنا نہ مانا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تجھے اس قدر مال و دولت دوں گی جتنی
کسی کے پاس نہ ہو۔ مگر تو نے نہ مانا بلکہ سُنا تک نہیں، میری مخالفت کی، مجھے اور اپنے
آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ اب جیسی کرنی ویسی بھرنی، موت قریب آ چکی ہے، چل کر
اس ظالم اور بد ذات عورت سے باتیں کر۔ حسن رنجیدہ اور شکستہ دل ہو کر مارے ڈر
کے اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے بچانے والے خدا! مجھ کو بچا، خدا وندا! جو امتحان
تو میرا لے رہا ہے اس میں مہربانی سے پیش آئیو، اور اے سب سے بڑے رحم کرنے والے!
مجھے بچائیو۔ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا آخر غلاموں، حاجب اور بڑھیا کے
ساتھ چل کھڑا ہوا۔ جب لوگ اسے لے کر ملکہ کے پاس پہنچے تو اس نے دیکھا کہ

اس کے دونوں بیٹے ناصر اور منصور اس کی گود میں بیٹھے ہوے ہیں اور وہ ان کے ساتھ کھیل رہی اور انھیں پیار کر رہی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی حسن پہچان گیا اور اتنی خوشی ہوئی کہ زور سے چیخ مار کر زمین پر گر پڑا اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو پندرھویں رات

آٹھ سو پندرھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، حسن چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو پہچان لیا اور وہ بھی باپ کو پہچان گئے تو ان کی فطری محبت جوش میں آئی۔ وہ ملکہ کی گود سے نکل حسن کے پاس آ کھڑے ہوے اور خدا نے ان کی زبان سے یہ لفظ نکلوا دیے کہ "ای ہمارے باپ"! بڑھیا اور تمام حاضرین کو ان پر اتنا ترس آیا کہ سب رونے لگے اور کہا شکر ہی خدا کا کہ اس نے انھیں باپ سے ملا دیا۔ غشی دور ہونے کے بعد حسن نے اپنے بیٹوں کو گلے سے لگا لیا اور اتنا رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ملکہ کو یقین ہو گیا کہ بچے حسن کی اولاد ہیں اور اس کی بہن منار السنا اس کی بیوی ہی جس کی تلاش میں وہ آیا ہی تو اسے اپنی بہن پر اتنا غصہ آیا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . .

آٹھ سو سولھویں رات

آٹھ سو سولھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، ملکہ اپنی بہن پر اتنی ناراض ہوئی کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور حسن کو اس زور سے ڈانٹا کہ وہ تھرا اٹھا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ لوگ اسے منھ کے

بل گھسیٹ کر باہر ڈال آئے ہیں۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چلنے لگا مگر اسے یقین نہ آتا
تھا کہ میں ملکہ کی ایذا رسانی سے بچ جاؤں گا۔ اس پر بڑھیا شواہی کو بھی بڑا افسوس
ہوا لیکن ملکہ کے غصّے کے ڈر سے وہ حسن کے بارے میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔
جب حسن محل سے نکلا تو وہ حیران پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے
اور کہاں جائے۔ زمین باوجود اتنی وسعت کے اسے تنگ معلوم ہوتی تھی۔ نہ کوئی
باتیں کرنے والا اسے ملتا تھا نہ دل بہلانے والا نہ تسلی دینے والا نہ راستہ بتانے والا
اور نہ کوئی ایسا شخص جس کے پاس جاکر وہ پناہ لے۔ اُسے موت سامنے کھڑی دکھائی
دیتی تھی کیوں کہ نہ اُس میں چلنے کی طاقت تھی نہ کوئی اس کا ہم سفر تھا نہ اسے راستہ معلوم
تھا نہ وہ وادیِ جنات، ارض وحوش اور جزائرِ طیور سے گزر سکتا تھا۔ وہ اپنی جان سے
ہاتھ دھو بیٹھا اور اتنا رویا کہ غش آگیا۔ ہوش آیا تو وہ اپنے بیٹوں اور اپنی بیوی کی فکر
میں پڑ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ اب وہ اپنی بہن کے پاس آئے گی اور نہ معلوم بہن
اس کی کیا گت بنائے گی۔ یہ سوچ کر وہ پشیمان ہوا کہ میں کیوں اس مُلک میں آیا، سمجھانے
سے بھی کچھ نہ سمجھا۔ تاہم وہ برابر چلا گیا یہاں تک کہ شہر کے باہر دریا کے کنارے پہنچ
گیا۔ حیران پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُدھر اس کی بیوی منار السنا کے ساتھ یہ
پیش آیا کہ بڑھیا کے چلے آنے کے دُوسرے روز جب کہ وہ سفر کرنے والی تھی اس کے
باپ بادشاہ کا حاجب اس کے پاس آیا اور اس کے آگے زمین چومی، اور شہرزاد
کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو سترھویں رات

آٹھ سو سترھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، منار السنا

روانہ ہونے ہی والی تھی کہ اس کے باپ بادشاہ کا حاجب اس کے پاس آیا اور زمین چوم کر کہنے لگا اے شاہزادی! تیرے باپ ملک اکبر نے سلام بھیجا اور تجھے بلایا ہے۔ شاہزادی فوراً اٹھ کر حاجب کے ساتھ چل کھڑی ہوئی تاکہ دیکھے کہ اس کا باپ کیا چاہتا ہے جب اس کے باپ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اسے اپنے پاس تخت پر بٹھالیا اور کہا بیٹی، سُن، میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے جس کی وجہ سے مجھے تیرے بارے میں ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس سفر میں تجھے کسی بڑی مصیبت کا سامنا نہ پڑے۔ بیٹی بولی کہ ابا، تو نے کیا خواب دیکھا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ خواب میں میں ایک خزانے کے اندر داخل ہوا، دیکھا کہ اس میں بہت مال و دولت اور بے شمار ہیرے جواہرات ہیں مگر ان تمام مال و دولت اور ہیروں میں سے مجھے محض سات ہیرے پسند آئے جو سب سے زیادہ خوب صورت تھے، میں نے ان میں سے ایک کو چھانٹ کر لے لیا جو سب سے چھوٹا اور خوب صورت اور چمک دار تھا، اس کی خوب صورتی مجھے اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ میں اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر خزانے سے نکل آیا۔ دروازے کے باہر آکر میں نے اپنا ہاتھ کھولا اور ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، اتنے میں ایک اجنبی چڑیا جو ہمارے ملک کی چڑیوں میں سے نہ تھی بلکہ کسی دور کے ملک سے آئی تھی آسمان سے میرے اوپر گری اور میرے ہاتھ سے وہ ہیرا جھپٹ لیا اور جہاں سے آئی تھی چلی گئی۔ مجھے بہت رنج و افسوس ہوا اور اتنا ڈر لگا کہ میری نیند اُچٹ گئی اور میں اس ہیرے پر افسوس کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

نیند سے اٹھ کر میں نے تعبیر دینے والوں کو بلوایا اور ان کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ تیری سات بیٹیوں میں سے سب سے چھوٹی کھو جائے گی اور کوئی شخص اسے جبراً تیری مرضی بغیر لے جائے گا۔ بیٹی، تو میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے سب سے زیادہ پیاری اور عزیز۔ تو اپنی بہن کے پاس جا رہی ہے، معلوم

نہیں وہاں تجھ پر کیا گزرے، بہتر ہے کہ سفر سے باز آ اور اپنے محل میں لوٹ جا۔ باپ کی باتیں سن کر منار السنا کا دل دھڑکنے لگا اور اپنے بیٹوں کے خیال میں ڈوب گئی سر نیچا کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور کہنے لگی ای بادشاہ! ملکہ نور الہدا نے میری دعوت کی تیاری کی ہے اور وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ چار سال سے اس نے مجھے نہیں دیکھا، اگر اب میں اس سے ملنے نہ گئی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کے پاس ایک مہینہ ٹھیر کر لوٹ آؤں گی۔ ایسا کون ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے ملک میں آ کر جزائر واق تک پہنچ سکے اور یہ کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ ارض بیضا، جبل اسود، جزیرہ کافور اور قلعہ طیور تک پہنچ جائے۔ وادی طیور پھر وادی وحوش پھر وادی جنات طے کر کے ہمارے جزیروں میں قدم رکھے! اور اگر کوئی پردیسی ملک میں داخل بھی ہو جائے تو وہ خوفناک سمندروں میں ڈوب جائے گا۔ لہذا میرے سفر کے متعلق بالکل پریشان نہ ہو، کسی کی مجال نہیں کہ ہمارے ملک میں قدم رکھ سکے۔ غرض کہ وہ برابر باپ کو مناتی رہی یہاں تک کہ اس نے سفر کی اجازت دے دی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی......

آٹھ سو اٹھارھویں رات

آٹھ سو اٹھارھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک تبار بادشاہ! وہ برابر باپ کو مناتی رہی یہاں تک کہ اس نے سفر کی اجازت دے دی اور ایک ہزار سواروں کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ جائیں اور اُسے دریا تک پہنچا کر وہیں ٹھیرے رہیں۔ جب وہ اپنی بہن سے مل کر لوٹے تو پھر اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ بیٹی سے اس نے یہ بھی کہا کہ اپنی بہن کے پاس دو دن ٹھیر کر فوراً لوٹ آئیو۔ اس نے جواب دیا کہ سر

آنکھوں سے۔ اب وہ اُٹھ کر باہر آئی اور باپ اس کے ساتھ باہر آکر اس سے رخصت ہوا۔ باپ کی باتوں کا اس پر یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے بیٹوں کے متعلق ڈرنے لگی مگر تقدیر کے آگے کوئی خبرداری نہیں چلتی۔ تین دن رات تیز تیز چلنے کے بعد وہ دریا کے پاس پہنچی اور اس کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ وہاں سے وہ چند غلاموں، نوکروں اور وزیروں کو لے کر دریا پار اُتری اور ملکہ نورالہدا کے شہر میں پہنچ کر محل کے اندر گئی دیکھا کہ اس کے بیٹے خالہ کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں اور ابا! ابا! چلا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کے آنسو نکل پڑے اور وہ رونے لگی، اپنے بیٹوں کو چھاتی سے لگا لیا اور ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے باپ کو دیکھا ہے۔ خدا اس گھڑی کا ستیا ناس کرے جب میں اس سے جدا ہوئی! اگر مجھے معلوم ہو کہ وہ ابھی تک دنیا میں ہے تو میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی۔ بچوں کو روتا دیکھ کر اور اپنا اور اپنے شوہر کا خیال کر کے وہ آہ و زاری کرنے لگی۔ جب اس کی بہن نے دیکھا کہ اس نے اپنے بچوں کو لپٹا لیا ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں نے اپنے اور اپنے بیٹوں کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے اور اپنا گھر برباد کیا ہے تو وہ بے اسے سلام کیے کہنے لگی، تیری یہ اولاد کہاں سے آئی؟ کیا تو نے بغیر باپ کو خبر کیے نکاح کیا؟ اگر تو نے زنا کیا ہے تو تجھے اس کی سزا ملنی چاہیے اور اگر تو نے ہم سے چھپا کر نکاح کیا ہے تو پھر تو اپنے شوہر کو کیوں چھوڑ کر اپنے بچوں کو لے آئی اور ان میں اور ان کے باپ میں جدائی ڈال کر ہمارے ملک میں چلی آئی؟ اور شہرزاد کو صبح ہوتی.....

آٹھ سو انیسویں رات

آٹھ سو انیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، ملکہ نورالہدا

نے اپنی بہن منار السنا سے کہا اگر تو نے ہم سے چھپا کر نکاح کیا ہو تو پھر تو کیوں اپنے شوہر
کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو لے آئی اور ان میں اور ان کے باپ میں جدائی ڈالی اور اپنے
بچوں کو ہم سے چھپائے رکھا؟ کیا تیرا گمان تھا کہ ہمیں اس کی خبر نہ ہوگی۔ غیب داں خدا نے
ہمارے اوپر تیری باتیں ظاہر کر دیں، تیرا حال کھول دیا اور تیرے راز فاش کر دیے۔
پھر اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ، جب وہ پکڑ کر لائے تو ملکہ
نے اس کی مشکیں باندھ کر اس کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دیں، اتنا مارا کہ اس کا
بدن پھٹ گیا اور اس کے بال پکڑ کر کھینچا اور قید خانے میں بند کر دیا اور اپنے باپ
ملک اکبر کو خط لکھا جس میں منار السنا کا حال بیان کیا کہ ہمارے ملک میں ایک انسان
آیا ہو، میری بہن منار السنا کہتی ہو کہ وہ اس کا شوہر ہو جس سے اس کے دو بیٹے
پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں اس نے ہم سب سے اور خاص کر تجھ سے چھپا کر رکھا تھا۔
جب تک وہ شخص یہاں نہ آیا بہن کے منھ سے ایک بات تک نہیں نکلی۔ وہ شخص
انسانوں میں سے ہو اس کا نام حسن ہو وہ کہتا ہو کہ اس نے اس سے شادی کی ہو اور
وہ بہت دنوں تک اس کے ساتھ رہی ہو پھر اپنے بیٹوں کو لے کر یہ کہے چل دی
اور چلتے وقت اس کی ماں سے کہتی آئی کہ اپنے بیٹے سے کہہ دیجیو کہ اگر اسے میری
تمنا ہو تو جزائر واق آ جائے۔ اس شخص کو ہم نے پکڑ کر رکھ لیا اور بہن کے پاس
بڑھیا شواہی کو بھیجا کہ وہ جا کر اسے اور اس کے بیٹوں کو لے آئے۔ اب وہ یہاں
آ گئی ہو۔ میں نے بڑھیا کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ بچوں کو لے کر آگے چلی آئے تاکہ وہ اس
سے پہلے یہاں پہنچ جائیں۔ بڑھیا بچوں کو لے کر یہاں آئی تو میں نے اس شخص کو
بلوایا جو اس کے شوہر ہونے کا دعوا کرتا ہو۔ جب وہ میرے پاس پہنچا اور اس نے
بچوں کو دیکھا تو انھیں پہچان لیا، بچے بھی اسے پہچان گئے جس سے مجھے یقین ہو گیا
کہ وہ بچے اس کے بیٹے ہیں وہ اس کی بیوی ہو اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سچ کہتا ہو

اور اس کی طرف سے کوئی بُری بات نہیں ہوئی بلکہ ساری بُرائی اور عیب میری بہن کا ہے۔ میں ڈری کہ کہیں جزیرے والوں کے آگے ہماری بے عزتی نہ ہو جائے اس لیے جب یہ دغا باز لڑکی میرے پاس پہنچی تو میں اس پر سخت ناراض ہوئی، اسے خوب مارا اور اس کے بال باندھ کر اُسے لٹکا دیا۔ تجھے میں نے اس کا سارا کچا چٹھا لکھ دیا، حکم تیرا حکم ہے، جو تو ہمیں حکم دے گا وہ ہم کریں گے۔ تجھے خوب معلوم ہے کہ اس میں ہماری بڑی بے عزتی ہے اور اس سے ہماری اور خاص کر تیری عزت پر دھبا لگتا ہے۔ اگر جزیرے والوں کو اس کی خبر ہو گئی تو ہم سب ان کے لیے ضرب المثل بن جائیں گے اس لیے ضروری ہے کہ جواب جلد بھیج۔

یہ خط لکھ کر اس نے قاصد کو دے دیا وہ اسے لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا خط پڑھ کر ملک اکبر طیش میں آگیا اور اس نے اپنی بیٹی نور الہدا کو یہ جواب بھیجا کہ میں اسے بالکل تیرے سپرد کرتا ہوں اور اس کے خون کا تجھے حکم بناتا ہوں۔ اگر جیسا کہ تو نے لکھا ہے سچ ہے تو بے میری رائے لیے اس کو قتل کر دے۔ جب یہ خط اس کے پاس پہنچا اور اس نے پڑھا تو منار السنا کو اپنے پاس بُلایا۔ وہ لہو میں ڈوبی ہوئی تھی اس کے بالوں سے، اس کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں اور پاؤں میں لوہے کی بھاری بھاری بیڑیاں، وہ بالوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ جب لوگوں نے اسے لا کر ملکہ کے آگے کھڑا کیا تو وہ ذلت سے کھڑی ہو گئی اور اپنے آپ کو اس ذلت اور توہین کی حالت میں دیکھ کر اسے وہ زمانہ یاد آگیا جب اس کے دن عزت سے گزرتے تھے اور وہ رونے لگی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو بیسویں رات

آٹھ سو بیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب شاہ زادی منار السنا اپنی بہن نور الہدا کے سامنے لائی گئی تو اس کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں۔ بہن نے ایک لکڑی کی ٹکٹکی منگوا کر اسے لٹایا اور نوکروں کو حکم دیا کہ اسے پیٹھ کے بل ٹکٹکی سے باندھ دیا جائے اور اس کی کلائیاں کھینچ کر رسیوں سے باندھ دی جائیں۔ اس کے بعد اس نے اس کا سر کھول کر بال ٹکٹکی سے باندھ دیے۔ غرض کہ اس کے دل میں مہربانی کا نام نشان تک باقی نہ رہا۔ اپنے آپ کو اس ذلت اور توہین میں دیکھ کر منار السنا رونے پیٹنے لگی لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا، وہ کہنے لگی بہن، تیرا دل کیوں کر اتنا سخت ہو گیا کہ نہ تجھے مجھ پر رحم آتا ہے نہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر۔ یہ باتیں سن کر اس کا دل اور سخت ہو گیا، وہ گالیاں دینے اور کہنے لگی ای عاشقہ ای رنڈی، جو تیرے اوپر رحم کھائے خدا اس پر رحم نہ کھائے! ای دغاباز، میں تجھ پر کیوں کر ترس کھا سکتی ہوں! منار السنا جو ٹکٹکی سے بندھی پڑی تھی کہنے لگی میں آسمانوں کے خدا سے تیرے خلاف دہائی مانگتی ہوں، میں اس گناہ سے بری ہوں جو تو مجھ پر لگا رہی ہے۔ خدا کی قسم میں نے زنا نہیں کیا بلکہ حلال طریقے سے اس کے ساتھ شادی کی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں سچ کہتی ہوں یا جھوٹ۔ تیری سخت دلی سے مجھے تجھ پر سخت غصہ آتا ہے کہ بے جانے بوجھے تو مجھ پر زنا کا الزام لگاتی ہے۔ میرا پروردگار مجھے تجھ سے چھٹکارا دے گا اور اگر تیرا زنا کا الزام صحیح ہے تو خدا مجھے اس کی سزا دے گا۔

اپنی بہن کی باتیں سن کر ملکہ سوچ میں پڑ گئی اور کہنے لگی تو اور مجھ سے ایسی باتیں کرے! ساتھ ہی اس نے اٹھ کر بہن کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ لوگوں نے اس کے چہرے پر پانی چھڑکا اور اسے ہوش آیا لیکن مار کی وجہ سے

اس کی ساری خوب صورتی ڈھل گئی تھی۔ نور الہدا اس پر ناراض ہو رہی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ اری فاحشہ، تو میرے سامنے اپنے گناہوں کا عذر پیش کر رہی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ تجھے تیرے شوہر کے پاس بھیج دوں تاکہ تیری بدکاری کا مشاہدہ کروں کیوں کہ تو اس پر فخر کرتی ہے کہ تجھ سے بدکاری، بدفعلی اور گناہ سرزد نہیں ہوئے۔ اب اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ تاڑ کی چھڑی لائیں، چھڑ آگئی تو اس نے اٹھ کر اپنی آستینیں چڑھائیں اور سر سے لے کر پاؤں تک اسے مارنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک گندھا ہوا کوڑا منگوایا کہ اگر اسے ہاتھی پر بھی لگا دیا جاتا تو وہ بھاگ نکلتا اور اس کی پیٹھ، پیٹ اور تمام اعضا پر اتنے کوڑے لگائے کہ اسے غش آگیا۔ یہ دیکھ کر بڑھیا ملکہ کے پاس سے روتی اور کوستی بھاگی۔ ملکہ نے اپنے نوکروں کو پکار کر کہا کہ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ، وہ اس کے پیچھے دوڑے اور اسے پکڑ کر ملکہ کے سامنے لے آئے۔ ملکہ نے حکم دیا کہ اسے زمین پر پٹک دو اور اپنی کنیزوں سے کہا کہ اسے منھ کے بل گھسیٹو اور میرے سامنے سے لے جا کر باہر پھینک آؤ۔

یہ تو ان لوگوں کا حال ہوا، اب حسن کا قصہ سنو۔ وہ دل مضبوط کر کے اٹھا اور دریا کے کنارے کنارے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا لیکن پریشان و غم گین تھا۔ اور جینے سے ناامید اور اس قدر حواس باختہ کہ دن اور رات میں فرق نہ کر سکتا۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے پاس پہنچا جس پر ایک کاغذ کا پرزہ لٹکا ہوا تھا۔ حسن اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا، دیکھا کہ اس میں یہ لکھا ہے: "جب تو اپنی ماں کے پیٹ میں تھا اس وقت میں نے تیرا زائچہ دیکھا تھا اور ہم تیرے رنج والم میں تیری دست گیری کریں گے۔" اسے پڑھ کر اسے یقین آگیا کہ اب مجھے تکلیف سے نجات مل جائے گی اور بچھڑے ہوؤں سے مل جاؤں گا۔ دو چار قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ اکیلا ایک سنسان جگہ میں ہے جہاں کوئی مونس و غم خوار نہیں۔

اس تنہائی و خوف کا خیال کر کے اس کے ہوش جاتے رہے اور اس ڈراؤنی جگہ کو دیکھ کر وہ کانپنے لگا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔

آٹھ سو اکیسویں رات

آٹھ سو اکیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! کاغذ کا پرچہ پڑھ کر حسن کو یقین آ گیا کہ اب اسے تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ دریا کے کنارے دو چار قدم چلنے کے بعد اسے جادوگروں کے دو چھوٹے لڑکے ملے جن کے پاس پیتل کا ایک ڈنڈا تھا جس پر طلسمات کندہ تھے اور اس کے قریب چمڑے کی ایک تکونی ٹوپی جس پر فولاد کے اسما اور طلسمات بنے ہوئے تھے۔ ڈنڈا اور ٹوپی دونوں زمین پر پڑے تھے۔ دونوں لڑکے آپس میں جھگڑ رہے اور ایک دوسرے کو اتنا مار رہے تھے کہ دونوں کے جسموں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ ایک کہتا تھا کہ یہ ڈنڈا اور ٹوپی میں لوں گا اور دوسرا کہتا تھا کہ میں۔ حسن نے قریب جا کر ان دونوں کو چھڑایا اور ان سے پوچھا کہ آخر تم کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟ دونوں بولے کہ چچا! ہم میں فیصلہ کر دے کیوں کہ اس وقت خدا نے تجھے یہاں بھیجا ہے کہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔ حسن نے کہا مجھ سے اپنا قصہ بیان کرو میں تم دونوں میں فیصلہ کر دوں گا۔ وہ بولے کہ ہم دونوں سگے بھائی ہیں، ہمارا باپ بہت بڑا جادوگر تھا اور اس پہاڑ کی ایک کھوہ میں رہتا تھا۔ مرنے کے بعد اس نے یہ ڈنڈا اور یہ ٹوپی ترکے میں چھوڑی، میرا بھائی کہتا ہے کہ انھیں میں لوں گا، اور میں کہتا ہوں کہ میں۔ ہمارا فیصلہ کر کے ہمیں اس سے نجات دے۔ ان کی باتیں سن کر حسن نے کہا کہ ڈنڈے اور ٹوپی میں کیا فرق ہے؟ ظاہرا تو ڈنڈا چھ پیسے کا ہو گا اور ٹوپی تین پیسے کی۔ لڑکوں نے کہا کہ

سے تجھے ان کی خاصیت معلوم نہیں۔ حسن نے پوچھا کہ کیا خاصیت ہی؟ انھوں نے کہا کہ دونوں میں عجیب و غریب خاصیت ہی، ڈنڈے کی قیمت جزائر واق اور اس کے مقبوضات کا خراج ہی اور اسی طرح ٹوپی کی بھی۔

حسن نے کہا بیٹو، خدا کے لیے بتاؤ تو سہی کہ ان میں کیا بھید ہی۔ وہ بولے کہ چچا، ان میں بڑی خاصیت ہی، ہمارا باپ ایک سو پینتیس سال تک زندہ رہا اور برابر انھیں کو بناتا رہا یہاں تک کہ انھیں خوب اچھی طرح سے بنایا اور ان میں بڑے بھید رکھے، ان کے ماتحت عجیب و غریب موکل رکھے، گھومنے والے آسمان کے سے اس میں نقش و نگار بنائے اور تمام طلسمات کوٹ کوٹ کر بھر دیے۔ جب وہ انھیں مکمل بنا چکا تو اسے موت آ گئی جس سے کسی کو مفر نہیں۔ ٹوپی کی تو یہ خاصیت ہی کہ اگر کوئی اسے پہن لے تو لوگوں کی نظروں سے چھپ جائے گا اور جب تک وہ اس کے سر پر رہے گی کوئی اسے دیکھ نہ سکے گا۔ رہا ڈنڈا اس کی یہ خاصیت ہی کہ وہ جس کے پاس ہو اس کے قبضے میں سات قبیلے جنوں کے آ جائیں گے۔ ساتوں اسی ڈنڈے کے ماتحت ہیں اس لیے وہ سب اس کا حکم مانیں گے۔ اگر ڈنڈے کا مالک اسے ہاتھ میں لے کر زمین پر مارے تو جنوں کے بادشاہ اس کی اطاعت کریں گے اور تمام جن اس کی خدمت میں آ موجود ہوں گے۔ یہ سن کر حسن تھوڑی دیر تک سر جھکائے رہا اور دل میں کہنے لگا کہ خدا کی قسم اگر خدا نے چاہا تو مجھے یہ ڈنڈا اور یہ ٹوپی مل جائے گی کیوں کہ لڑکوں سے زیادہ میں مستحق ہوں۔ میں ابھی کسی نہ کسی چال سے لڑکوں سے دونوں چیزیں لیے لیتا ہوں تاکہ ان کی مدد سے میں اپنے بیوی بچوں کو اس ظالم ملکہ کے پنجے سے چھڑا سکوں اور اس اندھیر نگری سے چلتا بنوں جہاں سے آج تک کسی انسان کو چھٹکارا نہیں ملا ہی۔ شاید خدا مجھے ان دونوں لڑکوں کے پاس اسی وجہ سے لایا ہی کہ میں ان سے ڈنڈا اور ٹوپی لے اڑوں۔ اب اس نے سر اٹھا کر لڑکوں

سے کہا کہ اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو میں تمھارا امتحان کرتا ہوں اور جو غالب آجائے اس کا ڈنڈا اور جو مغلوب ہو اس کی ٹوپی۔ امتحان لے کر میں یہ فیصلہ کر دوں گا کہ تم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے۔ دونوں بولے کہ چچا! ہم تجھے امتحان لینے کا اختیار دیتے ہیں، جس طرح تیرا جی چاہے فیصلہ کر۔ حسن نے کہا کیا تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ حسن نے کہا کہ میں ایک پتھر پھینکتا ہوں، جو آگے دوڑ کر اسے اٹھا لے گا اسے ڈنڈا ملے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا ٹوپی پائے گا۔ دونوں بولے کہ ہم اس بات کو منظور کرتے ہیں اور اس پر راضی ہیں۔

اب حسن نے ایک پتھر لے کر اپنی پوری قوت سے اسے پھینکا اور وہ نظروں سے غائب ہو گیا اور دونوں لڑکے اس کے پیچھے دوڑے۔ جب وہ دور پہنچ گئے تو حسن نے ٹوپی لے کر پہن لی اور ڈنڈے کو ہاتھ میں لے کر اپنی جگہ بدل دی تاکہ وہ دیکھے کہ انھوں نے اپنے باپ کا بھید سچ بتایا ہے کہ نہیں۔ چھوٹے لڑکے نے آگے بڑھ کر پتھر اٹھا لیا اور اسے لے کر وہاں لوٹا جہاں حسن تھا لیکن اس کا پتا بالکل نہ پایا اور اپنے بھائی کو پکار کر کہا کہ وہ شخص کہاں ہے جو ہمارا حَکَم تھا؟ بھائی بولا کہ وہ مجھے بھی دکھائی نہیں دیتا، معلوم نہیں کہ آسمان پر چڑھ گیا یا زمین میں دھنس گیا۔ دونوں نے حسن کو بہتیرا ڈھونڈا لیکن وہ دکھائی نہ دیا اگرچہ حسن اپنی جگہ کھڑا تھا۔ لڑکے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور بولے کہ ڈنڈا بھی جاتا رہا اور ٹوپی بھی، نہ تجھے کچھ ملا نہ مجھے۔ ہمارے باپ نے یہی کہا تھا لیکن ہم اس کی بات بھول گئے تھے۔ یہ کہہ کر دونوں لڑکے لوٹ گئے اور حسن ٹوپی پہنے اور ڈنڈا ہاتھ میں لیے شہر کے اندر گیا کوئی اسے دیکھ نہ سکا اور محل میں داخل ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں شواہی ذات الدواہی تھی اسی طرح اس کے پاس پہنچ گیا وہ اسے دیکھ نہ سکی چلتے چلتے وہ اس الماری کے پاس پہنچا جس کے نیچے بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی اور جس میں کانچ اور چینی کے برتن رکھے

ہوئے تھے۔ حسن نے الماری کو اپنے ہاتھ سے ہلایا اور جو کچھ اس کے اندر تھا زمین پر گر پڑا۔ شواہی ذات الدواہی شور مچانے اور اپنا منھ پیٹنے لگی، اس نے اٹھ کر وہ چیزیں پھر ان کی جگہ پر رکھ دیں اور اپنے دل میں کہنے لگی کہ ضرور ملکہ نور الہدا نے کوئی شیطان بھیجا ہے جو میرے ساتھ یہ حرکت کر رہا ہے۔ میں خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ مجھے ملکہ کے پنجے سے چھڑائے اور اس کے غصے سے مجھے بچائے۔ خداوندا، جس نے اپنی بہن کو جو باپ کی چہیتی ہے اتنا مارا اور لٹکایا اگر وہ مجھ غریب سے ناراض ہو گئی تو نہ معلوم میری کیا گت بنائے گی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو بائیسویں رات

آٹھ سو بائیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! بڑھیا ذات الدواہی نے کہا کہ جب ملکہ نور الہدا نے اپنی بہن کے ساتھ یہ حرکت کی تو اگر وہ کسی غریب پر ناراض ہو گئی تو نہ معلوم اس کی کیا گت بنائے گی! اس کے بعد اس نے کہا اے شیطان! میں تجھے قسم دیتی ہوں اس ذات کی جو حنّان منّان عظیم الشان قوی السلطان اور انسانوں اور جنات کا پیدا کرنے والا ہے اور اس نقش کی جو سلیمان بن داؤد کی انگوٹھی پر ہے۔ بول اور مجھے جواب دے۔ اس کا جواب حسن نے دیا کہ میں شیطان نہیں بلکہ محبت کا مارا حیران و پریشان حسن ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے سر سے ٹوپی اتار لی بڑھیا نے اسے پہچان لیا اور کہنے لگی کہ کیا تیری عقل ماری گئی کہ یہاں آیا؟ جا کر کہیں چھپ جا۔ اس حرام زادی نے تیری بیوی کو سخت سے سخت تکلیف پہنچائی ہے حالاں کہ وہ اس کی بہن ہے، پھر اگر تو اس کے ہتھے چڑھ گیا تو تیری کیا گت بنے گی! یہ کہہ کر اسے اس کی بیوی کا سارا قصہ سنا دیا کہ وہ کس تکلیف اور

مصیبت اور بلا میں گرفتار ہو۔ اس کے بعد وہ بولی کہ ملکہ تجھے چھوڑ کر سخت پشیمان ہو اور اس نے تیرے پکڑنے کے لیے ایک شخص کو بھیجا ہو جسے وہ ڈھیروں سونا دے گی اور ہیرے عہدے پر مقرر کر دے گی اس نے قسم کھائی ہو کہ اگر وہ شخص تجھے پکڑ لائے تو وہ تجھے بھی قتل کر دے گی اور تیرے بیوی بچوں کو بھی۔

بڑھیا نے یہ باتیں جو سنائیں تو حسن رونے لگا اور اس نے کہا ای میری آقا! اس ملک اور اس ظالم ملکہ سے کیوں کر چھٹکارا مل سکتا ہو اور تو مجھے کیا تدبیر بتا سکتی ہو جس سے میں بیوی بچوں کو چھڑا سکوں اور انھیں لے کر صحیح و سالم اپنے وطن پہنچ جاؤں۔ بڑھیا بولی کہ بخت، اپنی جان لے کر بھاگ۔ حسن نے کہا میں تو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو اس سے زبردستی چھڑا کر رہوں گا۔ بڑھیا بولی کہ تو انھیں کس طرح ان سے زبردستی چھڑائے گا؟ بیٹا جا کر کہیں چھپ رہ اور دیکھ کہ خدا کا کیا حکم ہوتا ہو۔ اب حسن نے اسے پیتل کا ڈنڈا اور ٹوپی دکھائی، بڑھیا انھیں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور کہنے لگی کہ پاک ہو وہ خدا جو گلی سڑی ہڈیوں کو زندہ کر دیتا ہو! بیٹا، تیرے اور تیری بیوی کے لیے سوا مرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا لیکن بیٹا! اب تو تو بھی بچ گیا اور تیرے بیوی بچے بھی کیوں کہ میں اس ڈنڈے کو بھی جانتی ہوں اور اس کے مالک کو بھی، وہ میرا استاد تھا جس نے مجھے جادو سکھایا ہو۔ وہ بہت بڑا جادوگر تھا، وہ ایک سو پینتس سال زندہ رہا اور اس ڈنڈے اور ٹوپی کو مکمل کر کے چھوڑا۔ جب وہ انھیں تکمیل تک پہنچا چکا تو اسے موت آ گئی جس سے کسی کو مفر نہیں۔ میں نے خود سنا ہو کہ وہ اپنے بیٹوں سے کہتا تھا کہ یہ دونوں چیزیں تمھاری قسمت میں نہیں ہیں بلکہ ایک پردیسی آ کر انھیں تم سے زبردستی لے جائے گا اور تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کس طرح لے گیا۔ لڑکوں نے کہا کہ ابا، بتا کہ وہ کس طرح انھیں لے جائے گا؟ باپ نے کہا کہ بیٹو، یہ مجھے بھی معلوم

نہیں۔ بیٹا! بتا تو سہی یہ چیزیں کیسے تیرے ہاتھ لگیں؟ حسن نے سارا ماجرا سُنا دیا کہ
وہ انھیں کس طرح دونوں لڑکوں سے لے اُڑا۔ یہ سُن کر بڑھیا خوش ہوگئی اور کہنے
لگی کہ بیٹا! اب چوں کہ تیرے بیوی بچے تجھے مل جائیں گے لہٰذا میری بات سُن۔ اس
تکلیف کے بعد جو اس حرام زادی نے مجھے پہنچائی ہے میں تو اس کے پاس نہ ٹھیروں
گی بلکہ جادوگروں کے غار میں جاکر مرتے دم تک اُن کے ساتھ رہوں گی لیکن بیٹا،
تو ٹوپی پہن کر اور ہاتھ میں ڈنڈا لے کر اس جگہ جا جہاں تیرے بیوی بچے ہیں اور ڈنڈے
کو زمین پہ مار کر کہیو کہ اے اس طلسمات کے موکلو! تیرے یہ کہتے ہی موکل تیرے
پاس حاضر ہو جائیں گے۔ اگر قبیلے کے سرداروں میں سے کوئی حاضر ہو تو جو تیری
ضرورت ہو اس سے بیان کر دیجیو۔ اب وہ بڑھیا سے رخصت ہو کر باہر نکلا اور
ٹوپی پہن اور ڈنڈا ہاتھ میں لے اُس جگہ پہنچا جہاں اس کی بیوی تھی اور دیکھا کہ
اس پر مردنی چھائی ہوئی ہے اور وہ ٹکٹکی سے بندھی لٹک رہی ہے اس کے بال
لٹکے ہوئے ہیں اور وہ غم گین ہے، رو رہی ہے، بُرا حال ہے، اس کے بچے سیڑھی کے
نیچے کھیل رہے ہیں اور وہ اُن پر اور اپنے آپ پر واویلا کر رہی ہے اور سخت مصیبت
میں مبتلا ہے۔ اسے اس تکلیف اور ذلت میں دیکھ کر حسن کو غش آگیا۔ جب اُسے
ہوش آیا اور اس نے دیکھا کہ بچے کھیل کود رہے ہیں اور ان کی ماں مارے تکلیف
کے بے ہوش پڑی ہے تو اس نے ٹوپی اُتار لی اور بچوں نے ابّا ابّا چلانا شروع کیا۔
یہ سُن کر اس نے پھر ٹوپی پہن لی۔ بچوں کے شور سے ماں کو ہوش آگیا اُسے کوئی
نظر نہ آیا۔ اس نے صرف یہ دیکھا کہ بچے رو رہے اور ابّا ابّا پکار رہے ہیں۔ بچوں
کو باپ کا نام لیتے اور روتے دیکھ کر وہ بھی رو پڑی، اس کا سینہ پھٹنے لگا اور وہ
زخم خوردہ دل سے کہنے لگی کہ تم کہاں اور تمھارا باپ کہاں! اس کے بعد اُسے وہ زمانہ
یاد آگیا جب کہ وہ ساتھ تھے نیز وہ باتیں جو اس کی جدائی کے بعد اس پر گزری تھیں

اور وہ اتنا روئی کہ آنسوؤں سے اس کے رخسار گیلے ہو گئے مگر اس کا کوئی ہاتھ کھلا ہوا نہ تھا کہ وہ آنسو پونچھ سکے، ہاں مکھیاں اس کی جلد پر بیٹھی خون چوس رہی تھیں اور اس کے لیے سوا رونے کے کوئی چارہ نہ تھا، اور شہرزاد کو صبح ہو گئی۔۔۔۔

آٹھ سو تیسویں رات

آٹھ سو تیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! اس کے رونے دھونے کے بعد حسن کی بیوی نے ادھر ادھر دیکھا کہ آخر یہ کسے یاد کر رہے ہیں اور کسے اپنا باپ کہہ کر پکار رہے ہیں لیکن اسے کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ جب اسے کوئی نظر نہ آیا تو اسے تعجب ہوا کہ اس وقت بچوں نے اپنے باپ کو کیوں یاد کیا۔

یہ تو اس کی داستان ہوئی، اب حسن کا ماجرا سنیے۔ وہ اسے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگا اور اتنا رویا کہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گیا۔ پھر روتے روتے بچوں کے پاس جا کر اس نے ٹوپی اتار دی۔ بچوں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور وہ پھر ابا ابا کہہ کر چلانے لگے۔ بچوں کے منہ سے باپ کا نام سن کر ان کی ماں رونے لگی، اس نے کہا خدا کے لکھے کے خلاف کسی کی نہیں چلتی۔ وہ حیران تھی کہ یا اللہ! اس وقت بچے کیوں اپنے باپ کو یاد کر رہے ہیں اور پکار رہے ہیں۔ حسن سے اب زیادہ صبر نہ ہو سکا اور اس نے ٹوپی اتار دی۔ جوں ہی اس کی بیوی نے اسے دیکھا اس زور سے چیخ ماری کہ سارے محل والے سہم گئے۔ پھر اس نے پوچھا تو یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ کیا تو آسمان پر سے اترا ہے یا زمین توڑ کر نکل آیا ہے؟ اس کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور حسن بھی رو پڑا۔ بیوی نے کہا اے شخص! یہ نہ رونے کا وقت ہے نہ شکوے شکایت کا، جو قسمت میں لکھا تھا پورا ہو گیا اور آنکھیں [illegible]

ازل میں حکم دے دیا تھا، قلم نے لکھ دیا تھا میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ جہاں سے آیا ہے وہاں لوٹ جا، کہیں کوئی تجھے دیکھ نہ لے، اگر میری بہن کو خبر ہو گئی تو وہ مجھے بھی ذبح کر ڈالے گی اور تجھے بھی۔ حسن بولا اے میری اور تمام شاہ زادیوں کی آقا میں جان پر کھیل کر یہاں آیا ہوں، اب یا تو مر جاؤں گا یا اس مصیبت سے چھڑا کر تجھے اور اپنے بچوں کو وطن لے جاؤں گا خواہ تیری بہن [illegible] اور وہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے۔

اس کی باتیں سن کر وہ مسکرانے اور ہنسنے لگی اور دیر تک اپنا سر ہلاتی رہی، پھر بولی اے میری جان! ممکن نہیں کہ سوا خدا کے اور کوئی مجھے اس مصیبت سے چھڑا سکے۔ لہذا یہاں سے بھاگ جا اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈال، اس کے پاس اتنا زبردست لشکر ہے کہ کسی کو اس کے مقابلہ کی تاب نہیں ہو سکتی۔ اور مان لیا کہ تو مجھے لے کر یہاں سے چل دیا لیکن یہ تو بتا کہ ان جزیروں سے نکل کر جہاں بے حد دشواریاں اور خطرے ہیں اپنے وطن کس طرح پہنچے گا۔ راہ میں تو نے خود عجیب و غریب چیزیں، خطرے اور ایسی ایسی بلائیں دیکھی ہوں گی جن سے بڑے بڑے زبردست جنوں کا چھٹکارا بھی ممکن نہیں۔ لہذا فوراً چل دے اور مجھے غم پر غم اور رنج پر رنج نہ دے اور یہ دعوا نہ کر کہ تو مجھے اس حالت سے نجات دے کر اپنے وطن لے جائے گا۔ حسن بولا اے میری آنکھ کی روشنی، قسم ہے مجھے تیری جان کی بیش بے تیرے نہ اس جگہ سے نکلوں گا نہ سفر کروں گا۔ اس نے جواب دیا اے شخص، تو یہ کام کیسے کر سکتا ہے آخر تجھ میں کیا کمال ہے؟ تو سوچ سمجھ کر بات نہیں کرتا۔ اگر تیرے قبضے میں جن اور دیو اور جادوگر بھی ہوں تو بھی تو اس جگہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ بہتر ہے کہ تو اپنی جان لے کر بھاگ اور مجھے چھوڑ دے، ممکن ہے کہ خدا ان باتوں کے بعد دوسری باتیں پیدا کر دے۔

حسن بولا اے حسینوں کی سرتاج، میں تو آیا ہی اس لیے ہوں کہ اس ڈنڈے اور ٹوپی کے زور سے تجھے چھڑاؤں۔ یہ کہہ کر وہ دونوں لڑکوں کا قصہ اس سے بیان ہی کر رہا تھا کہ ملکہ آ پہنچی اور ان کی گفتگو سننے لگی۔ ملکہ کو دیکھ کر حسن نے ٹوپی پہن لی اور وہ اپنی بہن سے کہنے لگی اے کم ذات، تو کس سے باتیں کر رہی تھی؟ اس نے جواب دیا سوا ان بچوں کے یہاں ہے کون جو مجھ سے باتیں کرے۔ اب ملکہ نے کوڑا لے کر اسے مارنا شروع کر دیا اور حسن کھڑا دیکھتا رہا، اس نے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی اور حکم دیا کہ اسے اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ لوگ اسے کھول کر دوسری جگہ لے گئے، جہاں اسے لے گئے حسن بھی ساتھ ساتھ گیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اسی بے ہوشی کی حالت میں اسے زمین پر ڈال دیا اور کھڑے دیکھتے رہے۔ جب اسے ہوش آیا تو کنیزیں اس کے پاس سے چلی گئیں، حسن نے پھر ٹوپی اُتار لی۔ اس کی بیوی نے کہا اے شخص! دیکھ یہ میری گت اس لیے بنی ہے کہ میں نے تیری نافرمانی کی اور تیرا حکم نہ مانا اور بغیر تیری اجازت کے چلی آئی۔ اے شخص! خدا کے لیے اس کی سزا مجھے نہ دیجیو۔ یقین جان کہ جب تک میاں بیوی میں جدائی نہیں ہوتی اس وقت تک بیوی میاں کی قدر نہیں جانتی۔ سچ ہے کہ میں گنہ گار اور خطاوار ہوں لیکن خدا کے آگے اپنے کیے کی معافی مانگتی ہوں۔ اگر خدا نے ہمیں پھر ملا دیا تو کبھی تیرے حکم کی نافرمانی نہ کروں گی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔

آٹھ سو چوبیسویں رات

آٹھ سو چوبیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب حسن کی بیوی نے اس کے آگے معذرت کی تو حسن کا دل دُکھنے لگا، اس نے کہا کہ

خطا تیری نہیں ہے بلکہ میں خطاوار ہوں کیوں کہ میں تجھے ایسے شخص کے پاس چھوڑ کر
چلا گیا جسے تیری قدر و قیمت بالکل معلوم نہ تھی، اور اے میرے دل کی ٹھنڈک اور آنکھ
کی روشنی، خدا نے مجھے یہ قدرت دی ہے کہ میں تجھے چھڑا لوں لیکن یہ بتا کہ اس کے بعد
تو یہ چاہتی ہے کہ جب تک خدا کا حکم پورا نہ ہولے اپنے باپ کے پاس رہے، یا یہ
چاہتی ہے کہ فوراً ہمارے وطن چلی چلے جہاں تیرے لیے خوشی ہی خوشی ہے؟ اس نے
جواب دیا سوا آسمان کے پروردگار کے مجھے کون چھڑا سکتا ہے! لہذا اپنے ملک
کو چلا جا اور لالچ اپنے دل سے نکال ڈال کیوں کہ ان ملکوں کے خطروں کی تجھے خبر
نہیں۔ اگر تو نے میرا کہنا نہ مانا تو تو عنقریب اس کا مزہ چکھ لے گا۔ اس کے بعد وہ
اور اس کے بچے اتنا روئے کہ کنیزیں ان کی آوازیں سن کر اندر آگئیں اور انھوں نے
دیکھا کہ شاہ زادی منار السنا اور اس کے بچے رو رہے ہیں، حسن ان کی نظروں سے
غائب تھا۔ کنیزوں کا دل ان پر اتنا کڑھا کہ وہ روتے اور ملکہ نور الہدا کو کوسنے لگیں۔
حسن نے رات تک انتظار کیا جب پہرے دار چلے گئے تو وہ اٹھا، کمر کس کر اپنی بیوی
کے پاس آیا اسے کھول کر اس کا سر چوما، سینے سے لگایا اور کہا کہ میں اس بات کا
کتنا مشتاق ہوں کہ اپنے وطن جا کر سب سے ملوں۔ معلوم نہیں کہ ہمارا اس وقت
کا ملنا خواب میں ہے یا بیداری میں؟ یہ کہہ کر اس نے بڑے لڑکے کو گود میں اٹھایا
اور اس کی بیوی نے چھوٹے لڑکے کو اور محل سے نکل کر چل دیے، خدا نے ان
کی پردہ پوشی کی۔ محل سے نکل کر وہ اس دروازے پر پہنچے جو ملکہ کی حرم سرا میں
کھلتا تھا، یہ دیکھ کر کہ اس میں قفل پڑا ہوا ہے حسن لاحول پڑھنے لگا اور انھیں یقین
ہو گیا کہ یہاں سے نکلنا نا ممکن ہے۔ حسن یا مشکل کشا کہہ کر ہاتھ ملنے لگا کہ سوا
اس کے ہر بات کا میں نے انتظام کر لیا اور نتیجہ سوچ لیا تھا۔ دن نکلتے ہی لوگ
ہمیں گرفتار کر لیں گے، اب کیا کرنا چاہیے؟ حسن کے آنسو نکل پڑے اس کی بیوی

بھی رونے لگی، اپنی توہین اور رنج و الم کا خیال کر کے افسوس کرتی اور کہتی کہ خدا کی قسم، ہمیں بے اس کے چین نہیں ملے گا کہ ہم خودکشی کر کے اس مصیبت سے نجات پائیں ورنہ کل صبح ہمیں پھر تکلیفوں کا سامنا ہے۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی اور کہا ای میری آقا منارالسنا اور اس کے شوہر حسن! جب تک تم میری بات نہ مان لوبیں دروازہ نہ کھولوں گی۔ وہ چُپ ہو گئے اور چاہتے ہی تھے کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں لوٹ جائیں کہ اتنے میں پھر کسی کی آواز آئی کہ تم چُپ کیوں ہو، جواب کیوں نہیں دیتے۔ اب دونوں نے پہچان لیا کہ بڑھیا شواہی ذات الدواہی کی آواز ہے اور جواب دیا کہ جو کچھ تیرا حکم ہو ہم ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن پہلے دروازہ تو کھول دے، یہ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بڑھیا بولی کہ خدا کی قسم میں اس وقت تک دروازہ نہ کھولوں گی جب تک تم قسم نہ کھالو کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے، میں اس ظالم کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ جو تمھاری حالت ہوگی وہی میری بھی ہوگی، اگر تم صحیح و سلامت رہے تو میں بھی رہوں گی اور اگر تم پر مصیبت آئے گی تو میں بھی اسے جھیلوں گی کیوں کہ یہ حرام زادی ہر وقت میری ذلت کرتی ہے اور تمھاری وجہ سے میرے پیچھے پڑ گئی ہے اور ای بیٹی! تو میری قدر و قیمت جانتی ہے۔ جب انھوں نے بڑھیا کو پہچان لیا تو انھیں اطمینان ہوا اور انھوں نے اتنی قسمیں کھائیں کہ اسے یقین آ گیا اور اس نے دروازہ کھول دیا، دونوں باہر نکل آئے، دیکھا کہ بڑھیا ایک رومی سُرخ مٹی کے مٹکے پر سوار ہے مٹکے کے گلے میں تاڑ کے ریشوں کی ایک رسّی پڑی ہوئی ہے، مٹکا اس کے نیچے گھوم رہا اور نجدی گھوڑے سے بھی تیز چل رہا ہے۔ بڑھیا نے آگے بڑھ کر کہا کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ اور کسی بات سے نہ ڈرو۔ جادو کے چالیس باب مجھے بر زبان یاد

ہیں جن کا ان سب سے چھوٹا یہ ہو کہ میں اس شہر کو ایک متلاطم سمندر بنا سکتی ہوں جس میں تمام لڑکیاں جادو کے زور سے مچھلیاں بن جائیں اور سویرا ہونے سے پہلے پہلے یہ تمام باتیں پیش آجائیں لیکن میں محض اس کے باپ کے ڈر سے اور اس کی بہنوں کی خاطر یہ نہیں کر سکتی کیوں کہ ان کے پاس دیووں اور جنوں کا بہت بڑا لشکر ہے۔ تم عنقریب میرے جادو کی نیرنگیاں دیکھ لوگے، خدا سے برکت اور مدد کی دعا مانگ کر چل کھڑے ہو۔ یہ سن کر حسن اور اس کی بیوی خوش ہو گئے اور ان کو اپنی نجات کا یقین آگیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . "

آٹھ سو چھبیسویں رات

آٹھ سو چھبیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب حسن، اس کی بیوی اور بڑھیا شہر سے نکلے اور انھیں اپنے بچ جانے کا یقین ہو گیا تو وہ شہر کے باہر پہنچے حسن نے ڈنڈا لے کر زمین پر مارا اور دل کو کڑا کر کے کہا ای اس طلسمات کے موکلو، تم اپنے حال سے آکر مجھے مطلع کرو۔ زمین پھٹی اور اس میں سے دس دیو نکلے جن کے پانو زمین کے اندر دھنسے ہوئے اور سر بادلوں سے ٹکرا رہے تھے۔ انھوں نے حسن کے آگے تین بار زمین چومی اور یک زبان ہو کر کہا ای ہمارے آقا اور حاکم، ہم حاضر ہیں تیرا ہر حکم ماننے اور بجالانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تو چاہے تو ہم سمندروں کو سکھا دیں اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دیں۔ حسن نے دیکھا کہ کتنی جلد انھوں نے جواب دیا تو وہ خوش ہو گیا اور اپنا دل مضبوط کر کے کہنے لگا، تم لوگ کون ہو، تمھارے نام کیا ہیں، کس قبیلے کی طرف تم منسوب ہو، کس گروہ، کس جماعت اور کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

سُن کر انھوں نے دوبارہ زمین چومی اور بولے کہ ہم ہیں سات بادشاہ ہیں، ہر ایک جنوں، شیطانوں اور دیووں کے سات سات قبیلوں پر حکومت کرتا ہے، لہٰذا ہم سات بادشاہوں کے ماتحت جنات، شیاطین اور دیووں کے انچاس قبیلے ہیں جن میں اُڑنے والے، زمین کے اندر گھسنے والے، پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں اور سمندروں کے رہنے والے ہیں۔ تو جو حکم دینا چاہے دے، ہم تیرے نوکر اور غلام ہیں۔ جس کے قبضے میں یہ ڈنڈا ہے وہی ہماری گردنوں کا بھی مالک ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

ان کی باتیں سُن کر حسن اس کی بیوی اور بڑھیا سب کے سب خوش ہو گئے اور حسن نے ان جنوں سے کہا میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے قبیلوں اور لشکروں سے ملاؤ۔ انھوں نے جواب دیا اے ہمارے آقا! ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو اپنے لوگوں سے ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیوں کہ ان کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ صورتیں، شکلیں، رنگ، چہرے اور بدن طرح طرح کے ہیں۔ بعض ہم میں سے سر ہیں بے جسم کے اور بعض جسم ہیں بے سر کے، بعضوں کی شکل وحشی جانوروں کی ہے اور بعض کی درندوں کی سی۔ لیکن اگر تو یہی چاہتا ہے تو ہم ضرور دکھائیں گے اور سب سے پہلے تو ان کو دیکھے گا جو وحشی جانوروں کی شکل کے ہیں۔ مگر اے ہمارے آقا! اس وقت تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟ حسن نے کہا میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے میری بیوی اور اس نیک عورت کو ابھی بغداد لے چلو۔ یہ سُن کر جنوں نے سر نیچا کر لیا، حسن نے پوچھا کہ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ وہ یک زبان ہو کر بولے اے ہمارے آقا اور حاکم! ہم حضرت سلیمان بن داؤدؑ کے زمانے کے ہیں انھوں نے ہمیں قسم دی تھی کہ ہم کسی آدم زاد کو اپنے اوپر سوار نہ کریں۔ اس وقت سے لے کر آج تک نہ کسی آدم زاد کو ہم نے اپنے کندھوں پر بٹھایا ہے نہ پیٹھوں پر۔ لیکن ہم فوراً

جنات کے گھوڑوں کو کس کر لاتے ہیں، وہ تجھے اور تیرے ساتھیوں کو تیرے وطن پہنچا آئیں گے۔ حسن نے پوچھا یہاں سے بغداد کتنی دور ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ تیز رفتار سوار کے لیے سات برس کی راہ۔ حسن نے تعجب سے کہا پھر میں کیسے ایک سال سے کم میں پہنچ گیا؟ انھوں نے جواب دیا خدا نے اپنے نیک بندوں کا دل تجھ پر مہربان کر دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ملک تک تیری پہنچ نہ ہوتی بلکہ تو اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکتا۔

شیخ عبدالقدوس نے تجھے ہاتھی اور میمون گھوڑے پر بٹھا کر تین دن میں اتنی دور پہنچایا ہے جتنا کہ ایک تیز رفتار سوار تین برس میں چلتا ہے، اور شیخ ابوالرویش نے جو تجھے دہنش کے سپرد کیا تھا اس نے ایک رات اور ایک دن میں تیرے ساتھ تین برس کی مسافت طے کی۔ یہ خدا کی مہربانی تھی کیوں کہ شیخ ابوالرویش، آصف بن برخیا کی اولاد میں سے ہے اور اُسے اسم اعظم آتا ہے۔ بغداد سے لڑکیوں کے محل تک ایک برس کی راہ ہے، یہ پورے سات سال ہو گئے۔ یہ سُن کر حسن کو بڑا تعجب ہوا اور وہ کہنے لگا کہ پاک ہے وہ ذات جو مشکلیں آسان کرتی، ٹوٹے ہوئے دل جوڑتی ہے، دور کو نزدیک کرتی اور ہر ظالم سرکش کو نیچا دکھاتی ہے، اسی نے ہماری مشکلیں آسان کیں اور مجھے اس ملک میں پہنچا کر ان تمام مخلوق کو میرا فرماں بردار بنایا اور مجھے میرے بیوی بچوں سے ملایا۔ نہ معلوم میں سو رہا یا جاگ رہا ہوں، نشے میں ہوں یا ہوش میں۔ اس کے بعد حسن نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا اگر تم ہمیں اپنے گھوڑوں پر سوار کر دو گے تو وہ ہمیں کے دن میں بغداد پہنچا دیں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ پہنچا تو وہ تمھیں ایک سال سے کم میں دیں گے لیکن اس مدت میں بے شمار تکلیفوں، سختیوں اور خطروں کا سامنا ہوگا، خشک گھاٹیوں، دہشت ناک بیابانوں، جنگلوں اور مہلک مقامات میں سے ہو کر گزرنا ہوگا

کیوں کہ اے میرے آقا! ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ان جزیروں والوں سے تجھے نقصان نہ پہنچ جائے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

آٹھ سو چھبیسویں رات

آٹھ سو چھبیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جنوں نے حسن سے کہا اے ہمارے آقا! ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ان جزیرے والوں سے تجھے نقصان نہ پہنچ جائے یا ملک اکبر سے یا ان جادوگروں اور کاہنوں سے، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں شکست دے کر تمہیں ہم سے چھین لیں اور ہماری بری درگت بنائیں اور جو کوئی یہ خبر سنے ہم سے کہے کہ تم نے بڑی زیادتی کی، تم نے یہ کیا کیا کہ ملک اکبر کے ملک میں جا کر اس کی لڑکی کو بھی اٹھا لے گئے اور ایک انسان کو بھی! اگر تو اکیلا ہمارے ساتھ ہوتا تو ہمارے لیے آسانی تھی۔ لیکن پروا نہیں، جس ذات نے تجھے ان جزیروں تک پہنچایا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ تجھے تیرے وطن پہنچا دے اور تو عنقریب اپنی ماں سے مل جائے۔ ہمت کر کے خدا پر بھروسا کر اور ڈر نہیں، جب تک اپنے وطن نہ پہنچ جائے گا ہم تیرے ساتھ رہیں گے۔ حسن نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خدا تمہیں نیک بدلہ دے! اچھا گھوڑے جلد لاؤ، انھوں نے پانو زمین پر مارے، زمین پھٹ گئی وہ اس کے اندر غائب ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد تین گھوڑے لے کر نکلے جن پر زینیں کسی ہوئی، لگامیں لگی ہوئی تھیں اور ہر زین کے اگلے حصے میں دو دو خرجیاں لٹکی ہوئی تھیں، ایک میں پانی بھری تھیلیاں تھیں اور دوسری میں کھانا۔ انھوں نے گھوڑے پیش کیے، ایک پر حسن سوار ہو گیا اور ایک لڑکے کو اپنے آگے بٹھا لیا، دوسرے پر

اس کی بیوی بیٹھی اور دوسرے لڑکے کو اپنے سامنے سوار کرلیا، پھر بڑھیا اپنے مٹکے پر سے اتر کر تیسرے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ رات بھر چلے، صبح ہوئی تو راستے سے ہٹ کر پہاڑ کا رُخ کیا اور برابر خدا کی یاد میں پہاڑ سے لگے لگے چلتے رہے۔

چلتے چلتے حسن کو اپنے آگے ایک پہاڑ دکھائی دیا جو ایک ستون کی طرح تھا اور اتنا لمبا کہ گویا دھنواں آسماں کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر حسن قرآن کی آیتیں پڑھنے لگا اور خدا کے آگے مردُود شیطان سے پناہ مانگی۔ جوں جوں وہ اس کے قریب ہوتے جاتے سیاہی زیادہ صاف نظر آتی جاتی یہاں تک کہ جب وہ اس کے نیچے پہنچ گئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک دیو ہے جس کا سر ایک بڑے گنبد جیسا، دانت نیزوں کی طرح، جبڑا سڑک کی مانند، نتھنے لوٹوں کی مثل، کان جیسے چمڑے کی ڈھالیں، منہ غار، دانت پتھر کے ستون اور ہاتھ سلائیوں کی طرح اور ٹانگیں ستونوں جیسی۔ اس کا سر بادلوں کے اندر تھا اور پاؤں زمین کے نیچے مٹی میں۔ اس دیو کو دیکھتے ہی حسن نے اس کے آگے جُھک کر زمین چُومی۔ دیو نے کہا اے حسن، مجھ سے ڈر نہیں، میں اس ملک کے باشندوں کا سردار ہوں اور یہ جزائر واق میں سے پہلا جزیرہ ہے۔ میں مسلمان ہوں اور خُدا کی توحید کا قائل، تمھارے آنے کی خبر سُن کر اور تمھارا حال معلوم کرکے مجھے اس بات کی آرزو ہوئی کہ جادوگروں کے ملک کو چھوڑ کر ایسی جگہ رہوں جو غیر آباد ہو، جہاں دُور دُور تک نہ انسان بستے ہوں نہ جنّات۔ اکیلا رہ کر میں خُدا کی عبادت کرتا رہوں یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری رہبری کروں تاکہ تم ان جزیروں سے نکل جاؤ۔ میں محض رات کو دکھائی دیتا ہوں۔ میری طرف سے تم مطمئن رہو کیوں کہ جیسے تم مسلمان ہو میں بھی ہوں۔ دیو کی باتیں سُن کر حسن بہت خوش ہوا، اسے اپنی نجات کا یقین آگیا اور دیو کی طرف مخاطب ہو کر بولا خدا تجھے نیک بدلہ دے! آ ہمارے ساتھ

چلی۔ دیوان کے آگے آگے ہولیا، ہم باتیں اور ہنسی مذاق کرتے روانہ ہو گئے سب خوش اور مطمئن تھے اور حسن اپنی بیوی سے اپنی بیتی کہتا جاتا تھا۔ اس طرح وہ رات بھر چلتے رہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

آٹھ سو ستائیسویں رات

آٹھ سو ستائیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! وہ لوگ رات بھر گھوڑوں پر سوار رہے اور گھوڑے بجلی کی طرح چلا کیے۔ جب دن نکلا تو ہر ایک نے اپنی خرجی میں ہاتھ ڈالا کھانا نکال کر کھایا اور پانی نکال کر پیا۔ اس کے بعد وہ اور تیز چلنے لگے، دیوان کے آگے آگے تھا، وہ ایک راستہ چھوڑ کر انھیں دوسرے راستے سے لے گیا جہاں بالکل آمدورفت نہ تھی اور جو سمندر سے لگا لگا جاتا تھا۔ اسی طرح وہ ایک مہینے تک گھاٹیاں اور بیابان طے کرتے رہے اور اکتیسویں دن انھیں گرد اڑتی نظر آئی۔ جو اٹھ کر چاروں طرف پھیل گئی اور دن تاریک نظر آنے لگا اور ڈراؤنی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ حسن گھبرا گیا اور اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ بڑھیا نے حسن کی طرف مخاطب ہو کر کہا، بیٹا جزائر واق کا لشکر آ پہنچا ہے اور وہ ہمیں فوراً گرفتار کر لیں گے۔ حسن بولا، اب کیا کیا جائے؟ اس نے جواب دیا کہ ڈنڈا زمین پر مار۔ ڈنڈا زمین پر مارنا تھا کہ ساتوں بادشاہ نکل کر حسن کے پاس آئے اور اس کے آگے زمین چوم کر کہنے لگے کہ ڈر نہیں۔ گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی یہ بات سن کر حسن خوش ہو گیا اور کہنے لگا اے جنوں اور دیووں کے سردارو! تم نے خوب کیا، یہی تمھاری مدد کا وقت ہے۔ وہ بولے کہ تو اپنی بیوی بچوں اور ساتھیوں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جا، ہم ان سے نبٹ لیں گے کیوں کہ

ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ حق پر ہو اور وہ باطل پر، خدا ہمیں ان پر فتح دے گا۔ حسن اس کے بیوی بچے اور بڑھیا گھوڑوں پر سے اُتر پڑے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی.....

آٹھ سو اٹھائیسویں رات

آٹھ سو اٹھائیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! حسن اس کی بیوی بچے اور بڑھیا گھوڑوں سے اُتر کر پہاڑ کے دامن پر چڑھ گئے۔ اتنے میں ملکہ نورالہدا اپنے لشکر کے میمنے اور میسرے کے ساتھ آپہنچی، سرداروں نے صفیں آراستہ کیں، دونوں لشکر مقابلے میں آئے دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے، شعلے بلند ہونے، بہادر بڑھنے اور بزدل بھاگنے لگے، جنوں کے منہ سے آگ کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں یہاں تک کہ رات ہو گئی اور دونوں گروہ الگ الگ ہو گئے۔ جب وہ گھوڑوں سے اُترے تو انھوں نے آگ جلائی۔ اب ساتوں بادشاہوں نے حسن کے پاس آکر زمین چومی، اس نے ان کا شکریہ ادا، فتح کی دُعا دی اور ان سے پوچھا کہ ملکہ نورالہدا کی فوج کے مقابلے میں ان کا کیا حال رہا؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ تین دن سے زیادہ ہمارے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے، آج بھی میدان ہمارے ہی ہاتھ رہا ہے۔ ہم نے ان میں سے قریب دو ہزار کے قیدی پکڑے ہیں اور قتل تو اتنوں کو کیا ہے جن کی گنتی نہیں لہذا خوش ہو اور غم نہ کر۔ اس کے بعد وہ اس سے رخصت ہو کر اپنے لشکر کی حفاظت کے لیے روانہ ہو گئے اور انھوں نے رات بھر آگ جلتی رکھی۔ صبح ہوئی اور دن نکلا تو سوار گھوڑوں پر سوار ہو گئے، چمکدار تلواروں اور گندمی نیزوں سے لڑنے لگے، تمام رات انھوں نے گھوڑوں کی پیٹھ پر گزاری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک موجزن سمندر ہیں اور لڑائی کے شعلے

پٹیں مار رہے ہیں۔ انھوں نے اتنے سخت حملے کیے کہ واق کا لشکر دبنے لگا، ان کے
دل ٹوٹ گئے، ہمت پست ہوگئی اور قدم ڈگمگانے لگے۔ وہ جس طرف بھاگ کر
جاتے شکست کھاتے۔ بالآخر وہ دُم دبا کر بھاگے۔ ان کا بڑا حصہ مارا جاچکا تھا، ملکہ
نورالہدا اور اس کے سردار اور مصاحب قید ہوچکے تھے۔

جب سویرا ہوا تو ساتوں بادشاہوں نے آکر حسن کے لیے مرمر کا تخت لگایا
جس میں موتی اور ہیرے جڑے ہوے تھے اور تخت پر اسے بٹھا کر اس کے پاس
ایک اور بچھایا جو اس کی بیوی منارالسنا کے لیے تھا۔ یہ تخت ہاتھی دانت کا تھا
جس پر قیمتی سونے کے پتر چڑھے ہوے تھے وہ اس پر بیٹھ گئی۔ اس کے پہلو میں
انھوں نے تیسرا تخت ڈالا، اس پر بڑھیا شواہی ذات الدواہی کو بٹھایا۔ اس کے
بعد انھوں نے حسن کے سامنے قیدیوں کو پیش کیا اُن میں ملکہ نورالہدا بھی تھی،
اس کی مشکیں بندھی ہوئی اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ بڑھیا نے اسے دیکھ کر
کہا، اری ظالمہ اور فاجرہ، تیری سزا اب یہی ہوسکتی ہے کہ دو کتیوں کو بھوکا اور دو
گھوڑوں کو پیاسا رکھ کر تجھے گھوڑوں کی دُموں سے باندھ دیا جائے اور انھیں
سمندر کی طرف بھگا کر دونوں کتیوں کو تیرے پیچھے لگا دیا جائے تاکہ وہ تیرے
تکے بوٹیاں کر ڈالیں۔ اری فاجرہ! تو نے اپنی بہن کے ساتھ یہ حرکت کیوں کی؟
حالاں کہ اس نے خدا اور رسول کی سنت کے موافق حلال طور پر شادی کی ہے،
اسلام بھی رہبانیت نہیں سکھاتا اور نکاح کرنا تمام بڑے پیغمبروں کی سنت
رہی ہے، عورتیں مردوں ہی کے لیے تو پیدا ہوئی ہیں۔ اب حسن نے حکم دیا کہ
تمام قیدی قتل کر دیے جائیں اور بڑھیا نے چلا کر کہا کہ سب کو قتل کر دیا جائے
ایک بھی نہ بچنے پائے۔ شہزادی منارالسنا نے اپنی بہن کو اس حالت میں دیکھا
کہ وہ گرفتار ہے اور اس کے بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تو وہ رونے لگی، اس نے

پوچھا کہ بہن، تو جانتی ہے کہ یہ کون شخص ہے جس نے ہمارے ملک میں آکر ہم پر فتح پائی ہے اور ہمیں قیدی بنایا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ عجیب و غریب بات ہے۔ ہمیں اس شخص نے نیچا دکھایا ہے جس کا نام حسن ہے اور خدا نے اسے ہم پر بھی حاکم بنایا ہے اور ہمارے تمام ملک پر بھی، اسی نے ہمیں اور جنوں کے بادشاہوں کو شکست دی ہے۔ اس کی بہن نے کہا کہ محض اس ٹوپی اور ڈنڈے کی وجہ سے خدا نے اسے تم پر جیت دی ہے اور تمھیں نیچا دکھایا اور گرفتار کیا ہے۔ اب ملکہ کو یقین ہو گیا کہ اسی وجہ سے اس نے اپنی بیوی کو چھڑا لیا ہے اور اس نے اپنی بہن کے آگے اس قدر ہاتھ جوڑے کہ اس کا دل پسیج گیا۔

شہزادی نے اپنے شوہر حسن سے کہا کہ تو میری بہن کو کیا سزا دینا چاہتا ہے؟ اس وقت وہ تیرے قبضے میں ہے لیکن اس نے تیرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے جس کی تو اسے سزا دے۔ حسن نے کہا کہ یہ کافی ہے کہ اس نے تیرے ساتھ برا سلوک کیا۔ اس نے جواب دیا کہ جو کچھ برائی اس نے میرے ساتھ کی اس میں وہ مجبور تھی۔ میرے باپ کا دل میرے لیے پہلے ہی میری وجہ سے دکھا ہوا ہے، اگر میری بہن بھی نہ رہی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ حسن بولا کہ رائے تیری رائے ہے، جو تیرا جی چاہے کر۔ یہ سن کر شاہزادی منارالسنا نے حکم دیا کہ سب قیدی آزاد کر دیے جائیں اور اسی طرح اس کی بہن بھی۔ اس کے بعد اس نے بڑھ کر اپنی بہن کو گلے سے لگا لیا، دونوں رونے لگیں اور بہت دیر تک روتی رہیں۔ پھر ملکہ نورالہدا نے اپنی بہن سے کہا کہ بہن، جو برائی میں نے تیرے ساتھ کی ہے اس کا بدلہ نہ لیجیو۔ شہزادی منارالسنا بولی بہن، یہ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ دونوں تخت پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں اور منارالسنا نے اپنی بہن اور بڑھیا میں بھی ملاپ کرا دیا اور دونوں خوش ہو گئیں۔ اس کے

بعد حسن نے اس لشکر کو جو ڈونڈے کی خدمت میں تھا رخصت کیا اور جو فتح انھوں نے اس کے دشمنوں پر حاصل کی تھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ شہزادی منار السنا نے اپنی بہن سے وہ ساری سرگزشت بیان کی جو اسے اس کے شوہر حسن کے ساتھ پیش آئی تھی اور وہ تمام تکلیفیں جو حسن نے اس کی خاطر اٹھائی تھیں اور کہا کہ ایسے کارنامے کون کر سکتا تھا اور اتنی قوت کس میں تھی! محض خدا کی مدد تھی کہ وہ ہمارے ملک میں آیا تجھے گرفتار کیا، تیرے لشکر کو مار بھگایا اور تیرے باپ ملک اکبر کو نیچا دکھایا جو تمام جنوں کے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے حق میں کمی کرنا ظلم ہے۔ اس کی بہن بولی کہ اے بہن! تیرا کہنا سچ ہے کہ اس نے اس قدر مصیبتیں جھیلیں، اور بہن، یہ سب تیری خاطر تھیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔ . . .

آٹھ سو انتیسویں رات

آٹھ سو انتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب شاہزادی منار السنا نے اپنی بہن سے حسن کے اوصاف بیان کیے اور اسی طرح کی باتوں چیتوں میں ساری رات گزار دی، جب سورج نکلا تو کوچ کی سوچی اور ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ منار السنا بڑھیا سے بھی رخصت ہوئی کیوں کہ وہ اس کے اور اپنی بہن کے درمیان ملاپ کرا چکی تھی۔ اب حسن نے زمین پر ڈنڈا مارا، موکل آ پہنچے اور انھوں نے سلام کر کے کہا کہ شکر ہے خدا کا کہ اس نے تیرا دل ٹھنڈا کیا، اب بتا تیرا کیا حکم ہے تاکہ ہم اسے پلک مارنے سے پہلے بجا لائیں۔ حسن نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خدا تمھیں نیک بدلہ دے۔ اچھا اب دو بہترین گھوڑے ہمارے لیے لے آؤ، وہ فوراً لے آئے اور اس کے

سامنے کسے کسائے پیش کر دیے۔ ایک پر حسن سوار ہو گیا اور اپنے بڑے بیٹے کو آگے بٹھا لیا، دوسرے پر اس کی بیوی بیٹھ گئی اور چھوٹے بیٹے کو ساتھ لے لیا۔ ملکہ نورالہدا اور بڑھیا بھی سوار ہو گئیں اور سب اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے، حسن اور اس کی بیوی دائیں طرف اور ملکہ نورالہدا اور بڑھیا بائیں طرف۔ پورے ایک مہینے تک سفر کرنے کے بعد حسن اور اس کے بیوی بچے ایک شہر کے قریب پہنچے جس کے اِردگِرد بہت سے درخت اور نہریں تھیں۔ درختوں کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑوں سے اُتر کر سستانے لگے۔

بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ بہت سے گھوڑے آتے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھ کر حسن اٹھ کھڑا ہوا، ان سے مل کر معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ حسون ارض کافور اور قلعۂ طیور کا مالک ہے۔ حسن نے بڑھ کر اس کے ہاتھ چومے اور سلام کیا۔ بادشاہ بھی گھوڑے پر سے اُتر پڑا، دونوں درختوں کے نیچے فرش پر بیٹھ گئے بادشاہ نے حسن کو سلام کیا اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دی، اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور کہا اے حسن! اپنی سرگزشت شروع سے لے کر آخر تک بیان کر۔ حسن نے ساری داستان سُنادی، بادشاہ حسون کو بڑا تعجب ہوا وہ کہنے لگا کہ بیٹا، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جزائر واق جاکر لوٹ آیا ہو سوائے تیرے، تیرا ماجرا عجیب و غریب ہے لیکن شکر ہے خدا کا کہ تو صحیح و سلامت رہا۔ اس کے بعد بادشاہ سوار ہو گیا اور حسن سے کہا کہ تو بھی سوار ہو جا اور میرے ساتھ چل۔ حسن نے ایسا ہی کیا، چلتے چلتے شہر پہنچے، شاہی محل میں داخل ہو کر بادشاہ اترا۔ حسن اور اس کے بیوی بچوں کو مہمان خانے میں اُتارا جہاں وہ دس دن تک کھانے پینے اور کھیل کود میں مشغول رہے۔ پھر حسن نے بادشاہ حسون سے وطن جانے کی اجازت مانگی اس نے اجازت دے دی، حسن اور اس کے بیوی بچے سوار ہو گئے، بادشاہ بھی سوار

ہو کر دس دن تک ان کے ہم رکاب رہا اور اُن سے رخصت ہو کر لوٹ آیا۔ حسن اور اس کے بیوی بچے پورے ایک مہینے تک چلنے کے بعد ایک بڑے غار کے پاس پہنچے جس کی زمین پیتل کی تھی۔ حسن نے اپنی بیوی سے کہا تو اسے پہچانتی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ حسن نے کہا اس میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کا نام ابوالرویش ہے، ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے کیوں کہ انھی نے مجھے بادشاہ حسون سے ملایا تھا۔

حسن اپنی بیوی سے شیخ ابوالرویش کا ذکر کر ہی رہا تھا کہ وہ غار میں سے نکلا۔ اسے دیکھ کر حسن اپنے گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور اس کے ہاتھ چومے۔ شیخ نے اسے سلام کیا اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دی اور بہت خوش ہوا پھر دونوں بیٹھ گئے اور حسن نے اس سے وہ ساری باتیں بیان کیں جو اسے جزائر واق میں پیش آئی تھیں۔ شیخ ابوالرویش نے پوچھا اے حسن تو نے اپنے بیوی بچوں کو کس طرح چھڑایا؟ حسن نے ڈنڈے اور ٹوپی کا قصہ اُسے سنایا۔ شیخ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے کہا، اے حسن بیٹا، اگر یہ ڈنڈا اور یہ ٹوپی نہ ہوتی تو تو اپنے بیوی بچوں کو چھڑا نہ سکتا تھا۔ حسن بولا اے میرے آقا، ہاں۔ وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کسی نے غار کے دروازے پر دستک دی۔ شیخ ابوالرویش نے دروازہ کھولا، دیکھا کہ شیخ عبدالقدوس ہاتھی پر سوار آیا ہوا ہے۔ شیخ ابوالرویش نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا، گلے لگایا اور بہت خوش ہوا اور اس کی سلامتی پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد اس نے حسن سے کہا کہ شیخ عبدالقدس کو بھی اپنی ساری کہانی سنا دے۔ حسن نے ساری کہانی شروع سے لے کر آخر تک سنا دی یہاں تک کہ وہ ڈنڈے اور ٹوپی کے قصے تک پہنچا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

آٹھ سو تیسویں رات

آٹھ سو تیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب حسن اپنا قصہ بیان کرتے کرتے ڈنڈے اور ٹوپی تک پہنچا تو شیخ عبدالقدوس نے کہا بیٹا، اب چونکہ تو اپنے بیوی بچوں کو چھڑا لایا ہے ڈنڈے اور ٹوپی کی ضرورت باقی نہیں، علاوہ ازیں ہماری مدد سے تو جزائر واق تک پہنچا ہے اور میں نے اپنی بھتیجیوں کی وجہ سے تجھ پر احسان کیا ہے لہٰذا مہربانی کرکے تو ڈنڈا مجھے دے دے اور ٹوپی شیخ ابوالرویش کو۔ یہ بات سن کر حسن نے سر نیچا کر لیا، اسے انکار کرتے شرم آئی۔ اپنے دل میں کہا کہ ان دونوں بزرگوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اور محض انھی کی وجہ سے میری رسائی جزائر واق تک ہوئی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو نہ میں اس جگہ تک پہنچتا نہ اپنے بیوی بچوں کو چھڑا سکتا نہ مجھے یہ ڈنڈا اور یہ ٹوپی ملتی۔ یہ سوچ کر اس نے سر اٹھایا اور کہا ہاں میں تمھیں دیتا ہوں، لیکن اے میرے آقاؤ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بیوی کا باپ ملک اکبر فوج لے کر آ جائے اور ڈنڈے اور ٹوپی کے چلے جانے کی وجہ سے میں اس کا مقابلہ نہ کر سکوں۔ شیخ نے حسن سے کہا بیٹا، ڈر نہیں، ہم تیری طرف سے اس جگہ گھات میں لگے رہیں گے اور جو کوئی بھی تیرے خسر کی طرف سے آئے گا اسے تیرے پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ تو مطمئن رہ اور کسی طرح کا خوف نہ کر۔

شیخ کی گفتگو سن کر حسن کو شرم آئی اور اس نے ٹوپی شیخ ابوالرویش کو دے کر عبدالقدوس سے کہا کہ مجھے میرے وطن پہنچا دے اور ڈنڈا لے لے۔ دونوں بزرگ خوش ہو گئے اور حسن کو اس قدر مال دیا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ تین دن ٹھیرنے کے بعد حسن نے سفر کی اجازت مانگی، شیخ عبدالقدوس

بھی اس کے ساتھ سفر کے لیے تیار ہو گیا۔ جب حسن ایک گھوڑے پر بیٹھا اور دوسرے پر اپنی بیوی کو سوار کر دیا تو شیخ نے سیٹی بجائی، جنگل میں سے ایک بہت بڑا ہاتھی دوڑتا ہوا آ پہنچا۔ شیخ اس پر سوار ہو گیا، سب روانہ ہو گئے اور شیخ ابوالرویش اپنے غار کے اندر چلا گیا۔ شیخ کی رہبری سے وہ آسان راستوں اور قریب کے موڑوں میں سے ہو کر چلنے لگے، اس کا وطن جتنا قریب آتا جاتا اتنی ہی اسے خوشی ہوتی کہ اب وہ بیوی بچّوں کو لے کر اپنی ماں سے ملے گا۔ اس نے خدا کا شکر کیا اور اس کی عنایتوں اور مہربانیوں کا ممنون ہوا۔ اتنے میں انھیں قبۂ خضرا، فوارہ اور سبز محل دکھائی دینے لگے اور جبل سحاب بھی دوُر سے نظر آنے لگا۔ شیخ عبدالقدوس نے کہا، ای حسن خوش ہو اب آرام ہی آرام ہی، آج ہی رات تو میری بھتیجیوں کا مہمان ہو گا۔ حسن اور اس کی بیوی یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے گنبد کے پاس اُتر کر ذرا دم لیا اور کھا پی کر پھر سوار ہو گئے اور محل کے قریب پہنچے۔

جب وہ محل کے پاس پہنچ گئے تو شیخ عبدالقدوس کے بھائی بادشاہ کی بیٹیوں نے نکل کر ان کا خیر مقدم کیا۔ اسی طرح انھوں نے اپنے چچا کو بھی سلام کیا اس نے سلام کا جواب دیا اور اُن سے کہا ای میری بھتیجیو، مَیں نے تمھارے بھائی حسن کی مراد پوُری کر دی ہی اور اس کی مدد کر کے اس کے بیوی بچّوں کو چھڑا دیا ہی۔ لڑکیوں نے بڑھ کر حسن کو گلے لگایا، اس سے مل کر خوش ہوئیں، اس کی خیر و عافیت پر اُسے مبارک باد دی اور نیز اس بات پر کہ اس کے بیوی بچّے اسے مل گئے۔ یہ دن اُن کے لیے عید کا دن تھا۔ اب حسن کی چھوٹی بہن بڑھ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ حسن بھی یہ خیال کر کے کہ وہ بہن سے اتنے دنوں جُدا رہا ہی رو پڑا۔ اس کے بعد

وہ شکوے شکایت کرنے لگی کہ جدائی اور فراق کے کتنے صدمے اٹھائے ہیں۔ حسن نے کہا بہن، میں اس معاملے میں تیری بہنوں سے بھی زیادہ شکر گزار ہوں، خدا تیری مدد کرے اور تجھ پر عنایت کی نظر رکھے۔ پھر اس نے سفر کے تمام حالات شروع سے لے کر آخر تک اور ساری مصیبتیں جو اس نے جھیلی تھیں مع ان واقعات کے جو سالی کے ساتھ پیش آئے تھے اور یہ کہ کس طرح اس نے بیوی بچوں کو چھڑایا بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ اسے کس قدر خطروں کا سامنا ہوا یہاں تک کہ اس کی سالی اسے اور اس کے بیوی بچوں کو ذبح کر ڈالنے کے لیے تیار تھی۔ اس کے بعد اس نے اسے ڈنڈے اور ٹوپی کی کہانی سنائی اور کہا کہ ان دونوں چیزوں کو شیخ ابوالرویش اور شیخ عبدالقدوس نے مجھ سے مانگ لیا ہے اور محض تیری خاطر میں نے انھیں دونوں چیزیں دے دیں۔ لڑکی نے اس پر حسن کا شکریہ ادا کیا اور اسے عمر کی درازی کی دعا دی۔ حسن نے کہا کہ خدا کی قسم میں تیری بھلائیوں کو ہرگز نہیں بھول سکتا جو تو نے میرے ساتھ شروع سے لے کر آخر تک کی ہیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔ . . .

آٹھ سو اکتیسویں رات

آٹھ سو اکتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا، اے نیک نہاد بادشاہ! حسن نے اپنی بہن سے کہا کہ میں تیری بھلائیاں ہرگز نہیں بھول سکتا جو تو نے میرے ساتھ شروع سے لے کر آخر تک کی ہیں۔ اب اس نے حسن کی بیوی منار السنا کو گلے لگا لیا اور اس کے بیٹوں کو سینے سے چمٹا کر کہا، اے ملک اکبر کی بیٹی! کیا تیرے دل میں اتنا کم رحم تھا کہ تو نے اسے اس کے بچوں سے جدا کر دیا اور

اس کا دل بہلایا؟ کیا اس سے تیرا یہ مقصد تھا کہ وہ مر جائے؟ منار آلسنا ہنس پڑی اور کہا خدا کا یہی حکم تھا، جو کوئی لوگوں کے ساتھ بُرائی کرتا ہے خدا اس کے ساتھ بُری طرح پیش آتا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے کھانا آیا سب نے کھایا اور خوش ہوے۔ اسی طرح کھاتے پیتے میں انھوں نے خوش و خرم دس دن گزارے اور جب دس دن ہو چکے تو حسن نے سفر کی تیاری کی، اس کی بہن نے اس قدر مال و دولت اور تحفے تحائف اس کے ساتھ کر دیے کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد اس نے حسن کو رخصت کرنے کی غرض سے اُسے اپنے گلے اور سینے سے لگا لیا اور حسن نے شیخ عبدالقدوس کو ڈنڈا دے دیا جس پر وہ بہت خوش ہوا، اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے لے کر اپنی جگہ چلا گیا۔ اب حسن اور اس کے بیوی بچے سوار ہوگئے، لڑکیاں اپنے محل سے نکل کر اسے پہنچا آئیں، دو مہینے اور دس دن تک جنگل بیابان میں سفر کرتے کرتے حسن بغداد پہنچا اور اپنے گھر کے چور دروازے پر پہنچ کر جو جنگل کی طرف کھلتا تھا دستک دی۔ وہ اتنے دنوں غائب رہا تھا کہ اس کی ماں کی نیند حرام ہو گئی تھی، رونے پیٹنے میں اس کے دن گزرتے تھے یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ گئی، نہ کھاتی نہ پیتی، ہمیشہ اپنے بیٹے کو یاد کرتی۔ اسے بیٹے کے واپس آنے کا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ حسن کو اپنی ماں کے رونے کی آواز آئی اور ماں نے اسے دروازے پر یہ کہتے سُنا کہ اماں، زمانے کی مہربانی سے ہم سب پھر مل گئے۔

حسن کی آواز پہچان کر ماں دروازے کی طرف بڑھی لیکن ایک دل کہتا کہ وہی ہے اور ایک دل کہتا کہ وہ نہیں ہے۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اس کا بیٹا اور بیٹے کے بیوی بچے کھڑے ہیں، مارے خوشی کے اس نے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ حسن نے ہوش میں لانے کی

کوشش کی اور وہ ہوش میں آگئی، اس نے حسن کو گلے سے لگالیا اور رونے لگی۔ اس کے بعد اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ سارا سامان اندر لے جائیں اور وہ اندر لے گئے اور ماں نے اپنی بہو کو گلے لگایا، اس کے سر اور دونوں پانو چومے اور کہا اے ملک اکبر کی بیٹی، اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے تو میں خدا سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تو اتنی مدت تک کیوں غائب رہا؟ اس پر حسن نے اپنی ساری کہانی شروع سے لے کر آخر تک کہہ سنائی۔ ماں نے زور سے ایک چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی۔ ہوش آیا تو بولی، بیٹا، تو نے ڈنڈا اور ٹوپی ناحق دے دی، اگر تو انھیں اپنے پاس رکھتا تو ساری دنیا کا بادشاہ ہو جاتا۔ لیکن شکر ہے کہ تو، تیری بیوی اور تیرے بچے سلامت ہیں۔ رات انھوں نے بڑی خوشی سے گزاری، صبح ہوئی تو حسن نے اپنے کپڑے بدل کر ایک نہایت نفیس پوشاک پہنی اور بازار جا کر غلام، باندیاں کپڑے، گہنے، قالینیں اور قیمتی برتن خریدے جن کا جواب بادشاہوں کے ہاں بھی نہ ہوگا اور پھر مکان، باغ اور جاگیریں مول لیں۔ اس کے بعد وہ اور اس کی اولاد، بیوی اور ماں خوب کھانے پینے اور مزے اڑانے، زندگی بسر کرنے اور بڑے عیش و عشرت سے رہنے لگے یہاں تک کہ مزوں کو کرکرا اور صحبتوں کو درہم برہم کرنے والی موت آپہنچی۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری حکومت ہے اور جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والی ہے اور کبھی مرتی نہیں۔

خلیفہ ماہی گیر کی کہانی

پُرانے زمانے کا ذکر ہے، بغداد میں خلیفہ نام ایک ماہی گیر رہتا تھا۔ بہت غریب، بے چارے نے افلاس کے مارے شادی بھی نہیں کی تھی۔ ایک دن وہ اپنا جال لے کر دستور کے موافق دریا پر پہنچا تاکہ دوسرے ماہی گیروں سے پہلے شکار کھیلے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر اس نے دامن اُوپر اٹھائے، کمر کسی اور پانی میں جال پھینکا۔ ایک بار پھر دوسری بار، تیسری بار، یہاں تک کہ دس مرتبہ جال ڈالے مگر کوئی چیز نہ پھنسی۔ یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا، اپنے دل میں غور کرنے لگا اور کہا کہ میں اس خدا سے مغفرت مانگتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جو ہمیشہ زندہ ہے اور تمام چیزوں کو سنبھالے ہوئے ہے، سوا خدا کے نہ کسی میں قوت ہے نہ طاقت، جو وہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا، رزق دینے کا ذمے دار وہی خدا ہے، اگر وہ کسی کو دینا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو نہ دینا چاہے کوئی اسے نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر وہ سر جھکائے سوچتا رہا، طبیعت نے صلاح دی کہ ایک آخری بار اور پھینکوں اور خدا پر بھروسا کروں، ممکن ہے کہ وہ مجھے نا امید نہ کرے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اپنا ہاتھ خوب لمبا کر کے جال پھینکا اور اس کی رسیاں پکڑ کر تھوڑی دیر تک انتظار کیا، پھر جو اُسے کھینچا تو دیکھا کہ وہ بھاری ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔

آٹھ سو بتیسویں رات

آٹھ سو بتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! اب

جو ماہی گیر نے جال کھینچا تو اسے بھاری سا معلوم ہوا، اس نے بہت سنبھال کر کھینچا جب وہ باہر آیا تو اس میں ایک کانا اور لنگڑا بندر نکلا۔ اسے دیکھ کر خلیفہ لاحول پڑھنے لگا اور کہا کہ میری قسمت بھی عجب منحوس ہو کہ آج کے مبارک دن میں مجھے یہ ہاتھ آیا لیکن قسمت میں یہی لکھا ہو کیا کیا جائے۔ اس نے بندر کو ایک رسّی سے باندھا اور رسّی ایک درخت سے اٹکا دی۔ ماہی گیر کے پاس ایک کوڑا تھا، اس نے کوڑا ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا اور چاہتا ہی تھا کہ بندر کو مارے اتنے میں خدا کی قدرت سے بندر نہایت فصیح زبان میں بولا، ای خلیفہ اپنا ہاتھ روک لے اور مجھے نہ مار بلکہ مجھے یہیں بندھا چھوڑ کر دریا پر جا اور خدا پر بھروسا کر کے جال پھینک، وہ تجھے روزی دے گا۔ بندر کی باتیں سُن کر خلیفہ نے جال اٹھایا، دریا پر جا کر پھینکا اور کچھ دیر تک ڈوریاں ڈھیلی رکھنے کے بعد اسے کھینچا، محسوس ہوا کہ جال پہلے سے بھی بھاری ہو وہ بہ مشکل اسے کھینچتا کنارے پر لایا اور دیکھا کہ اس میں ایک دوسرا بندر ہو جس کے دانت دور دور ہیں، آنکھیں کالی کالی، ہاتھ لال لال، وہ ہنس رہا ہو اور اس کی کمر سے ایک چیتھڑا بندھا ہوا ہو۔ خلیفہ بولا کہ سب تعریفیں خدا کے لیے ہیں جس نے دریا کی مچھلیوں کو بندر بنا دیا، اور اس بندر کے پاس جو درخت سے بندھا ہوا تھا آکر کہنے لگا ای منحوس ! تو نے مجھے کیسا بُرا مشورہ دیا کہ دوسرا بندر بھی میرے پلّے پڑا۔ چوں کہ سویرے سویرے میں نے تجھ لنگڑے اور کانے کا منہ دیکھا ہو اس لیے میں دن بھر پریشان رہوں گا، مجھے نہ دینار ملے گا نہ درہم۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں ایک ڈنڈا لیا اور اسے تین بار ہوا میں چکر دے کر چاہتا ہی تھا کہ بندر کو مارے، بندر دُہائی مانگنے لگا اور کہا کہ خدا کے لیے اس میرے ساتھی کے طفیل میں مجھے معاف کر دے اور اس سے اپنا

مطلب بیان کر کہ تو کیا چاہتا ہی، وہ تیری مُراد پوری کر دے گا۔ خلیفہ نے ڈنڈا پھینک دیا اور اسے معاف کر دیا۔

اس کے بعد وہ دوسرے بندر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بندر نے کہا ای خلیفہ! ایسی باتوں سے تجھے کچھ نہ ملے گا۔ تو اپنا فائدہ چاہتا ہی تو میری بات سُن۔ اگر تو نے میرا کہنا مان لیا اور مخالفت نہ کی تو میرے سبب سے تو امیر ہو جائے گا۔ خلیفہ بولا وہ کیا بات ہی جس میں تو میری موافقت چاہتا ہی؟ بندر نے کہا مجھے یہیں بندھا چھوڑ کر دریا پر جا اور جال پھینک، اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے۔ خلیفہ جال لے کر دریا کے پاس گیا، جال پھینک کر تھوڑی دیر تک انتظار کیا، کھینچا تو بھاری معلوم ہوا، آہستہ آہستہ کھینچ کر کنارے پر لایا دیکھا کہ اُس میں ایک بندر اور ہی لیکن یہ بندر سُرخ سفید تھا اور نیلے کپڑے پہنے ہوئے۔ اس کے ہاتھ پاؤں رنگے ہوئے تھے اور آنکھیں سُرمئی۔ خلیفہ بولا سبحان اللہ، واقعی آج کا دن شروع سے لے کر آخر تک مبارک نکلا کیوں کہ پہلے بندر کی وجہ سے اس کا شگون اچھا نکلا، مضمون کی سُرخی سے پتا چل جاتا ہی کہ اس کے اندر کیا ہوگا۔ آج کا دن بندروں کا دن ہی اور دریا میں ایک بھی مچھلی باقی نہیں، گویا ہم بندر ہی کا شکار کرنے آئے ہیں، ساری تعریفیں خُدا کے لیے ہیں جس نے مچھلیوں کو بندر سے بدل دیا۔ پھر وہ اس تیسرے بندر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ای منحوس، بتا کہ تو کون ہی؟ اس نے کہا ای خلیفہ کیا تو مجھے پہچانتا نہیں؟ خلیفہ بولا نہیں۔ بندر بولا کہ میں یہودی صراف ابوالسعادات کا بندر ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا تیرا کام کیا ہی؟ اس نے جواب دیا کہ جب میں اُسے صباح بخیر کہتا ہوں تو وہ پانچ دینار کما لیتا ہی اور جب میں شام کو شام بخیر کہتا ہوں تو وہ پھر پانچ دینار کما لیتا ہی۔ خلیفہ نے پہلے

بندر کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ای منحوس، دیکھ دوسرے لوگوں کے بندر کیسے اچھے ہیں! ایک تو ہر کہ صبح کو اپنی لنگڑی، کانی اور منحوس صورت دکھا کر مجھے فقیر مفلس اور بھوکا بنا دیتا ہی۔ یہ کہ کر اس نے ڈنڈا اٹھایا اور ہوا میں تین بار گھما کر چاہتا ہی تھا کہ بندر کو مارے، ابوالسعادات کا بندر بولا ای خلیفہ، جانے دے، اسے مار نہیں بلکہ میرے پاس آ تاکہ میں بتاؤں کہ تجھے کیا کرنا چاہیے۔ خلیفہ نے ڈنڈا پھینک دیا اور اس کے پاس جا کر کہا ای تمام بندروں کے سرتاج، تو مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہی؟ بندر بولا کہ جال لے کر دریا میں پھینک، مجھے اور ان بندروں کو اپنے پاس بیٹھا رہنے دے اور جو کچھ جال میں آئے اسے لے کر میرے پاس آ، میں تجھے ایسی بات بتاؤں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو تینتیسویں رات

آٹھ سو تینتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، ابوالسعادات کے بندر نے خلیفہ سے کہا کہ میں تجھے ایسی بات بتاؤں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ بسر وچشم اور جال لپیٹ کر اپنے کندھے پر رکھا، دریا پر جا کر اسے پھینکا اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد کھینچا دیکھا کہ اس میں ایک مچھلی کا بچہ آیا ہی جس کا سر بڑا، دُم ڈوئی جیسی ہی اور آنکھیں ایسی ہیں جیسے دو دینار۔ اُسے دیکھ کر خلیفہ خوش ہو گیا کیوں کہ عمر بھر کبھی اس نے ایسی مچھلی نہیں پکڑی تھی اور تعجب کے ساتھ اسے لے کر یہودی ابوالسعادات کے بندر کے پاس آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ساری دنیا اس

کے قبضے میں آگئی۔ بندر بولا، اے خلیفہ، تو اس مچھلی کا کیا کرے گا اور اپنے بندر کے متعلق تیرا کیا ارادہ ہے؟ خلیفہ نے کہا اے بندروں کے آقا! سن میں کیا کیا کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی ترکیب سے اپنے اس ملعون بندر کو مار ڈالوں، اس کے بدلے تجھے اپنے پاس رکھوں اور ہر روز جو تیرا جی چاہے تجھے کھلاؤں۔ بندر بولا چوں کہ تو نے مجھے پسند کر لیا ہے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تجھے کیا کرنا چاہیے، خدا نے چاہا تو تیری حالت سدھر جائے گی۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں اسے اچھی طرح سے سمجھ لے۔ وہ یہ ہے کہ میرے لیے بھی ایک رسی بٹ اور مجھے کسی درخت سے باندھ کر دریا کے پشتے کے بیچ میں کھڑا ہو، پھر دجلہ میں جال پھینک اور تھوڑی دیر ٹھیر کر اسے کھینچ، اس میں تجھے ایک ایسی مچھلی ملے گی جیسی تو نے عمر بھر نہ دیکھی ہو گی۔ مچھلی کو لے کر میرے پاس آئیو تا کہ میں بتاؤں کہ اس کے بعد تجھے کیا کرنا ہے۔ خلیفہ نے فوراً اٹھ کر دجلہ میں جال پھینکا اور جب اسے کھینچا تو اس میں ایک بیاض مچھلی نکلی جو بھیڑ کے بچے کے برابر تھی اور بالکل نئی صورت شکل کی۔

خلیفہ اس مچھلی کو لے کر بندر کے پاس گیا۔ بندر بولا کہ تھوڑی سی ہری گھاس لے آ، اور اس میں سے آدھی ایک ٹوکرے میں ڈال کر مچھلی کو اس کے اوپر رکھ دے، باقی آدھی سے اسے ڈھانک دے۔ پھر اس ٹوکرے کو کندھے پر رکھ کر بغداد جا ہمیں یہیں بندھا رہنے دے کوئی بھی تجھ سے بات کرے یا کچھ پوچھے تو بالکل جواب نہ دیجیو۔ جب تو صرافوں کے بازار میں پہنچے گا تو اس کے صدر میں تجھے صرافوں کے چودھری استاد ابوالسعادات یہودی کی دکان ملے گی، تو دیکھے گا کہ وہ ایک گدے پر بیٹھا ہوا ہے اس کے پیچھے تکیے لگے ہوئے ہیں، سامنے دو صندوق ایک سونے کے لیے، دوسرا چاندی کے لیے اور اس کے

اِردگرد بہت سے نوکر چاکر اور غلام ہیں۔ اس کے پاس پہنچ کر ٹوکرا اس کے آگے رکھ دیجیو اور کہیو ای ابوالسعادات، میں آج مچھلیاں مارنے نکلا تھا، تیرے نام پر جال پھینکا اور خدا نے یہ مچھلی بھیجی۔ وہ کہے گا کہ تو نے کسی اور کو تو نہیں دکھایا؟ تو کہیو کہ خدا کی قسم، نہیں۔ وہ تجھ سے مچھلی لے لے گا اور تجھے ایک دینار دے گا لیکن تو اُسے منظور نہ کیجیو۔ پھر وہ تجھے دو دینار دے گا، انھیں بھی نہ لیجیو غرض کہ جو کچھ وہ تجھے دینا چاہے اسے قبول نہ کیجیو خواہ وہ اس کے برابر سونا بھی تول کر تجھے کیوں نہ دے۔ پھر وہ پوچھے گا کہ آخر تو کیا چاہتا ہے؟ کہیو کہ خدا کی قسم میں اسے محض دو بولوں کے بدلے بیچوں گا۔ اگر وہ پوچھے کہ وہ دو بول کیا ہیں تو کہیو کہ اپنے پانو کے بل کھڑا ہو جا اور کہہ کہ ای بازار والو، گواہ رہو کہ میں خلیفہ ماہی گیر کے بندر سے اپنا بندر بدلتا ہوں اور اس کا حصّہ اپنے حصے سے اور اس کی قسمت اپنی قسمت سے۔ بس یہی مچھلی کی قیمت ہے، اشرفیوں کی مجھے ضرورت نہیں۔ اگر اس نے یہ کہہ دیا تو میں ہر روز تیرے پاس صباح بہ خیر اور شام بہ خیر کہنے آؤں گا اور ہر روز تو دس دینار سونے کے کما لیا کرے گا، اور یہ کانا، لنگڑا بندر روز ابوالسعادات یہودی کو صباح بہ خیر کہے گا اور خدا اُسے ہر روز قرض میں مبتلا کرتا رہے گا یہاں تک کہ وہ فقیر ہو جائے گا، اور اس کے پلّے ایک دمڑی بھی نہ رہے گی۔ یہ میری بات غور سے سُن لے تاکہ تو امیر ہو جائے۔ بندر کی باتیں سُن کر خلیفہ ماہی گیر بولا، ای تمام بندروں کے سرتاج میں تیرا مشورہ مانتا ہوں، لیکن خدا اس منحوس سے سمجھے! سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کیا کروں۔ بندر بولا کہ اسے بھی پانی میں چھوڑ دے اور مجھے بھی۔ خلیفہ نے کہا سر آنکھوں پر۔ یہ کہہ کر وہ بندر کے پاس گیا اور انھیں کھول کر چھوڑ دیا، وہ دریا میں چلے گئے۔ خلیفہ نے مچھلی اٹھائی اور اسے دھویا، ٹوکرے

میں ہری گھاس بچھائی اور مچھلی کو اس پر رکھ کر باقی گھاس سے ڈھانک دیا اور ٹوکرے کو کندھے پر رکھ کر چل دیا، اور شہرزاد کو صبح ہوئی۔۔۔۔

آٹھ سو چونتیسویں رات

آٹھ سو چونتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! خلیفہ ماہی گیر ٹوکرے کو اپنے کندھے پر رکھ کر چل دیا، شہر کے اندر پہنچا تو لوگوں نے اسے دیکھ کر آواز دی اور کہا ای خلیفہ تیرے پاس کیا ہی؟ لیکن وہ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوا بلکہ سیدھا صراف کی طرف چلا گیا اور بندر کے کہنے کے موافق دکانوں کے آگے سے گزرنے لگا یہاں تک کہ اس کی نظر یہودی پر پڑی دیکھا کہ وہ دکان میں بیٹھا ہوا ہی اور غلام اس کی خدمت میں حاضر ہیں گویا وہ خراسان کا کوئی بادشاہ ہی۔ خلیفہ نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ یہودی نے اسے سر اٹھا کر دیکھا اور پہچان کر کہا ای خلیفہ، مرحبا، تو کیا چاہتا ہی اور تیرا کیا مقصد ہی؟ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ کسی نے تجھ سے ٹیڑھی بات کہی ہی یا جھگڑا کیا ہی۔ بتا تاکہ میں تجھے والی کے پاس لے چلوں اور وہ تیرے حق میں انصاف کرے۔ خلیفہ بولا ای یہودیوں کے سردار، تیرے سر کی قسم مجھ سے کسی نے ٹیڑھی بات نہیں کی بلکہ آج میں تیری قسمت پر گھر سے نکلا اور دجلہ پر جا کر جال پھینکا اور یہ مچھلی نکلی۔ یہ کہہ کر اس نے ٹوکرا کھولا اور مچھلی کو یہودی کے آگے ڈال دیا۔ یہودی نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور کہا قسم ہی توریت، زبور اور احکامات کی کہ رات جب میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت مریم کے آگے کھڑا ہوں اور وہ کہہ رہی ہیں

کر سُن ای ابوالسعادات، میں نے تیرے پاس ایک عمدہ ہدیہ بھیجا ہے۔ بے شک وہ ہدیہ یہی ہوگا۔ اس کے بعد اس نے خلیفہ سے مخاطب ہوکر پوچھا تجھے قسم ہے اپنے دین کی بتا کہ اس مچھلی کو کسی اور نے تو نہیں دیکھا؟ خلیفہ نے کہا ای یہودیوں کے سردار، ابوبکر صدیق رضی کی قسم سوائے تیرے کسی نے نہیں دیکھا۔
اب یہودی نے اپنے ایک غلام کی طرف مخاطب ہوکر کہا یہ مچھلی میرے گھر لے جا اور سعادات سے کہیو کہ وہ اسے بناکر اور صاف کرکے میری واپسی کے وقت تک تل رکھے۔ خلیفہ نے بھی کہا کہ ای غلام، استاد کی بیوی سے کہیو کہ اس میں سے کچھ تلے اور کچھ بھونے۔ غلام مچھلی لے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہودی نے ایک دینار نکال کر خلیفہ ماہی گیر کو دیا اور کہا ای خلیفہ، اسے لے کر اپنے بال بچوں پر صرف کر۔ خلیفہ دینار اپنے ہاتھ میں دیکھ کر کہنے لگا کہ پاک ہے سارے عالم کا مالک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کبھی کوئی چیز سونے کی نہ دیکھی تھی۔ وہ دینار لے کر چند قدم چلا، یکایک اسے بندر کا کہنا یاد آگیا اس نے واپس آکر دینار پھینک دیا اور کہا کہ لے اپنا دینار اور مچھلی واپس دے دے۔ کیا تو لوگوں کا مذاق اُڑانا چاہتا ہے؟ یہ سُن کر یہودی کو گمان ہوا کہ وہ اس سے مذاق کرتا ہے۔ اس نے خلیفہ کو دو دینار اور دے دیے۔ خلیفہ بولا کہ مچھلی واپس دے دے، مذاق نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ میں ان داموں مچھلی بیچ ڈالوں گا؟ یہودی نے ہاتھ بڑھا کر اور دو دینار نکالے اور کہا کہ لے یہ پانچ دینار اپنی مچھلی کے دام لے اور لالچی نہ بن۔ خلیفہ انھیں ہاتھ میں لے کر خوش خوش چل دیا۔ وہ دیناروں کو دیکھتا اور تعجب کرتا اور کہتا کہ پاک ہے اللہ، آج جو میرے پاس ہے وہ بغداد کے خلیفہ کے پاس بھی نہ ہوگا۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو اسے بندر کا کہنا پھر یاد آگیا جو اس نے چلتے وقت کہا تھا

اور یہودی کے پاس لوٹ کر اس نے دینار پھینک دیے۔ یہودی نے کہا اے خلیفہ! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ آخر تو کیا چاہتا ہے؟ کیا میں تیرے دیناروں کو توڑ کر درہم دے دوں؟ خلیفہ بولا نہ میں درہم چاہتا ہوں نہ دینار، تو مچھلی واپس کر دے۔ یہودی کو غصہ آگیا اور ڈانٹ کر کہا اے ماہی گیر، تو ایک مچھلی لایا جس کے دام ایک دینار بھی نہیں۔ میں تجھے اس کے بدلے پانچ دینار دیتا ہوں اور تو راضی نہیں ہوتا۔ کہیں تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اچھا بتا کتنے میں بیچے گا؟

خلیفہ بولا کہ نہ میں اسے درہم کے بدلے بیچوں گا نہ دینار کے بلکہ دو بولوں کے بدلے جو تو مجھ سے کہہ دے۔ دو بولوں کا نام سن کر یہودی کی آنکھیں دھنس گئیں، سانس اُکھڑ گیا اور دانت پیس کر کہنے لگا اے مسلمانوں کے ڈاکو! کیا تو چاہتا ہے کہ میں تیری مچھلی کے بدلے اپنا دین بیچ ڈالوں؟ کیا تو میرا مذہب اور عقیدہ بگاڑنے آیا ہے جس پر میرے باپ دادا چلے آئے ہیں؟ اب اس نے اپنے غلاموں کو آواز دی، وہ آئے تو اس نے کہا کہ پکڑو اس منحوس کو، مارے گھونسوں کے توڑ ڈالو اس کی گردن اور اتنا مارو کہ وہ بھی یاد کرے۔ یہ سنتے ہی انھوں نے مارنا شروع کر دیا اور اتنا مارا کہ وہ دکان کے نیچے جا گرا۔ یہودی بولا کہ اب اسے چھوڑ دو کہ کھڑا ہو جائے، خلیفہ اٹھ کھڑا ہوا گویا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ یہودی بولا کہ بتا تو مچھلی کے کیا دام چاہتا ہے تاکہ میں تجھے دے دوں، کیوں کہ اس وقت میں نے تیرے ساتھ بُرا برتاؤ کیا ہے۔ خلیفہ نے کہا، استاد، مار کی پروا نہ کر، میں دس گدھوں کے برابر مار کھا سکتا ہوں۔ یہودی ہنس پڑا اور کہنے لگا خدا کے لیے بتا تو سہی کہ تو کیا چاہتا ہے اور میں اپنے دین کی قسم کھاتا ہوں کہ تو جو مانگے گا دوں گا۔ خلیفہ نے کہا اس مچھلی کی قیمت سوا دو بولوں کے اور کچھ نہ لوں گا۔ یہودی بولا، شاید تو چاہتا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

خلیفہ نے کہا اے یہودی! اگر تو مسلمان ہو گیا تو تیرے اسلام سے نہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا نہ یہودیوں کو نقصان، اور اگر تو کافر ہی رہا تو تیرے کفر سے نہ مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا نہ یہودیوں کو فائدہ۔ میں تو محض اتنا چاہتا ہوں کہ تو کھڑا ہو کر کہہ دے کہ اے بازار والو! گواہ رہو کہ میں اپنے بندر کو خلیفہ کے بندر سے بدلتا ہوں، اپنے دینوی فائدے کو اس کے دینوی فائدے سے اور اپنی قسمت کو اس کی قسمت سے۔ یہودی بولا کہ اگر تو اتنی ہی سی بات چاہتا ہے تو وہ میرے لیے آسان ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔۔۔۔۔

آٹھ سو پینتیسویں رات

آٹھ سو پینتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، یہودی خلیفہ ماہی گیر سے بولا کہ اگر تو اتنی ہی سی بات چاہتا ہے تو وہ میرے لیے آسان ہے۔ یہ کہہ کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا، جو کچھ خلیفہ ماہی گیر نے کہا تھا کہہ دیا اور پھر اس کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اب اور کچھ تو باقی نہیں؟ ماہی گیر نے کہا نہیں۔ یہودی بولا کہ اچھا خدا حافظ۔ خلیفہ فوراً اٹھا، ٹوکرا اور جال لے کر دجلہ پر پہنچا جال پھینک کر کھینچا تو وہ بھاری معلوم ہوا اور بڑی مشکل سے نکلا۔ جال باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ طرح طرح کی مچھلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک عورت آئی جس کے پاس ایک سینی تھی۔ اس نے خلیفہ کو ایک دینار دیا اور خلیفہ نے اسے ایک دینار کی مچھلیاں دے دیں۔ پھر ایک نوکر آیا اس نے بھی ایک دینار کی مچھلیاں مول لیں۔ اسی طرح اس نے دس دینار کی مچھلیاں بیچ لیں اور پھر برابر دس دن تک دس دس دینار کی مچھلیاں بیچتا رہا یہاں تک

کہ اس کے پاس سونے کے سو دینار اکٹھے ہو گئے۔

اس ماہی گیر کا مکان ایک گلی میں تھا جہاں سوداگر رہا کرتے تھے۔ ایک رات وہ اپنے گھر میں بھنگ کے نشے میں پڑا ہوا تھا، کہنے لگا کہ اے خلیفہ! تمام لوگ جانتے ہیں کہ تو ایک غریب ماہی گیر ہے لیکن تو نے سونے کے سو دینار کما لیے ہیں۔ اب خلیفہ ہارون الرشید کو ضرور کسی نہ کسی شخص سے اس کی خبر مل جائے گی ممکن ہے کہ اسے داموں کی ضرورت ہو اور وہ مجھے بلا بھیجے اور مجھ سے کہے کہ مجھے کچھ دیناروں کی ضرورت ہے، مجھے خبر ملی ہے کہ تیرے پاس سو دینار ہیں لہٰذا وہ مجھے قرض دے دے۔ میں کہوں گا کہ اے امیر المومنین! میں تو قلاش ہوں، جس نے تجھ سے کہا ہے کہ میرے پاس سو دینار ہیں جھوٹ کہتا ہے بلکہ اس کا ایک حصہ بھی نہ میرے پاس ہے نہ میری ملکیت۔ یہ سن کر وہ مجھے والی کے حوالے کر دے گا اور کہے گا کہ اس کے کپڑے اتار کر اسے ڈنڈے مارو۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں فوراً اٹھ کر خود کوڑے ماروں تاکہ مجھے مار کھانے کی مشق ہو جائے۔ بھنگ نے اس سے کہا کہ اٹھ کر کپڑے اتار ڈال اور اس نے فوراً کپڑے اتار ڈالے اور ہاتھ میں ایک کوڑا لے لیا۔ اس کے پاس چمڑے کا ایک تکیہ تھا وہ ایک کوڑا اس پر اور ایک اپنے اوپر مارنے اور کہنے لگا آہ آہ! اے میرے آقا، خدا کی قسم یہ سب جھوٹ ہے، لوگ میرے اوپر بہتان لگاتے ہیں، میں تو ایک غریب ماہی گیر ہوں اور دنیاداری کی کوئی چیز میرے پاس نہیں۔ جب خلیفہ ماہی گیر ایک کوڑا اپنے اور ایک تکیے کے مار رہا تھا تو لوگوں کے کان میں اس کی آواز پہنچی کیوں کہ رات میں آواز زیادہ گونجتی ہے منجملہ دوسرے لوگوں کے سوداگروں نے بھی سنا، وہ کہنے لگے کہ اس بے چارے کو کیا ہوا کہ چلا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اسے مار رہا ہے، ہو نہ ہو چور اس کے

گھر آئے ہیں اور اُسے مار رہے ہیں۔ وہ سب کے سب اٹھے اور اپنے گھروں سے نکل کر خلیفہ کے گھر پہنچے۔

وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ گھر میں قفل پڑا ہوا ہے۔ آپس میں کہنے لگے کہ غالباً چور پچھواڑے سے اترے ہوں گے اس لیے ہمیں چھت پر چڑھنا چاہیے۔ یہ کہ کر وہ چھت پر چڑھ گئے اور روشن دان میں ہو کر اندر اترے دیکھا کہ وہ ننگا اپنے آپ کو مار رہا ہے۔ انھوں نے کہا اے خلیفہ! تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا اے لوگو! میں نے چند دینار کمائے ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا حال خلیفہ ہارون الرشید کو معلوم ہو جائے اور وہ مجھے بلا کر دینار مانگے اور میں انکار کروں۔ اگر میں نے انکار کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے سزا دے گا، اس لیے میں خود اپنے آپ کو سزا دے رہا ہوں تاکہ جو کچھ میرے اوپر گرنے والی ہے اس کی مشق ہو جائے۔ اس پر سوداگر ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ ایسی باتیں جانے دے، خدا تجھ سے بھی سمجھے اور تیرے دیناروں سے بھی۔ تو نے تو ہمیں گھبرا دیا اور پریشان کر دیا۔ یہ سن کر خلیفہ نے اپنے آپ کو مارنا بند کر دیا اور جا کر سو گیا، صبح تک سوتا رہا۔ جاگا اور اپنے کام پر جانے لگا تو اُسے اپنے سو دیناروں کی فکر پڑی۔ دل میں کہا کہ اگر میں انھیں گھر میں چھوڑے جاتا ہوں تو چور لے جائیں گے اور اگر میں انھیں کمر میں باندھ لوں تو ممکن ہے کہ کسی کی نظر پڑ جائے وہ گھات میں لگا رہے مجھے کسی اکیلی جگہ پا کر قتل کر دے اور دینار لے اڑے۔ لیکن ایک ترکیب ہو بڑی عمدہ اور سود مند۔ یہ کہ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اپنے گریبان میں ایک جیب لگائی اور دیناروں کو تھیلی میں رکھ کر جیب کے اندر ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ اپنا جال ٹوکرا اور ڈنڈا لے کر چل دیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو چھتّیسویں رات

آٹھ سو چھتّیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، دجلہ پہنچ کر خلیفہ ماہی گیر نے جال پھینکا، کھینچا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ اب وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ گیا اور جال ڈالا وہاں بھی کچھ نہ نکلا۔ اسی طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا یہاں تک کہ وہ شہر سے آدھے دن کے فاصلے پر پہنچ گیا، ہر بار وہ جال پھینکتا اور وہ خالی نکلتا۔ اپنے دل میں کہنے لگا کہ اب میں آخری دفعہ جال ڈالتا ہوں، یا تو چت یا پٹ۔ یہ کہہ کر اس نے غصے میں بھر کر زور سے جال پھینکا، ساتھ ہی وہ تھیلی بھی جس میں سو دینار تھے دریا میں جا پڑی اور پانی اسے بہا کرلے چلا۔ اس نے جال کو وہیں پھینکا اور کپڑے اتار تھیلی کے پیچھے دریا میں غوطہ مارا۔ تقریباً سو غوطے لگائے مگر تھیلی ہاتھ نہ آئی یہاں تک کہ اس کی قوت نے جواب دے دیا اور وہ تھک کر خالی ہاتھ پانی کے اوپر آ گیا۔ ناامید ہو کر کنارے پر آیا تو دیکھا کہ سوا ڈنڈے، جال اور ٹوکرے کے وہاں کچھ نہیں۔ اس نے اپنے کپڑے بہت ڈھونڈے کہیں پتا نہ چلا۔ آخر جال کو اپنے بدن پر لپیٹ ڈنڈا ہاتھ میں لے اور ٹوکرا کندھے پر رکھ ایسا بھاگا جیسے بولایا ہوا اونٹ دائیں بائیں اور آگے پیچھے بھاگتا ہو یا پامال شہرے گرد آلود جیسے کوئی نافرمان جن حضرت سلیمانؑ کے قید خانے سے چھوٹا ہو۔

یہ تو خلیفہ ماہی گیر کا قصہ ہوا، اب خلیفہ ہارون الرشید کا ماجرا سنو۔ ایک جوہری ابن القرناص نامی اس کا مصاحب تھا، تمام لوگوں خاص کر تاجروں دلالوں اور سٹے والوں کو معلوم تھا کہ ابن قرناص خلیفہ کا تاجر ہے اور خلیفہ

جتنے تحفے تحائف اور قیمتی چیزیں مول لینا چاہتا ہے اس کے مشورے کے نہیں لیتا یہاں تک کہ غلام اور باندیاں بھی۔ ایک روز جب کہ یہ تاجر اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تھا دلالوں کا چودھری ایک کنیز کو لے کر اس کے پاس آیا جس کا قد و قامت اور حسن و جمال ایسا عجیب و غریب تھا کہ کسی کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔ منجملہ اور خوبیوں کے وہ تمام علوم و فنون میں بھی ماہر تھی، شعر کہتی اور تمام باجے بجاتی۔ ابن قرناص جوہری نے اسے پانچ ہزار دینار میں مول لے لیا اور ایک ہزار دینار کے کپڑے پہنا کر امیر المومنین کے پاس لے گیا۔ خلیفہ اس رات اس کے ساتھ سویا، ہر علم و فن میں اس کا امتحان لیا دیکھا کہ واقعی صاحبِ کمال ہے اور اس کا جواب کہیں نہیں۔ اس کا نام قوت القلوب تھا۔ صبح اٹھ کر ہارون الرشید نے ابن قرناص جوہری کو بلوایا وہ حاضر ہوا تو کنیز کے بدلے دس ہزار دینار عنایت کیے۔

خلیفہ اس کنیز کا اتنا گرویدہ ہو گیا کہ اس نے شہزادی زبیدہ بنت قاسم کو جو اس کی چچیری بہن تھی اور تمام چاہتی کنیزوں کو بالکل ترک کر دیا اور پورے ایک مہینے تک اس نئی کنیز کے ساتھ رہا۔ محض جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے وہ اس سے جدا ہوتا اور نماز پڑھ کر فوراً اس کے پاس لوٹ آتا۔ امرا کو بڑا فکر پیدا ہوا، انھوں نے اس کی شکایت وزیر جعفر برمکی سے کی۔ وزیر نے آیندہ جمعے تک انتظار کیا، جمعے کے دن جامع مسجد میں جا کر امیر المومنین سے ملا اور جتنے عجیب و غریب عشق کے قصے اسے اس وقت یاد آئے کہہ سنائے تاکہ خلیفہ کے دل میں جو بات ہے نکل جائے۔ خلیفہ نے کہا اے جعفر خدا کی قسم یہ میرے اختیار سے باہر ہے، میرا دل اس درجے اس کی محبت کا شکار ہو گیا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ وزیر جعفر بولا، امیر المومنین سُنیے، یہ چہیتی

کنیز قوت القلوب اب تیرے قبضے میں ہی، تیری خادمہ ہی اور مثل ہی کہ جو چیز ہاتھ میں آجاتی ہی دل اس سے ہٹ جاتا ہی اور میں تجھے ایک دوسری بات بتاتا ہوں کہ بادشاہ اور شہزادے جس چیز پر سب سے زیادہ فخر کرتے ہیں وہ سیر و شکار ہی۔ اگر تو اس طرف مشغول ہو تو غالباً اُسے بھول جائے گا اور تیرا دل اس کی طرف سے ہٹ جائے گا۔ خلیفہ بولا ای جعفر، یہ تو نے خوب بات کہی، ہمارے ساتھ فوراً شکار کھیلنے چل۔ جمعے کی نماز ختم ہوتے ہی دونوں جامع مسجد سے نکلے اور فوراً سوار ہو کر سیر و شکار کے لیے چل دیے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

آٹھ سو سینتیسویں رات

آٹھ سو سینتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! خلیفہ ہارون الرشید اور جعفر سیر و شکار کے لیے چل کھڑے ہوئے، چلتے چلتے ایک جنگل میں پہنچے۔ امیر المومنین اور جعفر دونوں خچروں پر سوار تھے۔ باتوں میں اس قدر مصروف ہوئے کہ لشکر آگے نکل گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رشید نے کہا ای جعفر! مجھے سخت پیاس لگی ہی۔ نظر دوڑائی تو اسے ایک اونچے ٹیلے پر کوئی چیز ہلتی ہوئی دکھائی دی، اس نے وزیر سے پوچھا کہ کیا تجھے بھی ایسا ہی دکھائی دیتا ہی جیسا مجھے؟ وزیر بولا کہ ای امیر المومنین! ہاں مجھے بھی ایک اونچے ٹیلے پر کوئی چیز ہلتی دکھائی دے رہی ہی یا تو کسی باغ کا باغ بان ہی یا کسی کھیرے کے کھیت کا رکھوالا، بہر حال اس کے قریب پانی ہوگا۔ میں ابھی جا کر تیرے لیے پانی لاتا ہوں

رشید بولا کہ میرا خچر تیرے خچر سے تیز ہی، تو لشکر کی خاطر یہیں ٹھیرا رہ میں خود جاکر اس شخص کے پاس سے پانی پی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر رشید نے اپنے خچر کو ایڑ لگائی، خچر اس طرح چل نکلا جیسے آندھی یا دریا کا پانی اور پلک مارتے اس نے خلیفہ کو اس ہلتی ہوئی چیز کے پاس پہنچا دیا جو دراصل خلیفہ ماہی گیر تھا۔ رشید نے دیکھا کہ اس کے بدن پر بہ جائے کپڑوں کے جال لپٹا ہوا ہی اور آنکھیں مشعل کی طرح سرخ ہیں، اس کی صورت ڈراونی، قد جھکا ہوا ہی اور وہ ایسا گرد آلود ہی جیسے کوئی دیو یا شیر۔ رشید نے اسے سلام کیا، اس نے غصّے کے لہجے میں سلام کا جواب دیا گویا اس کے بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ رشید نے پوچھا ای شخص! تیرے پاس کچھ پانی ہی؟ خلیفہ نے جواب دیا کیا تو اندھا ہی یا پاگل ہی؟ تیرے پاس ہی تو دجلہ بہ رہا ہی اور اسی ٹیلے کے پیچھے۔ رشید ٹیلے کے پیچھے سے گھوم کر دجلہ پر پہنچا، خود بھی پانی پیا اور اپنے خچر کو بھی پلایا۔

پانی پی کر رشید فوراً خلیفہ ماہی گیر کے پاس آیا اور کہا ای شخص، تو کون ہی اور یہاں کھڑا کیا کرتا ہی۔ خلیفہ بولا یہ تیرا سوال پانی کے سوال سے بھی عجیب و غریب ہی، کیا تجھے میرے پیشے کا سامان میرے کندھے پر دکھائی نہیں دیتا؟ رشید بولا تو ماہی گیر معلوم ہوتا ہی۔ اس نے کہا ہاں۔ رشید نے پوچھا تیری قبا کہاں ہی اور شملہ کیا ہوا، پٹکا کدھر گیا اور کپڑے کیا ہوے؟ لطف کی بات یہ تھی کہ اسی ترتیب سے خلیفہ کی چیزیں غائب ہوتی رہی تھیں، لہذا جب خلیفہ نے خلیفہ کی باتیں سنیں تو اسے یقین ہو گیا کہ یہی شخص میرے کپڑے دریا کے کنارے سے لے گیا ہی اور وہ بجلی کی طرح ٹیلے سے اترا اور خلیفہ کے خچر کی لگام تھام کر کہنے لگا ای شخص میرے کپڑے مجھے دے دے، ہنسی

مذاق جانے دے۔ خلیفہ بولا خدا کی قسم میں نے تیرے کپڑے دیکھے تک نہیں
نہ میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔ رشید کے رخسار بڑے اور منھ چھوٹا تھا اس
لیے خلیفہ نے اسے دیکھ کر کہا تو گویا یا بانسری بجانے والا معلوم ہوتا ہے لیکن
ان دونوں سے بہتر ہے کہ تو میرے کپڑے دے دے ورنہ میں اس ڈنڈے
سے تجھے اتنا ماروں گا کہ تیرے کپڑے پیشاب میں تر ہو جائیں گے۔ جب خلیفہ
نے دیکھا کہ خلیفہ ماہی گیر کے پاس ڈنڈا ہے اور وہ مارنے کے لیے تیار تو اپنے
دل میں کہنے لگا کہ واللہ۔ اس پاگل قلانچ کے ڈنڈے کی آدھی مار بھی برداشت
نہیں کر سکتا اس لیے اس نے اپنی اطلس کی قبا اُتار کر خلیفہ سے کہا کہ اپنے کپڑوں
کے بدلے اس قبا کو لے لے۔ خلیفہ نے اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگا
میری قبا اس رنگین قبا سے دس گنی بہتر تھی۔ رشید بولا کہ جب تک میں
تیرے کپڑے نہ لے آؤں اسی قبا کو پہن لے۔ جب خلیفہ نے اسے لے کر
پہنا تو دیکھا کہ وہ بہت لمبی ہے۔ اس کے پاس ٹوکرے سے بندھی ہوئی
ایک چھُری تھی؛ اُسے لے کر خلیفہ نے نیچے سے ایک تہائی کاٹ ڈالا اور
اب وہ اس کے گھٹنوں تک آ گئی۔

پھر ماہی گیر نے رشید کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے بانسری بجانے
والے، خدا کے لیے مجھے بتا دے کہ تیرا مشاہرہ کیا ہے جو تیرا اُستاد تجھے دیتا
ہے۔ خلیفہ نے جواب دیا سونے کے دس دینار۔ خلیفہ بولا اے مسکین، تو نے
اپنے غم کا بوجھ بھی میرے اوپر ڈال دیا۔ خدا کی قسم میں ہر روز دس دینار
کماتا ہوں، اگر تو چاہتا ہے تو میری نوکری کر لے، میں تجھے مچھلیاں پکڑنا
سکھا دوں گا اور میری کمائی میں تیرا حصہ ہوگا۔ اس طرح سے تو ہر روز
پانچ دینار کمائے گا اور میرا غلام بن کر رہے گا اور اگر تیرے استاد نے

کچھ چون وچرا کی تو اسی ڈنڈے سے میں اس کی خبر لوں گا۔ رشید بولا منظور ہے۔ خلیفہ نے کہا اچھا گدھی کی پیٹھ پر سے اُتر پڑ اور اسے باندھ دے تاکہ میں اس سے مچھلیاں ڈھونڈنے کا کام لوں اور فوراً میرے ساتھ چل میں تجھے مچھلیاں پکڑنا سکھا دوں۔ یہ سُن کر رشید اپنے خچر سے اُتر پڑا اور اُسے ایک طرف باندھ کر اپنا دامن پیٹی میں اُڑس لیا۔ خلیفہ نے کہا ای بانسری بجانے والے، جال کو یوں پکڑ اور اسے یوں اپنے بازوں پر لپیٹ اور یوں دجلہ میں پھینک۔ رشید نے دل مضبوط کر کے ایسا ہی کیا جیسا کہ اسے خلیفہ نے بتایا تھا اور جال کو دریا میں پھینکا لیکن جب اس نے اُسے کھینچنا چاہا تو کھینچ نہ سکا۔ اب خلیفہ نے بھی آکر زور لگایا وہ پھر بھی نہ کھنچا خلیفہ کہنے لگا کہ ای منحوس بانسری بجانے والے، ایک بار تو میں اپنے کپڑوں کے بدلے تیری قبا لے چکا ہوں، اگر اس بار میرا جال پھٹ گیا تو اس کے بدلے میں تیری گدھی لے لوں گا اور تجھے اتنا ماروں گا کہ تجھے دُم دبا کر بھاگتے ہی بن پڑے گی۔ رشید بولا کہ آ ہم دونوں مل کر کھینچیں، اس پر بھی جال مشکل سے کھنچا اور جب باہر نکلا تو انھوں نے دیکھا کہ اس میں طرح طرح کی رنگ رنگ مچھلیاں ہیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو اڑتیسویں رات

آٹھ سو اڑتیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، جب خلیفہ ماہی گیر اور خلیفہ نے جال کھینچا اور دیکھا کہ وہ طرح طرح کی مچھلیوں سے بھرا ہوا ہے تو خلیفہ بولا ای بانسری والے، خدا کی قسم تو بڑا خوش نصیب

ہے۔ اگر تو نے زرا محنت سے کام لیا تو تو بڑا ہوشیار ماہی گیر ہو جائے گا۔ اب بہتر یہ ہے کہ تو اپنی گدھی پر سوار ہو کر بازار جا اور وہاں سے دو ٹوکرے لے کر آ۔ تیرے آنے تک میں ان مچھلیوں کی خبر گیری کروں گا، پھر ہم دونوں انھیں تیری گدھی پر لاد کرلے چلیں گے۔ میرے پاس ترازو، بٹے اور تمام ضروری چیزیں ہیں، تیرا کام بس اتنا ہوگا کہ تول تول کر دیتا جائے اور دام لیتا جائے۔ ہمارے پاس بیس دینار کی مچھلیاں ہوں گی، جلدی جاکر دو ٹوکرے لے آ اور دیر نہ کر۔ خلیفہ نے سر آنکھوں پر کہہ کر ماہی گیر اور مچھلیوں کو وہیں چھوڑا اور اپنے خچر پر خوش خوش بیٹھ کر چل دیا، راستے بھر ہنستا رہا یہاں تک کہ جعفر کے پاس پہنچا۔ اسے دیکھ کر جعفر نے کہا امیر المومنین جب تو پانی پینے گیا تھا تو شاید تجھے کوئی عمدہ باغ مل گیا اور تو اس میں جاکر اکیلے سیر و تفریح کرنے لگا۔ جعفر کی یہ باتیں سن کر رشید ہنس پڑا اور تمام برمکیوں نے اٹھ کر اس کے آگے زمین چومی اور کہنے لگے کہ امیر المومنین خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے، غم کو تیرے پاس پھٹکنے نہ دے! جب تو پانی پینے گیا تھا تو تجھے دیر کیوں لگی، تیرے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا؟ خلیفہ نے کہا میرے ساتھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ یہ کہہ کر اس نے خلیفہ کا ماجرا دہرایا اور اس کا کہنا کہ تو نے میرے کپڑے چرائے ہیں بیان کیا اور یہ کہ اس نے ماہی گیر کو اپنی قبا دے دی اور ماہی گیر نے اسے لمبا دیکھ کر نیچے سے کاٹ ڈالا۔

یہ سن کر جعفر بولا، امیر المومنین، واللہ میرا خیال تھا کہ میں تجھ سے وہ قبا مانگ لوں لیکن اب میں فوراً جاکر وہ قبا ماہی گیر سے خرید لاتا ہوں۔ خلیفہ نے کہا اب تو اس نے قبا کو نیچے کی طرف سے کاٹ کر بیکار کر دیا ہے۔ اے جعفر، دریا پر مچھلیاں پکڑتے پکڑتے میں تھک گیا ہوں، میں نے بہت

سی مچھلیاں ماری ہیں وہ سب میرے اُستاد خلیفہ کے پاس دریا کے کنارے پڑی ہوئی ہیں اور وہ کھڑا ہوا میری راہ دیکھ رہا ہوگا کہ میں ٹوکرے لے کر پہنچوں اور ہم دونوں بازار جا کر انھیں بیچیں اور دام تقسیم کریں۔ جعفر نے کہا اے امیر المومنین، میں تمہارے پاس گاہکوں کو لے کر آؤں گا۔ خلیفہ بولا اے جعفر، قسم ہے اپنے پاک بزرگوں کی کہ جو کوئی اس خلیفہ کی جس نے مجھے مچھلیاں مارنا سکھایا ہے ایک مچھلی لے کر میرے پاس آئے گا میں اسے ایک سونے کا دینار دوں گا۔ یہ سن کر ڈھنڈورا پیٹنے والے نے لشکر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ جا کر امیر المومنین کے لیے مچھلیاں خرید لاؤ، سارے غلام دریا کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ خلیفہ امیر المومنین کی راہ دیکھ ہی رہا تھا کہ غلام اس پر گِدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کو مار مار کر پیچھے ہٹانے لگے اور مچھلیاں لے کر زرد و زر رومالوں میں باندھ لیں۔ خلیفہ نے اپنے دل میں کہا بے شک یہ جنت کی مچھلیاں ہیں یہ کہہ کر اس نے دو مچھلیاں اپنے دائیں ہاتھ میں لیں دو بائیں میں اور گلے گلے پانی میں اُتر کر کہنے لگا کہ یا اللہ، ان مچھلیوں کی قسم تیرا بندہ بانسری بجانے والا جو میرا شریک ہے ابھی آتا ہوگا۔

خلیفہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک غلام پہنچا جو خلیفہ کے تمام غلاموں کا سردار تھا اور اس نے دیکھا کہ وہاں مچھلیاں باقی نہیں۔ جب اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ خلیفہ ماہی گیر مچھلیاں لیے پانی میں کھڑا ہے۔ وہ کہنے لگا اے ماہی گیر، ادھر آ۔ ماہی گیر نے جواب دیا چلتا ہو اور فضول باتیں نہ کر۔ غلام نے آگے بڑھ کر کہا یہ مچھلیاں مجھے دے دے، میں تجھے اس کی قیمت دیتا ہوں۔ خلیفہ ماہی گیر نے غلام سے کہا کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟ میں انھیں نہیں

بیچتا۔ یہ سن کر غلام نے اپنا گرز اٹھایا، خلیفہ بولا، کم بخت، مجھے مار نہیں، گرز کی مار کھانے سے تو یہی بہتر ہے کہ میں تجھے مُفت دے دوں۔ یہ کہہ کر اس نے مچھلیاں پھینک دیں اور غلام نے انھیں اٹھا کر رومال میں باندھ لیا۔ جب اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں ایک درہم بھی نہ نکلا، وہ کہنے لگا اے ماہی گیر! تیری قسمت کھوٹی ہے، خدا کی قسم میرے پاس ایک درہم بھی نہیں، لیکن کل خلیفہ کے محل میں آجائیو اور کہیو کہ مجھے صندل غلام کے پاس لے چلو۔ غلام تجھے میرے پاس لے آئیں گے وہاں جو تیری قسمت میں ہے تجھے مل جائے گا۔ خلیفہ بولا آج کا دن بڑا مبارک ہے اور اس کی برکت شروع ہی سے ظاہر ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جال کندھے پر رکھا اور چل دیا۔ بغداد پہنچ کر بازار میں سے گزرا۔ لوگوں نے اسے خلیفہ کی قبا پہنے دیکھا تو حیران ہو کر دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے محلے میں پہنچا۔ اسی محلے کے نکڑ پر خلیفہ کے درزی کی دُکان تھی، درزی نے دیکھا کہ خلیفہ ماہی گیر ایک ہزار دینار کی ایک قبا پہنے ہوئے ہے جو خلیفہ کی پوشاکوں میں سے ہے، وہ بولا اے خلیفہ، یہ قبا تجھے کہاں سے ملی؟ خلیفہ نے جواب دیا تو فضول باتیں کیوں کرتا ہے؟ مجھے یہ قبا ایک شخص سے ملی ہے جسے میں نے مچھلیاں پکڑنی سکھائی ہیں، جو میرا شاگرد بن گیا ہے اور جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا گناہ میں نے بخش دیا ہے کیوں کہ اس نے میرے کپڑے چُرا لیے تھے ان کے بدلے اس نے مجھے یہ قبا دی ہے۔ درزی سمجھ گیا کہ جب وہ مچھلیاں مار رہا تھا تو خلیفہ اس کے پاس سے گزُرا ہو گا اور اس کا مذاق بنا کر اسے یہ قبا دی ہو گی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو انتالیسویں رات

آٹھ سو انتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
درزی سمجھ گیا کہ خلیفہ نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے۔

یہ تو ماہی گیر کا قصہ ہوا، اب خلیفہ ہارون الرشید کا حال سنو۔ وہ سیر و شکار کے لیے اسی غرض سے گیا تھا کہ کنیز قوت القلوب کی یاد اس کے دل سے نکل جائے۔ ادھر زبیدہ کو یہ خبر ہوئی کہ خلیفہ اس کنیز کی محبت میں گرفتار ہے تو اسے ویسا ہی رشک ہونے لگا جو عورتوں کو ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا بند ہو گیا، میٹھی نیند نے اسے خیر باد کہا اور وہ اسی تاک میں لگی رہی کہ خلیفہ کہیں باہر جائے یا سفر کرے تو وہ قوت القلوب کے لیے مکر کا جال بچھائے۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ خلیفہ سیر و شکار کے لیے گیا ہے تو اس نے باندیوں کو حکم دیا کہ کمروں میں فرش بچھائیں اور اسے خوب سجائیں۔ پھر اس نے کھانے اور مٹھائیاں چنیں، منجملہ ان کے ایک چینی طباق میں بہترین حلوا منگوا کر اس میں بھنگ ملا دی اور ایک غلام سے کہا کہ کنیز قوت القلوب کے پاس جا کر کہہ کہ امیر المومنین کی بیوی شہزادی زبیدہ بنت قاسم تجھے کھانے پر مدعو کرتی ہے اور اس سے یہ بھی کہیو کہ امیر المومنین کی بیوی آج بیمار ہے، اس نے سنا ہے کہ تو گاتی اچھا ہے اس لیے وہ تیرے فن کو سن کر خوش ہونا چاہتی ہے۔ کنیز نے جواب بھیجا کہ پہلے خدا کا اور پھر شہزادی زبیدہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، اسے کیا معلوم تھا کہ غیب کے پردے میں اس کے لیے کیا پوشیدہ ہے اور تمام ضروری باجے لے کر غلام کے ساتھ شہزادی زبیدہ کے پاس پہنچ گئی، اس کے آگے

کئی بار زمین کو بوسہ دیا۔ پھر کہنے لگی کہ سلام ہو بلند منزلت اور عالی جناب ذات پر جو حضرت عباسؓ کی اولاد اور نبیؐ کے خاندان سے ہی! خدا تجھے روز بہ روز اور سال بہ سال اقبال دے اور امن و امان سے رکھے! یہ کہ کر وہ دوسرے غلاموں اور باندیوں کے برابر کھڑی ہوگئی۔

شہزادی زبیدہ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، دیکھا کہ وہ نہایت حسین وجمیل ہی، اس کے رخسار چکنے چکنے ہیں، سینہ انار کی طرح، چہرہ جیسے چاند، پیشانی آب دار اور آنکھیں سرمگیں ہیں، گویا سورج اس کے ماتھے سے طلوع ہوتا ہی اور اندھیری رات اس کی زلفوں سے نکلتی ہی۔ مشک میں اسی کی خوش بو ہی اور پھولوں میں اسی کی خوش نمائی، چاند اسی کی جبین سے روشن ہی اور شاخ میں اسی کے قد کی لچک ہی۔ گویا وہ پورا چاند ہی جو کالی رات میں چمک رہا ہی۔ اس کی آنکھیں گویا ہیں، بھویں کمان کی سی اور ہونٹ مونگے کے بنے ہوئے۔ جو کوئی اسے دیکھتا ہی حیران ہو جاتا ہی اور اس کی آنکھیں اس پر جادو کر دیتی ہیں۔ عالی شان ہی وہ ذات جس نے اسے پیدا کیا اور یہ خوبیاں عطا کیں۔ شہزادی زبیدہ نے کہا ای قوت القلوب، اہلاً و سہلاً و مرحبا، بیٹھ کر اپنے فن سے ہمیں خوش کر۔ وہ بیٹھ کر دف بجانے لگی اور ایسا گایا بجایا کہ چڑیاں اڑنے سے رک گئیں اور مکان رقص کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے دف کو رکھ دیا اور بانسری بجائی، پھر سارنگی اٹھائی، تاروں کو کھینچ اور کھونٹیوں کو گھما کر اسے اپنی گود میں رکھ لیا اور اس پر اس طرح جھک گئی جیسے بچے پر ماں، اور چودہ مختلف راگ بجائے یہاں تک کہ دیکھنے والے دنگ ہو گئے اور سننے والے جھومنے لگے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔۔۔۔۔

آٹھ سو چالیسویں رات

آٹھ سو چالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! شہزادی زبیدہ کے سامنے سارنگی بجانے کے بعد قوت القلوب نے انگلیوں اور ہاتھوں کے کرتب دکھانے شروع کیے یہاں تک کہ شہزادی زبیدہ کو اس سے عشق ہوگیا اور وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ میرا چچیرا بھائی رشید اس کے عشق میں حق بہ جانب ہے۔ اس کے بعد کنیز زبیدہ کے آگے زمین چوم کر بیٹھ گئی، کھانا لایا گیا پھر مٹھائیاں اور وہ طباق جس میں بھنگ ملی ہوئی تھی کنیز نے اس میں سے کھایا۔ ابھی حلوا اس کے پیٹ میں بھی نہ پہنچا ہوگا کہ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ شہزادی زبیدہ نے باندیوں سے کہا اسے اٹھا کر کسی کوٹھری میں لے جاؤ اور جب میں کہوں تو اسے لانا۔ پھر زبیدہ نے ایک غلام سے کہا کہ ایک صندوق تیار رکھ اور ایک قبر سی بنا کر مشہور کردے کہ کنیز کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی اور وہ مر گئی۔ زبیدہ نے اپنی خواصوں سے تنبیہہ کردی کہ اگر کسی نے بھی کہا کہ وہ زندہ ہے تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ اتنے میں خلیفہ سیروشکار سے لوٹا اور سب سے پہلے اس کنیز کے متعلق دریافت کیا۔ ایک غلام آگے بڑھا جسے شہزادی زبیدہ نے سکھا دیا تھا کہ اگر خلیفہ تجھ سے اس کے بارے میں پوچھے تو کہہ دیجیو کہ وہ مر گئی، اس نے خلیفہ کے آگے زمین چوم کر کہا اے میرے آقا! خدا تجھے سلامت رکھے! یقین جان کہ قوت القلوب کے حلق میں کھانے کی کوئی چیز پھنس گئی اور وہ مر گئی۔ خلیفہ بولا اے کم بخت غلام، خدا تجھے کوئی خوش خبری نصیب نہ کرے! یہ کہہ کر وہ محل کے اندر

گیا اور ہر ایک کو یہی کہتے سُنا کہ وہ مر گئی۔ خلیفہ نے پُوچھا کہ اس کی قبر کہاں ہے؟ لوگ اسے اس قبر کے پاس لے آئے جو جھوٹ مُوٹ بنا دی گئی تھی اور کہنے لگے کہ یہ ہے اس کی قبر۔ اسے دیکھ کر خلیفہ نے ایک چیخ ماری اور قبر سے لپٹ کر رونے لگا بہت دیر تک اسی حالت میں رہا۔ پھر وہ نہایت غمگین قبر کے پاس سے اٹھا۔ شہزادی زبیدہ کو یقین ہو گیا کہ اس کی چال چل گئی اس نے غلام سے کہا کہ وہ صندوق لا۔ صندوق آ گیا تو زبیدہ نے کنیز کو اس میں بند کیا اور غلام سے کہا کہ کوشش کر کے اس صندوق کو بیچ آ مگر اس شرط سے بیچیو کہ وہ بند رہے اور پھر دام اُسے لوٹا دیجیو۔ غلام اُسے لے کر زبیدہ کے پاس سے چل دیا اور جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔

یہ تو ان لوگوں کا ماجرا ہوا، اب خلیفہ ماہی گیر کا قصہ سنو۔ دوسرے دن جب صبح ہوئی اور دن نکلا تو اس نے اپنے دل میں کہا کہ بہتر ہے آج میں اس غلام کے پاس جاؤں جس نے مجھ سے مچھلیاں خریدی تھیں اور کہا تھا کہ میں خلیفہ کے محل میں جا کر اس سے ملوں۔ چناں چہ خلیفہ اپنے گھر سے نکلا اور خلیفہ کے محل کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ غلام اور نوکر چاکر کچھ کھڑے ہیں کچھ بیٹھے اور وہ غلاموں کا سردار بھی موجود ہے۔ خلیفہ کو دیکھ کر ایک غلام نے زور سے ڈانٹا جس کی وجہ سے سردار اس کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھے کون شخص ہے، ماہی گیر نے اسے پہچان لیا اور اسے یقین آ گیا کہ سردار نے بھی اُسے پہچان لیا ہے تو وہ بولا اے لال بالوں والے، تو نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی، کیا ایمان دار آدمی ایسا ہی کیا کرتے ہیں؟ اس کی باتیں سُن کر سردار ہنس پڑا اور کہنے لگا اے ماہی گیر، واللہ تو سچ کہتا ہے۔

غلاموں کے سردار صندل نے چاہا کہ اسے کچھ دے، اس لیے اس نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اتنے میں شور و غل کی آوازیں آئیں سردار نے سر اٹھایا کہ دیکھے کیا بات ہے۔ اس کی نظر وزیر جعفر برمکی پر پڑی جو خلیفہ کے پاس سے آرہا تھا۔ سردار فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، اُس کے آگے آگے چلنے اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس میں اتنی دیر ہوگئی کہ خلیفہ ماہی گیر پیچھے بیٹھے تھک گیا اور اُسے خلیفہ سے بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ زیادہ دیر ہوگئی تو اس نے دور ہی سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا، اے میرے لال بالوں والے آقا! آخر مجھے رخصت کیوں نہیں کرتا؟ سردار نے سُن تو لیا لیکن وزیر جعفر کے سامنے جواب دیتے اُسے شرم آئی۔ وہ وزیر کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور ماہی گیر کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوا۔ خلیفہ نے کہا اے قرضے کو دیر میں ادا کرنے والے، خدا دیر لگانے والوں کا ستیاناس کرے اور ان تمام لوگوں کا جو اوروں کا مال لے کر اس کی ادائگی میں کشش و پنج کرتے ہیں۔ اے بڑی توند والے آقا، مجھے اپنی پناہ میں لے لے اور میرا قرض ادا کرے تاکہ میں چلا جاؤں۔ سردار تو کچھ بول نہ سکا لیکن جعفر نے دیکھ لیا کہ ایک آدمی سردار کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اسے بُرا معلوم ہوا اس نے سردار سے کہا اے غلام، یہ بے چارہ فقیر تجھ سے کیا مانگ رہا ہے؟ صندل نے عرض کیا اے میرے مولا وزیر، کیا تو اسے نہیں پہچانتا؟ وزیر جعفر نے جواب دیا، خدا کی قسم میں نہیں پہچانتا اور پہچانوں بھی تو کس طرح؟ اس وقت سے پہلے میں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ غلام بولا، اے میرے مولا، یہ وہی ماہی گیر ہے جس کی مچھلیاں ہم نے دجلہ کے کنارے سے لوٹی تھیں۔ میرے ہاتھ کچھ نہیں لگا تھا اور امیر المومنین کے پاس خالی ہاتھ جاتے

شرم آتی تھی کیوں کہ سارے غلام مچھلیاں لا رہے تھے۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ دریا کے بیچ کھڑا خدا سے دُعا مانگ رہا ہے اور اس کے پاس چار مچھلیاں ہیں۔ میں نے کہا جو کچھ تیرے پاس ہے مجھے دے دے اس کے دام لے لے۔ اس نے مجھے مچھلیاں دے دیں تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ میں اسے کچھ دوں لیکن میری جیب خالی تھی، میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس محل میں آ جائیو اور میں تجھے اتنا دوں گا کہ تیری مفلسی دُور ہو جائے گی۔ آج وہ آیا اور میں نے اُسے کچھ دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ تو آ گیا، میں تیری خدمت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اسے بھول گیا اور وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ بس یہ ہے اس کا قصہ اور اسی وجہ سے وہ ٹھیرا ہوا ہے، اور شہر زاد کو صبح ہو تی۔۔۔۔۔

آٹھ سو اکتالیسویں رات

آٹھ سو اکتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا، اے نیک نہاد بادشاہ! صندل نے جعفر برمکی سے خلیفہ ماہی گیر کا قصہ سنا کر کہا کہ بس یہ ہے اس کا قصہ اور اسی وجہ سے وہ ٹھیرا ہوا ہے۔ یہ سُن کر وزیر مسکرا دیا اور کہنے لگا اے غلاموں کے سردار! یہ تو نے کیا کیا کہ یہ ماہی گیر تیرے پاس اپنی حاجت لے کر آیا اور تو نے اسے پورا نہ کیا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟ صندل نے جواب دیا نہیں۔ وزیر بولا، یہ امیرالمومنین کا اُستاد اور شریک ہے۔ ہمارا مولا خلیفہ آج صبح سے پریشان خاطر ہے اور سوا اس ماہی گیر کے کوئی اسے خوش نہیں کر سکتا۔ ماہی گیر کو جانے نہ دیجیو جب تک میں خلیفہ کی اجازت لے کر

اُسے اس کے آگے پیش نہ کرلوں۔ ممکن ہی کہ اس کی پریشانی دور ہو جائے، اسے دیکھ کر خلیفہ قوت القلوب کو بھول جائے اور ماہی گیر کی کچھ مدد کرے اور اس کا سبب تو ہو۔ غلام نے کہا کہ میرے مولا، جو تیرا جی چاہے کر، خدا تجھے بہ طور امیرالمومنین کی سلطنت کے رکن کے قائم رکھے اور سلطنت پر خدا ہمیشہ اپنا سایہ رکھے اور اس کی حفاظت کرے۔ وزیر جعفر، خلیفہ کے پاس گیا اور غلاموں کے سردار نے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ ماہی گیر کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ خلیفہ نے کہا کہ ای لال بالوں والے، تیرا کس قدر مجھ پر احسان ہی، قرض خواہ قرض دار ہوگیا، تیرا گریبان پکڑتے اُلٹا میرا گریبان پکڑا گیا۔ اُدھر جب جعفر خلیفہ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ پریشان حال سر جھکائے بیٹھا ہوا ہی۔ خلیفہ کے سامنے آکر جعفر نے کہا ای امیرالمومنین، دین کی حرمت بچانے والے اور رسول اللہؐ کے چچیرے بھائی، سلامتی ہو تجھ پر! خلیفہ سر اٹھا کر بولا، تیرے اوپر بھی سلامتی ہو، خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! جعفر نے کہا اگر امیرالمومنین کی اجازت ہو اور میرا اس میں نقصان نہ ہو تو بندہ کچھ کہنا چاہتا ہی۔ خلیفہ نے کہا بات کرنے میں کب تجھے نقصان پہنچا ہی! تو تو وزیروں کا سردار ہی، جو تیرا جی چاہے کہہ۔

وزیر جعفر بولا ای میرے مولا، جب میں تیرے پاس سے نکل کر گھر جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ تیرا استاد، معلم اور شریک دروازے پر کھڑا ہی، تجھ سے ناراض ہی، تیری شکایت کر رہا ہی اور کہہ رہا ہی کہ سبحان اللہ میں نے اُسے مچھلیاں مارنی سکھائیں اور جب وہ ٹوکرے لینے گیا تو لوٹ کر بھی نہ آیا۔ یہ عجیب طرح کی شرکت ہی اور وہ عجیب قسم کا شاگرد۔ اگر

تجھے اس کے شریک بننے کی ضرورت ہو تو بسم اللہ، ورنہ اس سے کہہ دے کہ وہ دوسرے کو شریک بنالے۔ یہ سُن کر خلیفہ مسکرا دیا، اس کی پریشانی دور ہوگئی اور وہ جعفر سے کہنے لگا تجھے میری جان کی قسم، کیا تو سچ کہتا ہو ماہی گیر دروازے پر کھڑا ہو؟ جعفر نے جواب دیا، امیرالمومنین، تیری جان کی قسم وہ دروازے پر کھڑا ہو۔ خلیفہ نے کہا ای جعفر! واللہ میں اس کا حق ادا کرنے میں ضرور کوشش کروں گا، اگر خدا کو میرے ہاتھ سے اس کی بدبختی منظور ہو تو اُسے بدبختی ملے گی اور اگر نیک بختی منظور ہو تو نیک بختی ملے گی۔ یہ کہہ کر خلیفہ نے ایک کاغذ لیا اور اس کے کئی پُرزے کرکے جعفر سے کہا کہ تو ان پر اپنے ہاتھ سے ایک دینار سے لے کر ایک ہزار دینار تک مختلف رقمیں لکھ اور چھوٹے چھوٹے عہدے سے لے کر خلافت تک مختلف مراتب اور سرداریاں اور چھوٹی سے چھوٹی سزا سے لے کر قتل تک طرح طرح کی سزائیں۔ جعفر نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اب خلیفہ نے کہا ای جعفر! قسم ہو مجھے اپنے پاک آباو اجداد کی، حمزہ اور عقیل کے ساتھ اپنی قرابت کی کہ میں خلیفہ ماہی گیر کو بلا کر حکم دیتا ہوں کہ وہ ان پُرزوں میں سے جن کے مضمون کی خبر سوا میرے اور تیرے کسی کو نہیں ایک پُرزہ اٹھالے اور جو بات اس میں نکلے گی وہ میں اسے دے دوں گا، اگر اس میں خلافت بھی نکلی تو میں اُسے ماہی گیر کو دے دوں گا اور اس میں کسی طرح کی کنجوسی نہ کروں گا؛ اور اگر پُرزے میں پھانسی یا ہاتھ کاٹنا یا قتل کرنا نکلا تو وہی اس کے ساتھ کروں گا۔ اُسے لے آ۔ یہ سُن کر جعفر نے اپنے دل میں کہا لاحول ولا قوۃ، اگر اس بے چارے کے لیے کوئی نقصان دہ چیز نکلی تو اس کا گناہ میرے اوپر ہوگا۔ لیکن خلیفہ قسم کھا چکا ہو اور اب سوا اس کے اور

کوئی چارہ نہیں کہ وہ اندر آئے اور خدا کو جو منظور ہو وہی ہو گا۔
یہ کہہ کر خلیفہ ماہی گیر کے پاس گیا اور چاہتا تھا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جائے خلیفہ کے ہوش جاتے رہے وہ اپنے دل میں کہنے لگا میری کیا عقل ماری گئی تھی کہ میں اس لال بالوں والے منحوس غلام کے پاس آیا اور اس بڑی توند والے سے ملا۔ جعفر اسے اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا، غلام اس کے آگے آگے اور پیچھے پیچھے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میری گرفتاری کافی نہ تھی کہ یہ لوگ میرے آگے اور پیچھے بھی ہو لیے کہ میں بھاگ بھی نہ سکوں۔ جب جعفر اسے لیے ہوئے سات دہلیزیں طے کر چکا تو اس سے کہنے لگا اے ماہی گیر، تو اس وقت مسلمانوں کے سردار اور دین کی حرمت کے بچانے والے کے سامنے کھڑا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے بڑا پردہ اٹھایا اور خلیفہ ماہی گیر کی خلیفہ رشید سے چار آنکھیں ہو گئیں جو تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور جس کے آس پاس بڑے بڑے عہدے دار خدمت کے لیے کھڑے تھے۔
جب خلیفہ نے اُسے پہچان لیا تو آگے بڑھ کر کہا اے بانسری بجانے والے، اہلاً و سہلاً، یہ ٹھیک نہیں کہ ہم ماہی گیری کریں اور تو مجھے مچھلیوں کی خبر گیری کے لیے چھوڑ کر چلتا بنے اور لوٹ کر نہ آئے۔ غلام طرح طرح کے چوپایوں پر سوار میرے پاس آ پہنچے اور مچھلیاں چھین کر لے گئے، میں اکیلا کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ سب تیرا قصور ہے کیوں کہ تو اگر ٹوکرے جلد لے آتا تو ہم سو دینار کی مچھلیاں بیچ لیتے۔ اب جب کہ میں اپنے دام لینے آیا تو لوگوں نے مجھے گرفتار کر لیا، لیکن یہ تو بتا کہ تجھے کس نے یہاں باندھ کر بٹھایا ہے۔ یہ سن کر خلیفہ مسکرا دیا اور پردے کا ایک کنارہ اٹھا کر اپنا سر نکالا اور کہا آگے بڑھ کر ان میں سے ایک کاغذ اٹھا لے۔ خلیفہ ماہی گیر نے امیر المومنین

سے کہا کہ آج تک تو تو ماہی گیر تھا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آج تو نجومی ہو گیا، لیکن تجھے معلوم نہیں کہ جو شخص زیادہ پیشے اختیار کرتا ہے اس کی مفلسی زیادہ ہو جاتی ہے۔ جعفر نے کہا جلدی سے پرزہ اٹھا لے باتیں مت بکو اور امیرالمومنین کا حکم مان۔ خلیفہ ماہی گیر نے آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھایا اور کہنے لگا کاش کہ یہ بانسری بجانے والا میرا پورا شاگرد ہو جاتا اور میرے ساتھ مچھلیاں مارتا! اس کے بعد اس نے پرزہ اٹھا کر خلیفہ کو دے دیا اور کہنے لگا ای بانسری بجانے والے، جو کچھ اس میں نکلے اسے مجھ سے ہرگز نہ چھپائیو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی اور اس نے وہ کہانی . . . . .

آٹھ سو بیالیسویں رات

آٹھ سو بیالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! خلیفہ ماہی گیر نے خلیفہ سے کہا ای بانسری بجانے والے! جو کچھ اس میں نکلے اسے مجھے ضرور بتائیو۔ خلیفہ نے وہ پرزہ لے کر وزیر جعفر کو دے دیا اور کہا پڑھ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ جعفر اسے دیکھ کر لاحول پڑھنے لگا، خلیفہ نے کہا ای جعفر! خیر تو ہے، اس میں کیا لکھا ہے؟ اس نے کہا امیرالمومنین، پرزے میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے سنو ڈنڈے مارے جائیں۔ خلیفہ نے سنو ڈنڈے مارنے کا حکم دے دیا اور لوگ اس کا حکم بجالائے۔ خلیفہ کے سنو ڈنڈے مارے۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور کہنے لگا ای بڑی نوسد والے خدا اس مذاق پر لعنت بھیجے! کیا گرفتاری اور مار پیٹ بھی مذاق کا

ایک حصّہ ہو؟ جعفر نے کہا امیرالمومنین، یہ کیوں کر ہو سکتا ہو کہ یہ بے چارہ دریا پر آئے اور پیاسا لوٹ جائے۔ اتنی مہربانی کر کہ وہ ایک اور پُرزہ اٹھائے، ممکن ہو کہ اس میں کوئی ایسی چیز نکل آئے جس کے پانے سے اس کی مفلسی دُور ہو جائے۔ خلیفہ نے جواب دیا ای جعفر! خُدا کی قسم اگر اس نے دوسرا پُرزہ اٹھایا اور اس میں قتل کیا جانا نکلا تو میں اسے ضرور قتل کر دوں گا۔ اور اس کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔ جعفر بولا اگر وہ مر گیا تو آرام سے رہے گا۔ خلیفہ ماہی گیر نے کہا خدا تیرا بُرا کرے! کیا میری وجہ سے بغداد تم پر تنگ ہو گیا ہو کہ تم میری جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ جعفر بولا ایک پُرزہ اٹھالے اور خدا سے بھلائی کی دُعا کر۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ایک پُرزہ اُٹھا کر جعفر کو دے دیا۔ جعفر نے اسے لے کر پڑھا اور چُپ ہو گیا۔ خلیفہ نے کہا ای یحیٰی کے بیٹے، کیا ہو کہ تو چُپ ہو گیا؟ اس نے کہا کہ امیرالمومنین، پُرزے میں لکھا ہو کہ ماہی گیر کو کچھ نہ دیا جائے۔ خلیفہ نے کہا اس کی روزی ہمارے پاس نہیں، اس سے کہہ دے کہ کالا منھ کرے۔ جعفر بولا کہ قسم ہو تیرے پاک باپ داداؤں کی اُسے ایک بار اور اٹھانے دے، ممکن ہو کہ اُس میں اس کی روزی نکل آئے۔ خلیفہ نے کہا اچھا اسے ایک پُرزہ اور اٹھا لینے دے لیکن یہ سب سے آخری ہو۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر تیسرا پُرزہ اٹھایا، اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ماہی گیر کو ایک دینار دیا جائے۔ جعفر نے خلیفہ ماہی گیر سے کہا، میں تو چاہتا تھا کہ خدا تجھے مالا مال کر دے لیکن خدا کی مرضی میں فقط یہ دینار تھا۔ خلیفہ ماہی گیر بولا ہر سو ڈنڈے کے بدلے ایک دینار بڑی برکت ہو! خُدا تیرے بدن کو تن درست رکھے۔

خلیفہ ہنس پڑا اور جعفر خلیفہ کا ہاتھ پکڑ کر راستے باہر لے گیا۔ دروازے
پر پہنچ کر صندل سے اس کی چار آنکھیں ہوئیں۔ وہ کہنے لگا ای ماہی گیر!
امیر المومنین کی بخشش سے ہمیں بھی کچھ دیتا جا۔ خلیفہ نے کہا ای لال بالوں والے،
واللہ تو سچ کہتا ہی، ای کلوسٹے! تو میرے ساتھ حصہ بخرا کرنا چاہتا ہی؟ میں نے
سو ڈنڈے کھائے اور ایک دینار پایا، وہ تیرے لیے حلال ہی۔ یہ کہہ کر اس
نے دینار کو غلام کے آگے پھینک دیا اور روتا ہوا باہر چلا گیا۔ اُسے اس
حالت میں دیکھ کر غلام کو یقین آگیا کہ وہ سچ کہتا ہی۔ وہ اس کی طرف بڑھا
اور غلاموں سے کہا کہ اسے واپس لے آؤ اور وہ اسے واپس لے آئے۔
غلام نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تھیلی نکالی اور اسے کھول کر الٹا تو اس
میں سے سو دینار نکل پڑے۔ اس نے کہا ای ماہی گیر! یہ سونے کے دینار
لے لے، یہ تیری مچھلیوں کی قیمت ہی، اور چلتا بن۔ یہ دیکھ کر خلیفہ ماہی گیر
خوش ہو گیا اور یہ سو دینار اور خلیفہ کا ایک دینار لے کر چل دیا اور یہ بھول گیا
کہ اس پر مار پڑی تھی۔ اب خدا کو یہ منظور ہوا کہ وہ کنیزوں کے بازار میں سے
ہو کر گزرے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ حلقہ باندھے کھڑے ہیں۔
خلیفہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ یہ لوگ آخر کیوں کھڑے ہیں؟ آگے بڑھ کر
تاجروں کے اندر گھس گیا۔ تاجر بولے کہ اس ٹُچّے لفنگے کو جگہ دو۔ وہ ہٹ
گئے اور خلیفہ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا کھڑا ہی اور اس کے آگے ایک صندوق
رکھا ہی اور ایک غلام اس پر بیٹھا ہی اور بوڑھا پکار پکار کر کہہ رہا ہی کہ ای
تاجرو اور ای مال والو! کون ہمت کرتا ہی اس صندوق کو خریدنے کی،
جس کے اندر معلوم نہیں کہ کیا ہی اور جو امیر المومنین ہارون الرشید کی بیوی
شہزادی زبیدہ بنت قاسم کے گھر سے آیا ہی۔ خدا تمھیں برکت دے! تمھاری

طرف سے کیا بولی بولوں؟ ایک تاجر بولا کہ واللہ یہ بڑی خطرناک بات ہے لیکن مجھے ملامت نہ کرو تو میں ایک بات کہتا ہوں، بیس دینار میں میں اسے لیتا ہوں۔ دوسرا بولا کہ پچاس دینار، پھر دوسرے تاجر نے بڑھ کر بولی بولی یہاں تک کہ سو دینار ہو گئے۔

اب دلال نے کہا، اے تاجرو! کوئی اس سے بڑھ کر بولی بولنا چاہتا ہے؟ خلیفہ ماہی گیر بولا کہ میں ایک سو ایک دینار لگاتا ہوں۔ یہ سن کر تاجر سمجھے کہ خلیفہ مذاق کرتا ہے، ہنس دیے اور کہنے لگے اے غلام! اسے خلیفہ کے ہاتھ ایک سو ایک دینار میں بیچ ڈال۔ غلام بولا خدا کی قسم میں بھی سوا اس کے اور کسی کے ہاتھ نہ بیچوں گا۔ اے ماہی گیر! لے اور خدا اس میں تجھے برکت دے! دینار لا۔ خلیفہ نے دینار نکال کر اسے دے دیے اور سودا پکا ہو گیا۔ پھر غلام نے اسی وقت دینار اسے بخش دیے اور محل میں جاکر اپنی کارروائی کی خبر دی، زبیدہ خوش ہو گئی۔ خلیفہ ماہی گیر نے صندوق اپنے کندھے پر رکھا لیکن وہ اتنا بھاری تھا کہ وہ اسے اٹھا نہ سکا اس لیے وہ اسے اپنے سر پر رکھ کر اپنے محلے پہنچا اور اسے سر پر سے اتارا تھک کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ اور اپنے دل میں کہنے لگا کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس صندوق میں کیا ہے! اب اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا، صندوق کو بہ مشکل اندر لے گیا، پھر اس کے کھولنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہ کھلا، وہ اپنے اوپر لعنت بھیجنے لگا کہ میری عقل پر کیا پتھر پڑے تھے جو میں نے یہ صندوق خرید لیا! خیر اسے توڑ کر دیکھنا تو چاہیے کہ اس کے اندر کیا ہے؟ پھر اس نے قفل پر زور لگایا آخر ہار کر سونے کا ارادہ کیا کہ کل دیکھا جائے گا۔ صندوق پڑا تھا اور ماہی گیر

کی کوٹھری چھوٹی ۔ لیٹنے کی جگہ نہ تھی۔ لہٰذا وہ صندوق کے اوپر لیٹ گیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسے صندوق میں کوئی چیز ہلتی ہوئی معلوم ہوئی اور وہ اتنا ڈرا کہ اس کی نیند اُڑ گئی، ہوش جاتے رہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی۔ ......

آٹھ سو تینتالیسویں رات

آٹھ سو تینتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! خلیفہ ماہی گیر کے ہوش اُڑ گئے، اُٹھ بیٹھا سمجھا کہ اس کے اندر جن ہیں اور کہنے لگا کہ شکر ہے خدا کا کہ اس نے مجھے کھولنے نہ دیا، اگر میں نے اسے کھول لیا ہوتا تو وہ اندھیرے میں مجھ پر چڑھ کر مجھے مار ڈالتے اور اُلٹے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہ کہہ کر وہ پھر صندوق پر لیٹ گیا، اب وہ پہلے سے زیادہ ہلنے لگا خلیفہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یہ دوسری بار ہے اور پہلے سے زیادہ خطرناک۔ اب وہ چراغ ڈھونڈنے چلا لیکن اسے نہ پایا اور نہ اس کے پاس چراغ خریدنے کے لیے ٹکے تھے، اس لیے اس نے گھر سے نکل کر آواز دی کہ اے محلے والو! محلے والے سو گئے تھے، وہ سب اس کی آواز سن کر جاگ پڑے اور کہنے لگے خلیفہ، تجھے کیا ہوا؟ اس نے کہا مجھے ایک چراغ لادو کیوں کہ جنات میرے پیچھے دوڑتے ہیں۔ لوگ خوب ہنسے اور اسے ایک چراغ لاکر دیا۔ خلیفہ چراغ لے کر گھر میں گیا اور صندوق کے قفل کو پتھر مار مار کر توڑ ڈالا، دیکھا کہ اس کے اندر ایک لڑکی پڑی سو رہی ہے جو حور کی طرح ہے۔ اس وقت بھنگ کا نشہ اُتر رہا تھا اور

اس نے ہوش میں آکر آنکھیں کھول دی تھیں، کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر خلیفہ بولا، اے میری آقا! تو کہاں سے آئی ہے؟ لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور بولی یاسمین، نرگس۔ خلیفہ نے کہا یہاں تو منہدی کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔ اب لڑکی کو ہوش آیا اور وہ خلیفہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی تو کون بلا ہے اور میں کہاں ہوں؟ اس نے جواب دیا تو میرے گھر میں ہے۔ لڑکی بولی کیا میں خلیفہ ہارون الرشید کے محل میں نہیں ہوں؟ خلیفہ نے جواب دیا اے پاگل، رشید کس بلا کا نام ہے؟ تو تو میری زرخرید باندی ہے، آج ہی تو میں تجھے ایک سو ایک دینار میں خرید کر گھر لایا ہوں، اسی صندوق میں تو تو سو رہی تھی۔

اس کی باتیں سن کر لڑکی نے کہا، تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا کہ میرا نام خلیفہ ہے۔ نہ معلوم میرا ستارہ کیوں چمک اٹھا، اب تک تو میری تقدیر اُلٹی تھی۔ لڑکی ہنس پڑی، اس نے کہا کہ یہ باتیں جانے دے، بتا کہ تیرے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ ہے۔ اس نے کہا کہ پینے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ دو دن سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں اور اس وقت میں ایک نوالے کے لیے محتاج ہوں۔ لڑکی نے کہا تیرے پاس دام ہیں؟ اس نے جواب دیا خدا اس صندوق کو سلامت رکھے! اس نے مجھے کنگال کر دیا ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا میں اس پر لگا چکا اور مفلس ہو گیا۔ لڑکی ہنس پڑی اور کہنے لگی، اچھا جا کر پڑوسیوں کے ہاں سے کچھ کھانے کے لیے لا کیوں کہ میں بھوکی ہوں۔ خلیفہ اٹھ کر باہر گیا اور آواز دی کہ اے محلے والو! وہ سب سو رہے تھے، جاگ اٹھے اور انھوں نے کہا خلیفہ، کیا بات ہے؟ وہ بولا اے میرے پڑوسیو! میں بھوکا ہوں اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ یہ سن کر ایک شخص روٹی لے آیا، دوسرا گوشت کی

بوٹیاں، تیسرا ایک ٹکڑا پنیر اور چوتھا ایک کھیرا۔ خلیفہ اپنی جھولی بھر کر اندر گیا اور لڑکی کے آگے سب چیزیں ڈال دیں اور کہا کہ کھا۔ لڑکی ہنس پڑی اور کہنے لگی میں کھاؤں کیسے؟ پینے کے لیے پانی تو ہے نہیں، اگر نوالہ پھنس گیا تو میں مر جاؤں گی۔ خلیفہ نے کہا میں تیرے لیے یہ گھڑا بھر کے لاتا ہوں اور نکل کر محلے کے بیچ میں پہنچا اور آواز دی کہ اے محلے والو! انھوں نے کہا اے خلیفہ، آج رات تجھ پر کیا مصیبت آئی ہے؟ اس نے کہا تم نے مجھے کھانا دیا اور میں نے کھایا اور اب مجھے پیاس لگی ہے لہٰذا پانی پلاؤ۔ یہ سن کر ایک شخص کوزہ بھر لایا ایک لوٹا اور ایک لٹیا۔ خلیفہ گھڑا بھر کر اندر لایا اور کہا اے میری آقا، اب تیری کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لڑکی نے کہا ٹھیک ہے، اس وقت اور کوئی ضرورت نہیں۔ خلیفہ نے کہا اب مجھ سے باتیں کر اور اپنا قصہ سنا۔ لڑکی بولی اگر تو مجھے نہیں جانتا تو سن، میں خلیفہ ہارون الرشید کی کنیز قوت القلوب ہوں۔ شہزادی زبیدہ نے رشک سے مجھے بھنگ کھلا کر اس صندوق میں بند کر دیا۔ لیکن شکر ہے خدا کا کہ اس نے یہ کام مشکل سے آسان کر دیا اور یہ محض تیری خوش قسمتی سے یہ ماجرا میرے ساتھ پیش آیا کیوں کہ اب تجھے خلیفہ ہارون الرشید سے اتنا مال ملے گا کہ تو امیر ہو جائے گا۔

خلیفہ نے کہا وہی رشید تو نہیں جس کے محل میں میں قیدی تھا؟ لڑکی نے کہا ہاں وہی۔ خلیفہ نے کہا واللہ میں نے اس سے زیادہ کنجوس کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ بے خبر اور کم عقل بانسری بجانے والا! اس نے کل میرے سو ڈنڈے لگوائے اور ایک دینار دیا، اگرچہ میں نے اسے مچھلیاں مارنا سکھایا اور اپنا شریک بنایا تھا، پھر بھی اس نے میرے ساتھ دھوکے بازی کی۔ لڑکی نے کہا ایسی بری باتیں نہ کر آنکھیں کھول، اگر تو اسے پھر دیکھے تو ادب سے

باتیں کیجیو اور تیرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ باتیں سُن کر اسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ سوتے سے جاگ اٹھا اور چوں کہ خدا کو اس کی بہتری منظور تھی اس کی عقل ٹھکانے آگئی اور اس نے کہا کہ سر آنکھوں پر، اچھا اب سو جا۔ وہ جاکر سو گئی اور خلیفہ اس سے دور جاکر سو رہا، صبح تک سوتا رہا۔ جب دن نکلا تو لڑکی نے اس سے دوات اور کاغذ مانگا وہ دونوں چیزیں لے آیا تو لڑکی نے اس تاجر کے نام ایک خط لکھا جو خلیفہ کا مصاحب تھا، اس میں اپنی ساری کہانی بیان کی اور یہ کہ اب اُسے خلیفہ ماہی گیر نے خرید لیا ہے اور وہ اس کے پاس ہے۔ خلیفہ کو یہ خط دے کر لڑکی نے کہا کہ اسے لے کر جوہری بازار جا، ابن قرناص جوہری کی دُکان پوچھ کر اُسے دے دیجیو اور کوئی بات نہ کیجیو۔ خلیفہ بولا سر آنکھوں سے اور لڑکی کے ہاتھ سے خط لے کر جوہری بازار گیا، وہاں پہنچ کر ابن قرناص کی دُکان پوچھی۔ لوگوں نے اس کا پتا بتا دیا، خلیفہ نے اس کے پاس جاکر سلام کیا۔ جوہری نے نہایت حقارت سے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ خلیفہ نے اسے خط دے دیا، اس نے خط تو لے لیا مگر پڑھا نہیں کیوں کہ وہ سمجھا کہ یہ کوئی فقیر ہے جو بھیک مانگنے آیا ہے اور اپنے غلام سے کہا کہ اسے آدھا درہم دے دے۔ خلیفہ بولا مجھے بھیک نہیں چاہیے، خط پڑھ۔ جب اس نے خط پڑھا تو اس کا مطلب سمجھا اور اسے چوم کر اپنے سر پر رکھ لیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی۔ ......

آٹھ سو چوالیسویں رات

آٹھ سو چوالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! ابن قرناص نے خط چوم کر اپنے سر پر رکھ لیا اور کھڑا ہو کر کہنے لگا بھائی تیرا گھر کہاں ہے؟ خلیفہ نے جواب دیا تو میرا گھر کیوں جاننا چاہتا ہے؟ کیا تیرا ارادہ ہے کہ میرے گھر جا کر میری کنیز کو چرا لائے؟ اس نے جواب دیا نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کھانا خرید کر تیرے ساتھ کر دوں تاکہ تو اور تیری کنیز کھائے۔ خلیفہ نے کہا میرا گھر فلاں محلے میں ہے۔ تاجر بولا شاباش! کم بخت، خدا تیرا بھلا کرے! یہ کہہ کر اس نے اپنے دو غلاموں کو آواز دی اور کہا کہ اس شخص کو محسن صراف کی دکان پر لے جاؤ، اس سے کہنا کہ اسے ایک ہزار دینار سونے کے دے دے اور پھر اسے فوراً میرے پاس لے آنا۔ دونوں غلام خلیفہ کو صراف کی دکان پر لے گئے اور اس سے کہا ای محسن، اس شخص کو ایک ہزار دینار سونے کے دے دے۔ خلیفہ دینار لے کر دونوں غلاموں کے ساتھ ابن قرناص کی دکان پر لوٹ آیا اور دیکھا کہ وہ زرزردی خچر پر سوار ہے جس کی قیمت ایک ہزار دینار ہوگی، کالے اور گورے غلام اس کے آس پاس ہیں، اس کے خچر کے برابر ایک اور خچر اسی طرح کا ہے جس پر زین کسا ہوا اور لگام لگی ہوئی ہے۔ ابن قرناص نے خلیفہ سے کہا بسم اللہ، اس خچر پر سوار ہو جا۔ اس نے جواب دیا میں نہیں سوار ہوں گا، خدا کی قسم میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے گرا دے گا۔ تاجر بولا خدا کی قسم تجھے سوار ہونا پڑے گا۔ خلیفہ سوار ہونے کے لیے آگے بڑھا اور اُلٹا سوار ہوا، خچر کی دُم پکڑ لی اور ایک چیخ ماری۔ خچر نے اسے زمین

پر پھینک دیا اور لوگ اس پر ہنس پڑے۔ خلیفہ اٹھ کر کہنے لگا میں نے تجھ سے کہا نہ تھا کہ میں اس اونچے گدھے پر سوار نہ ہوں گا۔ اب ابن قرناص خلیفہ کو بازار میں کھڑا چھوڑ کر امیر المومنین کے پاس گیا، اُسے کنیز کی خبر دے کر کنیز کو اپنے گھر لے آیا۔ جب خلیفہ اپنے گھر گیا کہ دیکھے کنیز کس حال میں ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ محلّے والے جمع ہیں اور کہ رہے ہیں کہ آج خلیفہ بے حد ڈرا معلوم ہوتا ہے، نہ معلوم یہ کنیز اسے کہاں سے ہاتھ لگ گئی۔ ایک بولا کہ وہ پاگل کٹنا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے لڑکی کو راہ میں بدمست پایا ہوگا اٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور اب اپنا جرم معلوم کر کے روپوش ہوگیا۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ خلیفہ جا پہنچا، لوگوں نے کہا کم بخت، یہ تو نے کیا کیا؟ تجھے معلوم ہے کہ تجھ پر کیا گزری۔ اس نے جواب دیا خدا کی قسم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جس کنیز کو تو چرا لایا تھا ابھی غلام آکر اسے لے گئے، وہ تجھے بھی ڈھونڈتے تھے لیکن تو غائب تھا۔ خلیفہ بولا وہ کیوں کر میری کنیز کو لے گئے؟ ایک شخص نے جواب دیا کہ اگر تو ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ تجھے مار ڈالتے۔ خلیفہ ان کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوا بلکہ اُلٹے پاؤں ابن قرناص کی دکان پر گیا، دیکھا کہ وہ سوار ہے۔ اس سے کہنے لگا کہ خدا کی قسم یہ تیری حرکت ٹھیک نہیں، اِدھر تو تو نے مجھے باتوں میں لگایا اُدھر غلاموں کو بھیج کر میری کنیز کو پکڑوا بلایا۔ ابن قرناص نے کہا چپ چاپ میرے ساتھ چل۔ یہ کہہ کر وہ اسے ایک خوب صورت مکان میں لے گیا، وہاں پہنچ کر خلیفہ نے دیکھا کہ کنیز ایک سونے کے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے اُس کے آس پاس چاند سی خوب صورت دس لونڈیاں ہیں۔ ابن قرناص نے اسے دیکھتے ہی زمین کو بوسہ دیا، کنیز نے

پوچھا کہ تو نے میرے نئے آقا کے ساتھ کیا کیا جس نے اپنی ساری پونجی دے کر مجھے خریدا ہے؟ ابن قرناص نے کہا اے میری آقا، میں نے اسے ایک ہزار دینار سونے کے دیے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے خلیفہ کا قصہ شروع سے لے کر آخر تک بیان کر دیا۔ کنیز نے ہنس کر کہا کہ اس کا بُرا نہ مان کیوں کہ وہ سیدھا سادا آدمی ہے، لے یہ ایک ہزار دینار میری طرف سے اس کے نذر ہیں، اور خدا نے چاہا تو خلیفہ اسے مالا مال کر دے گا۔ وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ خلیفہ کے پاس سے ایک خادم آیا کہ وہ قوت القلوب کو بُلاتا ہے کیوں کہ جس وقت اسے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابن قرناص کے گھر میں ہے وہ بے چین ہے۔ جب قوت القلوب خلیفہ کے پاس گئی تو خلیفہ کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ خلیفہ کے پاس پہنچ کر اس نے زمین چومی۔ خلیفہ نے اٹھ کر اُسے سلام کیا، مرحبا کہا اور پوچھا کہ اس شخص کے ساتھ تیری کیسی گزری جس نے تجھے خریدا تھا؟ کنیز نے کہا اس شخص کا نام خلیفہ ماہی گیر ہے، وہ دروازے پر کھڑا ہے، اس نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کے اور میرے مولا امیر المومنین کے درمیان مچھلیاں مارنے کی شرکت کے بارے میں کچھ حساب کتاب باقی ہے۔ خلیفہ نے پوچھا وہ کیا واقعی دروازے پر کھڑا ہے؟ اس نے کہا ہاں، خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے بُلاؤ، وہ آیا تو اس نے خلیفہ کے سامنے زمین چومی اور دُعا دی کہ تیری عزت اور نعمتیں ہمیشہ قائم رہیں۔

یہ سُن کر خلیفہ کو تعجب ہوا، وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا اے ماہی گیر، کیا آج رات تو سچے معنوں میں میرا شریک تھا؟ خلیفہ امیر المومنین کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے دل کڑا کر کے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی

جس نے تجھے تیرے چچیرے بھائی کا خلیفہ بنایا سوا دیکھنے اور باتیں کرنے کے میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ اس کے بعد ماہی گیر اس سے سارا ماجرا کہتا جاتا اور وہ ہنستا جاتا۔ پھر اس نے غلام کا قصّہ بیان کرنا شروع کیا اور یہ کہ اس نے خلیفہ کے ایک دینار کے ساتھ سنّو دینار اور دیے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بازار جا کر میں نے اُن ایک سو ایک دینار میں ایک صندوق خریدا جس کے اندر آ سے معلوم نہ تھا کہ کیا ہے۔ غرض اس نے سارا ماجرا شروع سے لے کر آخر تک کہہ سُنایا۔ اس پر خلیفہ خوب ہنسا اور کہنے لگا اے حق کو حق دار تک پہنچانے والے، مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ خلیفہ کو پچاس ہزار دینار اور خلفا کی پوشاک میں سے ایک عمدہ خلعت اور ایک خچر دیا جائے۔ علاوہ ازیں خلیفہ کو خدمت کے لیے حبشی غلام عطا کیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس زمانے کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہے۔ خلیفہ کو اپنی کنیز کے مل جانے کی بڑی خوشی ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ حرکت اس کی چچیری بہن شہزادی زبیدہ کی تھی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو پینتالیسویں رات

آٹھ سو پینتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! قوت القلوب کے دوبارہ مل جانے پر خلیفہ بہت خوش ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ حرکت شہزادی زبیدہ کی تھی۔ وہ زبیدہ پر سخت ناراض ہوا، ایک مدت اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا، نہ وہ اس سے ملتا اور نہ اس کا دل

اس سے ملنے کو چاہتا۔ زبیدہ کو خلیفہ کے غصّے کا علم ہوا تو اسے بڑا رنج ہوا اس کا رنگ سُرخ سے زرد ہو گیا۔ زیادہ صبر نہ ہو سکا تو اس نے اپنے چچیرے بھائی امیرالمومنین کے پاس خط بھیجا جس میں اس نے اپنے جُرم کا اعتراف کیا اور معافی مانگی۔ جب شہزادی زبیدہ کا خط امیرالمومنین کے پاس پہنچا اور اس نے پڑھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے گناہ کو تسلیم کرتی ہے اور اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا سارے گناہ بخش دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے زبیدہ کے خط کا جواب لکھا کہ میں نے تجھے معاف کر دیا اور تجھ سے پھر خوش ہو گیا۔ اس کے بعد خلیفہ نے خلیفہ ماہی گیر کی تنخواہ پچاس دینار ماہانہ مقرر کر دی اور اس کی بڑی عزت اور احترام کرنے لگا۔ چلتے وقت خلیفہ نے امیرالمومنین کے آگے زمین چومی اور اکڑتا ہوا چل دیا۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو اس پر اس غلام کی نظر پڑی جس نے اُسے ایک سو دینار دیے تھے۔ اس نے اسے پہچان لیا اور کہا کہ اے ماہی گیر! یہ تمام چیزیں تجھے کہاں سے ہاتھ لگیں؟ ماہی گیر نے سارا ماجرا شروع سے لے کر آخر تک کہہ سُنایا۔ غلام بھی خوش ہو گیا کیوں کہ ماہی گیر کے امیر ہو جانے کا وہی سبب تھا اور کہنے لگا کہ اس اپنے مال میں سے مجھے بھی کچھ انعام دے۔ خلیفہ نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس میں سے ایک ہزار دینار کی ایک تھیلی نکال کر غلام کو دی۔ غلام نے کہا کہ اپنا مال اپنے پاس رکھ، خدا اس میں تجھے برکت دے! اور اسے اس بات پر تعجب ہوا کہ ماہی گیر باوجود غریب ہونے کے اس قدر با مروّت اور سخی ہے۔

اب خلیفہ خچّر پر سوار ہو کر روانہ ہوا، غلام اس کی رکابیں پکڑے ہوئے تھے۔ وہ سرائے پہنچا تو لوگ اسے دیکھ کر اچنبھے میں آ گئے۔ جب وہ خچّر سے

اُترا تو لوگوں نے بڑھ کر اُس سے اِس خوش قسمتی کا سبب پوچھا، اس نے سارا قصہ کہہ سُنایا۔ اس کے بعد اس نے ایک خوب صورت مکان خریدا، اسے خوب آراستہ کیا اور اس میں رہنے لگا۔ جب وہ اس مکان میں رہنے لگا تو اس نے شہر کے ایک بڑے آدمی کی بیٹی سے نکاح کر لیا جو بڑی حسین تھی اپنے آپ کو ان نعمتوں میں دیکھ کر اس نے خدا کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا اور اس کی حمد و ثنا کی۔ خلیفہ سے خلیفہ ہارون الرشید بہت خوش تھا وہ اکثر اس کے دربار میں آیا جایا کرتا اور بہت کچھ انعام و اکرام پاتا۔ اسی طرح خلیفہ نہایت عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگا یہاں تک کہ مزوں کو کرکرا اور صحبتوں کو تتر بتر کرنے والی موت آ پہنچی، پاک ہے وہ ذات جس کے لیے عزت اور بقا ہے، جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اور کبھی مرتی نہیں۔

مسرور تاجر اور زین المواصف کی کہانی

پُرانے زمانے میں ایک تاجر تھا، مسرور نام اور اپنے زمانے کے حسین ترین لوگوں میں بڑا مال دار اور خوش حال تھا۔ لیکن اسے چمنوں، باغوں کی سیر بہت پسند تھی اور خوب صورت عورتوں کو بہت چاہتا تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک نہایت خوب صورت چمن میں ہے جہاں چار چڑیاں ہیں، منجملہ ان کے ایک فاختہ ہے جو صاف چاندی کی طرح سفید ہے۔ یہ فاختہ اسے بہت پسند آئی وہ دل سے اُسے چاہنے لگا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک بڑا پرندہ جھپٹ کر اُسے اٹھا لے گیا۔ اس صدمے سے اس کی آنکھ کھل گئی اور فاختہ کو نہ پا کر صبح تک بے چین رہا اور لپے

دل میں کہنے لگا کہ کسی کے پاس جا کر اس خواب کی تعبیر پوچھنی چاہیے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

آٹھ سو چھیالیسویں رات

آٹھ سو چھیالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! سرور تاجر نے کہا کہ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنا چاہیے جو اس خواب کی تعبیر بتا سکے۔ یہ ارادہ کرکے وہ اٹھ کھڑا ہوا، ادھر ادھر پھرتے پھراتے وہ اپنے گھر سے دور پہنچ گیا لیکن کوئی تعبیر بتانے والا نہ ملا مجبور ہو کر لوٹا۔ موڑ پر ایک عالی شان حویلی دیکھی۔ یہ ایک امیر آدمی کا مکان تھا، اُسے اندر سے ایک دردناک آواز گانے کی سنائی دی۔ آواز سن کر سرور نے دروازے کے اندر نظر دوڑائی، دیکھا کہ وہاں ایک عمدہ سے عمدہ چمن ہے اور اندر سُرخ زربفت کے پردے پڑے ہیں جن پر موتی اور جواہرات کا کام ہے، ان کے پیچھے چار لڑکیاں بیٹھی ہیں، ایک میانہ قد، چہرہ چاند کی طرح گول اور روشن، آنکھیں سُرمئی، بھنویں ملی ہوئی، منہ گویا سلیمان کی انگوٹھی، ہونٹ اور دانت گویا موتی اور مونگے۔ اپنے حسن و جمال اور قد و قامت سے وہ عقلوں کو سلب کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر سرور مکان کے اندر چلا گیا اور اتنا آگے بڑھا کہ وہ پردے کے پاس جا پہنچا۔ لڑکی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، سرور نے فوراً اسے سلام کیا اس نے نہایت میٹھی آواز سے سلام کا جواب دیا۔ اسے دیکھتے ہی سرور کے ہوش جاتے رہے۔ باغ میں چنبیلی، لالہ، بنفشہ، گلاب، نارنگی اور طرح طرح کے خوش بودار درخت

ہیں۔ میووں سے لدے ہوئے اور چار چبوتروں پر سے جو آمنے سامنے ہیں پانی گر رہا ہے۔ قمریاں، کبوتر، بلبلیں اور قسم قسم کی چڑیاں اپنی اپنی بولیاں بول رہی ہیں اور لڑکی اپنے حسن و جمال میں اس آن بان سے جھک کر چل رہی ہے کہ دیکھنے والا اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔

لڑکی نے مسرور سے کہا اے شخص، تو اپنے گھر کے علاوہ دوسرے گھر میں اور اپنی لڑکیوں کو چھوڑ کر دوسروں کی لڑکیوں کے پاس بغیر گھر والوں کی اجازت کے کیسے آ گیا؟ مسرور بولا اے میری آقا! جب میں نے چمن دیکھا تو اس کا ہرا بھرا پن، اس کے پھول اور چڑیوں کا گانا مجھے اتنا بھایا کہ میں اندر آ گیا تاکہ تھوڑی دیر سیر و تفریح کر کے چلا جاؤں۔ لڑکی نے کہا اچھا آ بیٹھ جا۔ مسرور تاجر نے اس کی باتیں سنیں، اس کی ترچھی نظروں اور سڈول قد و قامت کی طرف دیکھا تو ہوش جاتے رہے اور چمن کی لطافت اور چڑیوں کے نغموں نے ست کر دیا۔ زین المواصف کے دل میں بھی اسے دیکھ کر ہزاروں تمنائیں آنے لگیں اور مسرور نے کوشش کر کے اپنا راز چھپایا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مصیبت پر سوا صبر کے اور چارہ نہیں۔ اسی حالت میں رات ہو گئی اور لڑکی نے حکم دیا کہ دسترخوان بچھایا جائے۔ دسترخوان آیا تو اس پر طرح طرح کے کھانے تھے۔ دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا پھر دسترخوان بڑھایا گیا، ہاتھ دھونے کا سامان آیا انھوں نے ہاتھ دھوئے۔ اس کے بعد شمع دان رکھے گئے اور اس میں کافوری موم بتیاں لگائی گئیں۔ زین المواصف نے کہا آج رات میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے کیوں کہ مجھے کچھ حرارت ہے۔ مسرور نے کہا خدا تیری گھبراہٹ دور کرے اور رنج و غم سے نجات دے۔ لڑکی نے کہا کہ مجھے شطرنج کھیلنے

کی عادت ہی، تجھے بھی شطرنج کھیلنا آتا ہی؟ اس نے جواب دیا ہاں آتا ہی۔ لڑکی نے بساط بچھائی جو آبنوس اور ہاتھی دانت کی تھی، خانوں کے بیچ میں سونے کا کام تھا اور مہرے موتی اور یاقوت کے تھے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو سینتالیسویں رات

آٹھ سو سینتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب بساط بچھ گئی تو زین المواصف نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تو لال چاہتا ہی یا سفید؟ وہ بولا ای حسینوں کی سرتاج اور خوب صورتوں کی زینت، تو لال لے کیوں کہ وہ خوب صورت ہیں اور تیری شان کے شایاں، سفید میرے لیے رہنے دے۔ لڑکی نے کہا منظور، اور انھیں لے کر اس نے سفید مہروں کے مقابلے میں رکھا۔ مسرور کی نظر اس کی انگلیوں پر پڑی، اس نے دیکھا گویا وہ چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ ان کی خوب صورتی دیکھ کر مسرور دنگ ہو گیا اور لڑکی اس کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی گھبرا نہیں بلکہ صبر سے کام لے اور ثابت قدم رہ۔ مسرور بولا ای حسن کی دیوی تیرے آگے چاند اور سورج مات ہیں پھر عاشق کو کیوں کر صبر ہو سکتا ہی؟ وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ لڑکی نے کہا شاہ مات اور اس نے مات مان لی اور زین المواصف کو یقین آ گیا کہ وہ اس کی محبت میں پاگل ہی، اس نے کہا ای مسرور، میں تیرے ساتھ بے شرط لگائے نہیں کھیل سکتی اور ہم دونوں قسم کھائیں کہ ہم میں سے ایک دوسرے کو

دھوکا نہ دے گا، دونوں نے قسم کھالی۔ لڑکی بولی ای مسرور، اگر میں جیت جاؤں تو تجھ سے دس دینار لوں گی اور اگر تو جیت جائے تو میں تجھے کچھ نہ دوں گی۔ مسرور کو خیال تھا کہ میں جیتوں گا، کہنے لگا ای میری آقا! اپنی قسم کو جھوٹا نہ کیجیو، میں دیکھتا ہوں کہ شطرنج میں تو مجھ سے زبردست ہی۔ لڑکی بولی منظور۔ دونوں کھیلنے، پیادے بڑھانے اور ان کے مقابلے میں فرزیں رکھنے، رخوں سے زور ڈالنے اور گھوڑے بڑھا بڑھا کر خوش ہونے لگے۔

زین المواصف کے سر پر نیلے زربفت کا ایک رومال تھا، اُسے اس نے سر سے گرا دیا، اپنی کلائیاں کھول لیں جو نور کے ستونوں کی طرح تھیں اور لال مہروں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا ہوشیار ہو جا۔ ان پیاری پیاری باتوں کو سن کر مسرور کے ہوش و حواس جاتے رہے اور جب اس نے اپنا ہاتھ سفید مہروں کی طرف بڑھایا تو وہ سُرخ پر جا پڑا۔ لڑکی بولی ای مسرور، کیا تیری عقل ماری گئی ہی؟ لال مہرے میرے ہیں، اور سفید تیرے۔ مسرور نے کہا جو کوئی تیری طرف دیکھتا ہی اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ زین المواصف نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اس سے سفید مہرے خود لے لیے لال اسے دے دیے اور ان سے کھیل کر اُسے مات کر دی۔ اسی طرح وہ اس سے برابر کھیلتی اور مات پر مات دیتی رہی اور وہ ہر بار دس دینار ہارتا رہا۔ جب زین المواصف نے دیکھا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہی تو کہنے لگی ای مسرور! جب تک شرط کے مطابق تو مجھے ہرا نہ دے اس وقت تک تیری مراد حاصل نہ ہوگی اور اب میں سو دینار فی بازی تجھ سے کھیلوں گی۔ مسرور نے کہا سر آنکھوں سے۔ پھر

کھیل شروع ہوا۔ لڑکی ہر بار اسے مات دیتی اور وہ ہر بار اسے سو دینار دیتا۔ صبح تک یہی ہوتا رہا اور وہ ایک بھی مات نہ دے سکا۔ اب وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے کہا اے مسرور، تو کیا چاہتا ہے؟ اس نے جواب دیا میں گھر جاکر اور دام لاتا ہوں، ممکن ہے کہ میری مراد بر آئے۔ لڑکی نے کہا جیسی تیری مرضی، وہ گھر جاکر بہت سے دام لے آیا اور کھیلنے لگا، لیکن مسرور ایک مات بھی نہ دے سکا۔ تین دن تک اسی طرح بازیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ وہ سب ہار گیا۔

جب اس کے سارے دام ختم ہو گئے تو لڑکی نے کہا اے مسرور، اب کیا کرے گا؟ اس نے جواب دیا کہ اب میں اپنے عطار خانے کی بازی لگاتا ہوں۔ لڑکی نے پوچھا اس کی مالیت کتنی ہے؟ مسرور نے جواب دیا پانسو دینار، لڑکی نے پانچ بازیاں کھیل کر اسے بھی جیت لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی کنیزوں، جائدادوں، باغوں اور عمارتوں کی بازی لگا دی لڑکی نے ان سب کو بھی جیت لیا اور جیت کر کہنے لگی کہ اب تیرے پاس اور کچھ باقی ہے جس سے کھیلے؟ مسرور نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے تیری محبت کے دام میں پھنسایا، اب میرے پاس تھوڑا یا بہت کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ لڑکی نے کہا جو کام اپنی خوشی سے شروع کیا جائے آخر میں اس پہ پچھتانا نہیں چاہیے، اگر تو پچھتاتا ہے تو اپنا مال لے اور چلتا بن، میں تجھے معاف کرتی ہوں۔ مسرور نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے ہماری قسمت میں یہ باتیں لکھی ہیں اگر تو میری جان بھی لینا چاہے تو تیری خوشی حاصل کرنے کے لیے یہ چھوٹی سی بات ہے کیوں کہ میں سوا تیرے اور کسی سے محبت نہیں کرتا۔ لڑکی نے کہا اے مسرور، جاکر قاضی اور گواہوں

کو لے آ اور میرے نام تمام املاک اور جائدادیں لکھ دے۔ وہ فوراً جاکر قاضی اور گواہوں کو لے آیا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی قاضی کے ہوش جاتے رہے اس نے کہا اے میری آقا! میں محض اس شرط پر دستاویز لکھ سکتا ہوں کہ تو تمام جائدادیں، کنیزیں اور املاک خرید لے اور سب تیرے تصرف اور قبضے میں آجائیں۔ لڑکی نے کہا اس کا فیصلہ تو ہم کر چکے ہیں، بس تو اتنا لکھ دے کہ مسرور کی ساری ملکیت اور کنیزیں اتنے داموں کے بدلے زین المواصف کی ملکیت ہوگئی ہیں۔ قاضی نے دستاویز لکھ دی گواہوں نے دستخط کر دیے اور زین المواصف نے اسے لے لیا۔ اور شہرزاد کو صبح ہوئی......

آٹھ سو اڑتالیسویں رات

آٹھ سو اڑتالیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! زین المواصف نے قاضی کے ہاتھ سے وہ دستاویز لے لی جس کی بنا پر مسرور کی تمام چیزیں اس کی ملکیت ہو چکی تھیں اور اس سے کہا کہ چلتا بن۔ اب اس کی کنیز ہبوب نے مسرور سے کہا کہ کچھ شعر سنا۔ اس نے شطرنج کے متعلق شعر سنائے۔ زین المواصف کو اس کی فصاحت پر بڑا تعجب ہوا، اور اس نے مسرور سے کہا کہ یہ دیوانہ پن جانے دے ہوش کی بات کر اور روانہ ہو کیوں کہ تو شطرنج کے کھیل میں اپنا مال و متاع ہار چکا ہے اور تیرا مطلب پورا نہ ہوا، اب تیرے لیے کوئی چارہ باقی نہیں۔ مسرور نے کہا اے میری آقا! تیرا جو جی چاہے مانگ اور جو کچھ تو مانگے گی میں فوراً لا کر

حاضر کروں گا۔ اس نے جواب دیا تیرے پلّے ٹکے تو رہے ہی نہیں لائے گا کہاں سے؟ مسرور بولا ای اُمیدوں کی انتہا، اگرچہ میرے پاس کچھ نہیں رہا لیکن لوگ میری مدد کریں گے۔ لڑکی نے کہا کہیں دینے والے بھی مانگتے ہیں! مسرور بولا میرے عزیز و اقارب اور دوست ہیں جو کچھ میں ان سے مانگوں گا وہ انکار نہ کریں گے۔ لڑکی نے کہا بس چار نافے خالص مُشک چار کلھیاں مشک بلاؤ کا مشک، چار رطل عنبر، چار ہزار دینار نقد اور چار سو پوشاکیں شاہی زربفت کی چاہتی ہوں۔ اگر ای مسرور تو یہ چیزیں لے آئے تو تجھے میرا وصال حاصل ہو گا۔ مسرور نے کہا ای چاندوں کو شرمانے والی، یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

یہ کہہ کر مسرور وہاں سے چل دیا تاکہ لڑکی کی مانگی ہوئی چیزیں لے آئے اور لڑکی نے اپنی باندی ہیوب کو اُس کے پیچھے پیچھے بھیجا تاکہ وہ دیکھے کہ جن لوگوں کا مسرور نے ذکر کیا ہے وہ اس کی بات کہاں تک مانتے ہیں۔ وہ چلا ہی جا رہا تھا کہ اس کی نظر دُور سے ہیوب پر پڑی، وہ ٹھیر گیا کہ ہیوب قریب آ جائے۔ وہ قریب آ گئی تو اس نے پوچھا ای ہیوب تو کہاں جا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا ای میرے آقا! میری مالکہ نے مجھے فلاں کام کے لیے تیرے پیچھے بھیجا ہے۔ پھر اس نے شروع سے لے کر آخر تک ساری باتیں کہہ دیں جو زین المواصف نے کہی تھیں۔ مسرور نے کہا واللہ ای ہیوب، میرے پلّے اب کوڑی بھی نہیں۔ ہیوب بولی پھر تو نے کیوں وعدہ کیا؟ اس نے کہا کتنے ایسے وعدے ہیں جنھیں وعدہ پورا کرنے والا پورا نہیں کر سکتا اور محبت کا گھائل تو وعدہ پورا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ سن کر ہیوب نے کہا ای مسرور! خوش ہو اور

گھبرا نہیں، خدا کی قسم میری وجہ سے تیرا وصال ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ مسرور کے پاس سے چل دی، اپنی آقا کے پاس پہنچی، بلک بلک کر رونے لگی اور کہا واللہ اے میری آقا! وہ شخص بڑے مرتبے والا ہے لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آقا نے کہا خدا کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا، ہم نے اس شخص کے ساتھ نرم دلی کا برتاؤ نہیں کیا، اس کے ٹکے تو سب وصول کر لیے لیکن نہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آئے نہ اس سے وصال کیا۔ اگر میں اس کی مراد پوری کر دوں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات پھیل نہ جائے۔ ہیوب بولی اے میری آقا، ہمیں اس کے حال پر اور مال کے لے لینے پر افسوس ہے لیکن تیرے پاس سوائے میرے اور دوسری باندی سکوب تیسرا ہے کون! اور ہم دونوں تیری کنیزیں ٹھیریں، ہم میں سے کس کی مجال ہو سکتی ہے کہ اپنی زبان کھول سکے۔ یہ سن کر لڑکی نے اپنا سر جھکا لیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر باندیوں نے کہا اے ہماری آقا! ہماری رائے میں تو اُسے بلا بھیج، اس پر مہربانی کر اور اُسے اس بات پر مجبور نہ کر کہ وہ کمینوں کے آگے ہاتھ پھیلائے، ایسی درخواست بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لڑکی نے باندیوں کا کہنا مان لیا، قلم دوات اور کاغذ منگا کر مسرور کے نام خط لکھا اور اُسے بند کر کے اپنی باندی ہیوب کے حوالے کر دیا۔ ہیوب وہ خط لے کر مسرور کے پاس گئی، دیکھا کہ وہ رو رہا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو انچاسویں رات

آٹھ سو انچاسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ،

ہبوب کے کانوں میں اُس کے رونے کی آواز آئی تو اس نے دروازے پر دستک دی۔ سرور نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ہبوب نے اندر بڑھ کر اسے خط دیا۔ اس نے خط لے کر پڑھا اور کہا ای ہبوب، تو اپنی آقا کے پاس سے کیا خبر لائی ہو؟ اس نے کہا ای میرے آقا! اس سوال کے جواب دینے کی اب کیا ضرورت باقی رہتی ہو۔ سب کچھ اس کے اندر ہو اور تو تو سمجھ دار آدمی ہو۔ سرور خوش ہو گیا اور خط کا جواب لکھ کر اس نے ہبوب کو دے دیا۔ جب وہ خط لے کر زین المواصف کے پاس پہنچی تو سرور کی خوبیاں بیان کرنے لگی، اس کے کرم کا ذکر کیا اور کوشش کی کہ وہ اس سے مل جائے۔ زین المواصف نے کہا ای ہبوب! اس نے یہاں آنے میں دیر کی۔ ہبوب بولی وہ آ ہی رہا ہو گا۔ ابھی یہ بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ سرور نے آکر دروازہ کھڑکھڑایا۔ ہبوب نے دروازہ کھولا اور اُسے لے کر اپنی آقا زین المواصف کے پاس گئی۔ زین المواصف نے اسے سلام کیا، مرحبا کہہ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور ہبوب سے کہا کہ اس کے لیے ایک بہترین پوشاک لا۔ وہ جا کر ایک زربفت کی پوشاک لے آئی لڑکی نے اسے لے کر سرور کو پہنا دیا، خود بھی ایک نہایت نفیس پوشاک پہن لی، اپنے سر پر سفید موتیوں کی جالی ڈال کر اس کے اوپر ایک رومال باندھ لیا جس میں موتی، جواہرات اور یاقوت ٹنکے ہوئے تھے اور اپنے بال کھول دیے جو کالی رات کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ عود کی دھونی لی، مشک اور عنبر سے اپنے آپ کو معطر کیا۔ اس کی باندی ہبوب بولی کہ خدا تجھے نظر سے بچائے! پھر وہ نہایت ناز و انداز سے ٹہلنے لگی اور سرور کی طرف متوجہ ہوئی۔ سرور اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر میرا گمان ٹھیک ہو تو تو انسان نہیں بلکہ جنت

کی دلھنوں میں سے ایک دلھن ہی۔

اس کے بعد اس نے دستر خوان منگوایا دونوں نے کھایا پیا اور مزے اڑائے، پھر کھانے کے بعد شراب نوشی کا سامان آیا، جام اور پیالوں کا دور چلنے لگا دونوں مزے میں آ گئے۔ مسرور نے ایک جام بھر کر کہا کہ یہ اس کی صحت کا جام ہی جس کا میں غلام ہوں اور جو میری آقا ہی۔ لڑکی نے کہا ای مسرور! جو شخص اپنے دین پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہی، جس نے ہماری روٹی اور نمک کھایا ہی اس کا حق ہمارے اوپر ہو گیا ہی، لہذا یہ باتیں جانے دے تیرا مال و دولت میں تجھے لوٹائے دیتی ہوں۔ اس نے جواب دیا ای میری آقا! جن چیزوں کا تو ذکر کر رہی ہی وہ تجھ پر حلال ہو چکی ہیں۔ اگر تو اس قسم کو توڑنا چاہتی ہی جو میرے اور تیرے درمیان ہی تو ابھی جا کر مسلمان ہوے جاتا ہوں۔ ہیوب نے کہا ای میری آقا! تو ابھی کم سن ہی تاہم بہت سی باتیں جانتی ہی میں خدا کو تیرے آگے سفارش میں پیش کرتی ہوں، اگر تو نے میرا کہنا نہ مانا اور میری دل دہی نہ کی تو میں آج رات تیرے گھر میں نہ سوؤں گی۔ اس نے کہا ای ہیوب، جو تو چاہتی ہی وہی ہوگا، اٹھ اور ہمارے لیے ایک کمرہ تیار کر۔ ہیوب نے اٹھ کر ایک اور کمرہ تیار کیا اپنی پسند کے مطابق اسے کھانا تیار کر کے لائی، شرابیں حاضر کیں، جام کے دور چلنے لگے اور ان پر مستی چھا گئی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو پچاسویں رات

آٹھ سو پچاسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ،

جب دَور چلنے اور انھیں مزا آنے لگا تو زین المواصف بولی ای مسرور! اب وصل کا وقت قریب آگیا ہی۔ یہ کہ کر وہ ایک کمرے میں گئی اور وہاں جاکر اس نے مسرور کو بُلایا۔ مسرور کمرے کے اندر جاکر اس سے لپٹ گیا، اُسے گلے سے لگایا، بوسے دیے اور اس کی وہ مُراد پُوری ہوگئی جسے وہ ناممکن سمجھتا تھا۔ اس کے بعد زین المواصف نے کہا ای مسرور! تیرا مال اب ہم پر حرام ہی اور تجھ پر حلال کیوں کہ ہم دوست ہوگئے۔ یہ کہ کر اس نے مسرور کا مال واپس کردیا جو اس نے لیا تھا اور کہنے لگی ای مسرور! کیا تیرا کوئی باغ ہی جہاں ہم چل کر سیر کریں؟ اس نے کہا کہ ای میری آقا! میرا ایک ایسا باغ ہی جس کی نظیر نہیں۔ یہ کہ کر وہ اپنے گھر گیا اور اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ نہایت نفیس کھانا تیار کریں اور عمدہ محفل آراستہ ہو۔ پھر اس نے لڑکی کو اپنے گھر بُلایا، وہ اپنی کنیزوں کو لے کر آئی سب نے مل بیٹھ کر کھانا کھایا، خوش ہوئے اور پھر دَور چلنے لگا انھیں بڑا مزا آیا اور دوست کا دوست سے وصال ہوا پھر لڑکی نے مسرور سے کہا کہ میں سارنگی بجانا چاہتی ہوں اور اس نے سارنگی ہاتھ میں لے کر اس کے تاروں کو جنبش دی اور نہایت عمدہ راگ بجائے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

آٹھ سو اکیانویں رات

آٹھ سو اکیانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! راگ بجانے کے بعد لڑکی بولی ای مسرور صبح ہونے والی ہی اور سوا رخصت ہونے کے چارہ نہیں تاکہ کہیں بدنامی نہ ہوجائے۔ مسرور بسر وچشم کہ کر اُسے

گھر تک پہنچا آیا اور رات بھر اسی کی یاد میں گزاری۔ سویرا ہوا اور دن نکلا تو وہ ایک عمدہ ہدیہ تیار کرکے اس کے پاس لے گیا اور اس کے ساتھ رہا۔ اسی طرح ایک مدت تک دونوں نے نہایت عیش و عشرت سے زندگی بسر کی۔ ایک دن لڑکی کے پاس اس کے شوہر کا خط آیا کہ وہ عنقریب آنے والا ہے لڑکی اپنے دل میں کہنے لگی خدا اس کا ستیاناس کرے! اگر وہ یہاں آگیا تو ہمارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔ کاش کہ میں اسے روک چکی ہوتی! جب مسرور اس کے پاس آیا اور دستور کے موافق بیٹھ کر باتیں کرنے لگا تو وہ بولی ای مسرور! میرے شوہر کا خط آیا ہے وہ عنقریب سفر سے لوٹنے والا ہے، اب کیا کرنا چاہیے؟ ہم دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسرور نے کہا میں کیا بتاؤں کیا کرنا چاہیے۔ تو اپنے شوہر کی عادتوں سے زیادہ واقف ہے، علاوہ اس کے تو بڑی سمجھ دار عورت ہے، ایسی ایسی ترکیبیں سوجھتی ہے جن کی مردوں کو ہوا تک نہیں لگی۔ لڑکی بولی وہ بہت سخت آدمی ہے اور رشک کرنے والا بھی۔ لیکن جب وہ سفر سے لوٹے اور تجھے خبر ملے کہ وہ آگیا ہے تو اس کے پاس آکر سلام کیجیو، اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رکھیو اور اس سے کہیو کہ بھائی، میں عطر فروش ہوں، مختلف قسم کے عطر اس سے خریدیو، اس کے پاس آتا جاتا رہیو اور اس کے ساتھ بات چیت کیا کیجیو اگر وہ تجھ سے کوئی بات کہے تو اس کی مخالفت نہ کیجیو۔ غالباً اس طرح سے میری چال اس پر چل جائے گی۔ مسرور نے کہا سر آنکھوں پر، اور وہاں سے روانہ ہو گیا مگر محبت کی آگ اس کے دل میں سلگتی رہی۔

اس کا شوہر گھر آیا تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، مرحبا کہا اور سلام کیا۔ شوہر نے دیکھا کہ بیوی کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ عورت نے اپنا منھ

زعفران سے دھویا تھا اور بعض دوسری ترکیبیں بھی کی تھیں جو عورتیں کیا کرتی ہیں۔ پوچھنے لگا کہ خیریت تو ہے اس نے جواب دیا کہ جب سے تو گیا ہے میں اور کنیزیں سب بیمار ہیں، ہم سب کا دل تجھ میں لگا ہوا تھا۔ غرض کہ وہ جدائی کی تکلیفیں بیان کرکے رونے لگی اور کہا تو نے بھی غضب کیا اتنے لمبے سفر میں اکیلا چلا گیا۔ میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے وہم آتے تھے۔ ای میرے آقا! اب اگر جاؤ تو اکیلے نہ جانا اور مجھے برابر اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہنا تاکہ میرے دل کو اطمینان رہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو باونویں رات

آٹھ سو باونویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! جب زین المواصف نے اپنے شوہر سے کہا کہ بے ساتھی کے سفر پر نہ جانا تو اس نے جواب دیا کہ سر آنکھوں سے، واللہ تیرا کہنا بجا ہے اور تیری رائے ٹھیک، تیری جان کی قسم جیسا تو چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد وہ اپنا کچھ سامان لے کر دکان پر گیا۔ دکان کھولی اور لین دین کرنے لگا۔ وہ ابھی دکان ہی پر تھا کہ مسرور پہنچا، سلام کرکے اس کے پاس جا بیٹھا دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے تھیلی نکالی۔ تھیلی کھول کر اس میں سے دینار نکالے اور انھیں زین المواصف کے شوہر کو دے کر کہا کہ ان دیناروں کے بدلے مجھے مختلف قسم کے عطر دے دے تاکہ میں بھی کچھ نفع کما لوں۔ اس نے بہت اچھا کہہ کر مختلف قسم کے عطر اسے دے دیے۔ مسرور ایک مدت تک اس کے پاس آتا جاتا رہا۔ ایک دن اس نے مسرور سے مخاطب ہو کر کہا میری

خواہش ہے کہ کسی شخص کو تجارت میں اپنا شریک بناؤں۔ مسرور بولا میں بھی اسی خیال میں ہوں کہ کوئی شخص میرے ساتھ مل کر تجارت کرے کیوں کہ میرے باپ نے جو یمن میں تجارت کرتا تھا میرے لیے بہت مال چھوڑا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ضائع نہ ہو جائے۔ زین المواصف کے شوہر نے کہا کیا تجھے یہ منظور ہے کہ تو میرا رفیق بنے اور میں سفر اور حضر میں تیرا ساتھی رہوں، تجھے خرید و فروخت اور لین دین سکھاؤں۔ مسرور نے اقرار کر لیا۔ تاجر اسے لیے ہوئے اپنے گھر پہنچا اور اس کو دروازے پر بٹھا کر اندر اپنی بیوی زین المواصف کے پاس گیا اور کہا میں نے ایک شخص کو اپنا رفیق بنایا ہے اور اسے کھانے پر بلایا ہے، لہذا ہمارے لیے نہایت نفیس کھانا تیار کر۔ زین المواصف سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو مسرور ہے۔ اب اس کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ یار کی مہمانی میں اس نے نہایت عمدہ کھانے پکوائے اور اس کی دعوت کی خوب تیاری کی۔

جب مسرور زین المواصف کے شوہر کے گھر میں آیا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ میرے سامنے اس سے پردہ نہ کر، اس سے کہہ تیرے آنے سے ہمیں خوشی ہوئی۔ زین المواصف نے ناراض ہو کر کہا، کیا تو مجھے ایک غیر مرد کے سامنے لے جائے گا، خدا نہ کرے! اگر تو میری بوٹیاں بھی کر ڈالے تو بھی اس کے سامنے نہیں آؤں گی۔ شوہر بولا تو اس سے کیوں شرماتی ہے؟ وہ بیوپاری ہے اور ہم یہودی۔ اب تو میں اور وہ دوست ہو گئے ہیں۔ بیوی نے جواب دیا میں ایسے اجنبی مرد کے آگے نہیں آنا چاہتی جس کو نہ میری آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ میں اسے پہچانتی ہوں۔ شوہر کو اس کی عصمت کا یقین ہو گیا اور وہ برابر اس کی خوشامد کرتا رہا۔ آخر وہ اٹھی نقاب ڈالی اور کھانا لے کر مسرور کے پاس گئی اور اسے خوش آمدید کہا۔ مسرور نے اپنا سر

نیچا کرلیا گویا وہ شرماتا ہے۔ شوہر اسے سر جھکائے دیکھ کر اپنے دل میں کہنے لگا بے شک یہ شخص بڑا پارسا ہے۔ اب انھوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اس کے بعد دسترخوان بڑھایا گیا، شراب پیش کی گئی، زین المواصف مسرور کے ٹھیک سامنے بیٹھی اور اُسے دیکھتی رہی، وہ بھی اُسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ دن ختم ہوگیا اور مسرور اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی لگی رہی۔ اُدھر زین المواصف کا شوہر اپنے دوست کی خوبیوں اور خوب صورتی میں محو تھا۔ رات ہوئی تو اس کی بیوی اس کے لیے رات کا کھانا لائی تاکہ وہ عادت کے مطابق کھائے۔ گھر میں ایک بُلبل تھی وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو بُلبل اس کے پاس آتی اور سر پر اُڑتی۔ جانور کو کیا خبر اُسے مسرور سے کوئی خوف نہیں رہا تھا، مسرور کھانا کھانے بیٹھا تو بُلبل بھی اس کے آس پاس اُڑتی رہی مگر جب مسرور چلا گیا اور بُلبل کا مالک آیا تو اُس نے اُسے بالکل نہ پہچانا اور اس کے پاس بھی نہ پھٹکی۔ چڑیا کی یہ کیفیت دیکھ کر اور یہ کہ وہ اس سے دور دور بھاگتی ہے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اب زین المواصف کا حال سنو، اُسے رات بھر نیند نہ آئی وہ مسرور کی یاد میں بے چین رہی۔ یہی حال دوسری رات کو بھی رہا اور تیسری رات بھی۔ یہودی کو کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوا۔ چوتھی رات کو آدھی رات کے قریب اس کی آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھا کہ وہ اس کی گود میں لیٹی ہوئی نیند میں مسرور کا نام لے رہی ہے۔ یہ بات اسے بہت ناگوار گزری لیکن زبان سے کچھ نہ بولا، سویرا ہوا تو وہ اپنی دکان پر جاکر بیٹھا، اتنے میں مسرور پہنچا اور سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور کہا اے میرے بھائی خوش آمدید، میں تیرے دیدار کا مشتاق تھا۔ یہ کہہ کر وہ دیر تک باتیں چیتیں کرتا رہا اور

آخر میں کہا بھائی، میرے ساتھ میرے گھر چل تاکہ ہم بھائی چارا کریں۔ مسرور بولا کہ سر آنکھوں پر۔ جب دونوں گھر پہنچے تو یہودی نے آگے جا کر اپنی بیوی کو خبر دی کہ مسرور آیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر تجارت کریں اور ایک دوسرے کے بھائی بنیں، لہذا ہمارے لیے ایک کمرے کو خوب سجا۔ تجھے بھی ہمارے پاس موجود رہنا اور بھائی چارا دیکھنا ہوگا۔ بیوی نے کہا خدا کے لیے مجھے اس غیر مرد کے سامنے روز روز نہ آنے دے، اس کے سامنے آنے سے مجھ کو کیا واسطہ؟ یہ سُن کر یہودی چُپ ہو گیا اور باندیوں کو حکم دیا کہ کھانا اور شراب لائیں۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ بُلبل کو لاؤ، وہ آ کر مسرور کی گود میں بیٹھ گئی اور اپنے مالک کو پہچانا تک نہیں۔ یہودی نے پوچھا ای میرے آقا، تیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا میرا نام مسرور ہے، اس کی بیوی سوتے میں یہی نام لیا کرتی تھی اب اس نے سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ مسرور کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور آنکھیں مار رہی ہے اُسے یقین آ گیا کہ اس کی چال چل گئی۔ اس نے کہا ای میرے آقا! اجازت دے کہ میں جا کر اپنے چچیرے بھائی کو لے آؤں تاکہ وہ بھی بھائی چارے کے وقت موجود ہوں۔ مسرور بولا کہ جیسی تیری مرضی ہو کر، یہودی گھر سے نکلا اور کمرے کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا، اور شہرزاد کو صبح ہو گئی......

آٹھ سو تر پنویں رات

آٹھ سو تر پنویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ،

زین المواصف کا شوہر کمرے کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا جہاں ایک محراب تھی اور وہ دونوں دکھائی دیتے لیکن وہ اسے نہ دیکھ سکتے۔ اس نے سُنا کہ زین المواصف اپنی باندی سکوب سے پوچھ رہی ہے کہ تیرا آقا کدھر گیا؟ اس نے جواب دیا باہر۔ زین المواصف بولی کہ دروازہ بند کر کے لوہے کا کھٹکا لگا دے اور جب وہ دروازہ کھٹکھٹائے تو پہلے مجھے خبر کر کے کھولیو۔ باندی بولی کہ ایسا ہی ہو گا۔ اب زین المواصف نے پیالہ اٹھایا اور اسے گلاب و مشک سے دھو کر مسرور کے پاس لائی۔ مسرور اٹھ کر اس سے ملا اور کہنے لگا خدا کی قسم تیرا لعابِ دہن اس شراب سے میٹھا ہے۔ اس نے اسے شراب پلائی اور اس نے اسے۔ اس کے بعد اس نے مسرور پر سر سے لے کر پاؤں تک گلاب چھڑکا یہاں تک کہ اس کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر اُس کا شوہر دونوں کو دیکھ رہا اور ان کی محبت پر تعجب کر رہا تھا۔ اس کے دل میں غصے کی آگ بھڑکتی جاتی تھی اور رشک کے مارے اس کے تن بدن میں پتنگے لگے جاتے تھے۔

اب وہ دروازے کے پاس آیا دیکھا کہ وہ بند ہے۔ طیش میں آ کر اس نے زور سے کھڑکھڑایا۔ باندی نے کہا اے میری آقا! تیرا آقا آ گیا۔ اس نے جواب دیا دروازہ کھول دے۔ خدا اسے خیریت سے واپس نہ لے جائے! سکوب نے جا کر دروازہ کھولا، یہودی نے کہا تو نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ باندی نے کہا جب تو نہیں ہوتا تو دروازہ بند رکھا جاتا ہے نہ دن میں کھلا رہتا ہے نہ رات میں۔ آقا بولا تو نے خوب کیا، یہ مجھے پسند ہے۔ اس کے بعد وہ ہنستا ہوا مسرور کے پاس پہنچا اپنے دل کا بھید بالکل ظاہر نہ کیا اور بولا اے مسرور، آج بھائی چارا رہنے دے کسی اور دن

بھائی چارا کریں گے۔ مسرور نے کہا سر آنکھوں سے، جیسی تیری مرضی۔
مسرور اپنے گھر کو روانہ ہوا اور زین المواصف کا شوہر سوچ میں پڑ گیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ وہ نہایت حیران و پریشان اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ بلبل تک مجھے نہیں پہچانتی، باندیاں میرے ہوتے ہوئے دروازہ بند کر لیتی ہیں اور دوسروں کو مجھ پر ترجیح دیتی ہیں۔

جب زین المواصف کے شوہر کو سچ سچ واقعہ معلوم ہو گیا تو اس نے اپنا سارا مال و متاع بیچنا شروع کیا اور اپنے دل میں یہ منصوبہ باندھا کہ جب تک ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور نہ کیا جائے گا یہ اپنی حرکت سے باز نہ آئیں گے۔ وہ اپنا مال اسباب بیچ چکا تو اس نے جھوٹ موٹ ایک خط لکھا اور اپنی بیوی کو سنا کر کہا کہ یہ خط میرے چچیرے بھائیوں کے پاس سے آیا ہے، وہ مجھے اور تجھے دعوت دیتے ہیں۔ بیوی نے پوچھا ہمیں کتنے دن وہاں ٹھیرنا ہوگا؟ اس نے جواب دیا بارہ دن۔ یہ سن کر وہ راضی ہو گئی اور اس نے پوچھا کہ کسی باندی کو بھی ساتھ لیتی چلوں؟ شوہر نے کہا ہبوب اور سکوب کو لیتی چل، خطوب کو یہیں رہنے دے۔
پھر اس نے ان کے لیے ایک نفیس محمل تیار کرایا اور انھیں سفر میں لے چلنے کی ٹھان لی۔ زین المواصف نے مسرور کو کہلا بھیجا کہ اگر میعاد گزرنے کے بعد ہم نہ آئیں تو سمجھ جائیو کہ اس نے دھوکا دے کر ہم دونوں کو جدا کیا ہے۔ مجھے اس کے مکر و فریب سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن جو عہد و پیمان میرے اور تیرے درمیان ہے اُسے نہ بھول لینا۔ اُدھر زین المواصف کا شوہر سفر کی تیاریاں کر رہا تھا اور اِدھر وہ روتی پیٹتی تھی اور اسے دن رات کسی کل چین نہ آتا تھا۔ شوہر نے اس کی بالکل پروا نہ کی۔ جب

زین المواصف نے دیکھا کہ اس کا شوہر سفر پر تلا ہوا ہے تو اس نے اپنے کپڑے لتے اور مال دولت جمع کر کے اپنی بہن کے سپرد کیے، اسے اپنا سارا ما جرا سنایا اور رخصت ہو کر روتی ہوئی اپنے گھر آئی۔ اتنے میں اونٹ دروازے پر آ گئے تھے ان پر سامان لدوار ہا تھا اور سب سے زیادہ خوب صورت اونٹنی زین المواصف کے لیے تیار تھی۔ سفر کے سوا زین المواصف کو کوئی چارہ نظر نہ آیا تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اتفاق کی بات کہ اس کا شوہر کسی کام سے باہر گیا اسے موقع ملا اور وہ باہر نکل کر ہر دروازے پر کچھ لکھ آئی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو چونویں رات

آٹھ سو چونویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ ! جب زین المواصف تمام دروازوں پر لکھ چکی تو بلک بلک کر رونے اور گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرنے لگی اور کہا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری قسمت میں یہ باتیں لکھیں۔ اس کے بعد وہ اپنے شوہر کے پاس گئی اس نے اسے اس محمل میں بٹھا دیا جو اس کے لیے بنایا گیا تھا اور اس سے کہا اے زین المواصف، گھر چھوڑنے پر افسوس نہ کر ہم لوٹ کر جلد آ جائیں گے۔ وہ اسے تسلی دیتا رہا یہاں تک کہ قافلہ شہر کے باہر نکل آیا اور اپنی راہ لگا۔ زین المواصف کو جدائی کا یقین آ گیا، اسے تکلیف ہونے لگی۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر مسرور اپنے گھر میں بیٹھا اپنی محبوبہ کے خیال میں محو تھا کہ اس کے دل میں جدائی محسوس ہونے لگی فوراً

اُٹھ کر اس کے گھر پہنچا، دیکھا کہ دروازے میں قفل پڑا ہوا ہے اور اوپر زین المواصف کے ہاتھ سے کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے پڑھ کر مسرور کو غش آگیا، ہوش آیا تو وہ پہلے دروازے کو کھول کر دوسرے کے پاس پہنچا دیکھا کہ وہاں بھی کچھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، اور اسی طرح تیسرے پر بھی۔ انھیں پڑھ کر اس کے اشتیاق اور تمنا نے اتنا زور کیا کہ وہ قافلے کے نشانِ قدم پر دوڑا اور انھیں جا لیا، دیکھا کہ وہ سب کے پیچھے ہے اور اس کا شوہر سامان کی حفاظت کی خاطر سب کے آگے۔ اسے دیکھتے ہی مسرور روتا ہوا محمل سے لپٹ گیا اور زین المواصف کو خبر ہوگئی کہ مسرور ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو پچپنویں رات

آٹھ سو پچپنویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب زین المواصف کو معلوم ہوا کہ مسرور ہے تو وہ اور اس کی کنیزیں رونے لگیں اس نے کہا اے مسرور، خدا کے لیے لوٹ جا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا شوہر تجھے اور مجھے دیکھ لے۔ یہ سن کر مسرور کو غش آگیا۔ ہوش آیا تو وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے لیکن مسرور برابر روتا ٹھنڈے سانس بھرتا محمل کے ساتھ ساتھ لگا رہا اور وہ سمجھاتی رہی کہ صبح ہونے سے پہلے لوٹ جائیو تاکہ بدنامی نہ ہو۔ مسرور دوبارہ محمل کے پاس جا کر اس سے رخصت ہوا اور دیر تک بے ہوش رہا۔ حواس درست ہوئے تو اس نے دیکھا کہ قافلہ چلا جا رہا ہے، آخر لوٹ کر اس کے گھر پہنچا دیکھا کہ وہاں نہ کچھ سامان باقی ہے نہ کوئی رہنے والا۔ یہ دیکھ کر وہ اتنا رویا کہ اس کے کپڑے بھیگ

گئے، اسے غش آگیا اور قریب تھا کہ اس کی روح بدن سے پرواز کر جائے۔ دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا پھر اٹھا حیران پریشان اپنے گھر گیا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دس دن تک اس کی یہی کیفیت رہی۔

یہ تو مسرور کا حال ہوا، اب زین المواصف کا قصہ سنو۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے شوہر کی چال چل گئی، دس دن تک برابر سفر کرنے کے بعد ایک شہر میں اترے۔ یہاں زین المواصف نے ایک خط لکھ کر اپنی کنیز ہبوب کو دیا اور کہا کہ جس طرح ہو سکے اس خط کو مسرور کے پاس بھیج دے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہودی نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا اور اس کا داؤ ہم پر چل گیا۔ کنیز نے وہ خط مسرور کو بھیج دیا۔ خط مسرور کے پاس پہنچا تو اسے بڑا صدمہ ہوا اور وہ اتنا رویا کہ زمین بھیگ گئی اور اس نے خط کا جواب لکھ کر زین المواصف کو بھیجا۔ جب یہ خط زین المواصف کے پاس پہنچا تو اس نے پڑھا اور پھر اپنی کنیز ہبوب کو دے کر کہا کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیو، لیکن اس کے شوہر کو خبر ہو گئی کہ دونوں آپس میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ وہ زین المواصف اور اس کی کنیزوں کو لے کر بیس دن سفر کرتا رہا۔ ادھر مسرور کا یہ حال تھا کہ نہ اسے رات کو نیند آتی تھی نہ دن کو چین نہ صبر آتا تھا۔ اسی حال میں ایک رات کو جو اس کی پلک ذرا جھپکی تو اس نے خواب میں دیکھا کہ زین المواصف اسی باغ میں آئی ہوئی ہے اور اسے گلے لگا رہی ہے۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی، اپنے پہلو میں اسے ٹٹولنے لگا، اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، دل محبت سے بے چین ہو گیا اور وہ روتا ہوا اس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھر خالی پڑا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا

اس کی تصویر سامنے کھڑی ہے۔ اس کے دل کی آگ اور بھڑک اٹھی غم دوبالا ہو گیا اور وہ غش کھا کر گر پڑا، اور شہر زاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔۔

آٹھ سو چھپنویں رات

آٹھ سو چھپنویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! مسرور کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ مکان کے ایک طرف ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا ہے، اس نے کہا سبحان اللہ کوا تو خالی جگہوں پر بولا کرتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ حسرت سے دیکھنے اور آہیں بھرنے لگا۔ زین المواصف کی ایک بہن تھی جس کا نام نسیم تھا، اس نے مسرور کی یہ حالت جو دیکھی تو تڑپ اٹھی۔ اس کو معلوم تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے کس قدر عشق و محبت ہے۔ وہ کہنے لگی اے مسرور! خدا کے لیے اس گھر میں نہ آیا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی دیکھ لے اور یہ خیال کرے کہ تو میری وجہ سے آتا ہے۔ تیرے ہی سبب سے میری بہن گئی ہے، اب کیا تو چاہتا ہے کہ میں بھی یہاں سے چلتی بنوں؟ تجھے معلوم ہے کہ اگر تو نہ ہوتا تو گھر والے گھر چھوڑ کر نہ جاتے لہٰذا اب دل پر صبر کر لے اور اسے بھول جا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اس کی بہن کی یہ باتیں سن کر مسرور بلک بلک کر رونے لگا اور کہا اے نسیم، اگر مجھے اڑنا آتا ہوتا تو مارے اشتیاق کے میں اڑ کر اس کے پاس چلا جاتا، ایسی حالت میں اسے کیوں کر دل سے بھلا سکتا ہوں! بہن نے کہا کہ تیرے لیے سوا صبر کے کوئی چارا نہیں۔ وہ بولا خدا کے لیے اپنی طرف سے اسے ایک خط بھیج اور اس کا جواب

منگواتا کہ میرے دل کو تسکین ہو اور سینے کی آگ میں ٹھنڈک پڑے۔ اس نے جواب دیا کہ سر آنکھوں سے۔

بہن نے دوات قلم اور کاغذ لیا اور مسرور نے اپنی محبت کی زیادتی اور جدائی کا غم لکھوانا شروع کیا اور کہا یہ خط اس غم ناک عاشق اور غریب بچھڑے ہوے کی طرف سے ہے جسے بالکل چین نہیں آتا، نہ دن میں نہ رات میں بلکہ جو آنسو بہاتا رہتا ہے۔ ان سے اس کے پپوٹے گھائل ہو گئے ہیں، اس کے جگر میں غم کی آگ دہک رہی ہے، رنج والم سہتے سہتے زمانہ ہو گیا ہے۔ اس کی مثال اس چڑیا کی سی ہے جس کا ساتھی کھو گیا ہو اور جس کی تباہی قریب ہو۔ ہائے تیری جدائی اور تجھ سے نہ ملنے کا افسوس۔ میرا جسم لاغر ہو گیا ہے، آنسوؤں کی جھڑی برابر لگی رہتی ہے اور دنیا میرے اوپر تنگ ہے۔ نسیم کو اس کی فصاحت، بلاغت اور معنی خیزی پر تعجب ہوا اس نے خط پر خالص مشک سے مہر لگائی، عنبر سے دھونی دی اور اسے ایک سوداگر کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ اسے سوا میری بہن یا اس کی کنیز ہیوب کے کسی اور کے ہاتھ میں نہ دیجیو۔ جب یہ خط زین المواصف کے پاس پہنچا تو وہ سمجھ گئی کہ مسرور کا لکھوایا ہوا ہے۔ اس نے اسے چوم کر اپنی آنکھوں پر رکھا رونے لگی اور اتنا روئی کہ اسے غش آگیا۔ ہوش آیا تو اس نے دوات قلم اور کاغذ منگوا کر جواب لکھا اور اپنی محبت شوق اور تمنا کا ذکر کیا اور دوست احباب کی جدائی کی شکایت کی اور اپنا رونا رویا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو ستاونویں رات

..... آٹھ سو ستاونویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
زین المواصف نے مسرور کے خط کے جواب میں لکھا کہ یہ خط میرے آقا،
مالک اور مولا کے نام ہے جو میرے ظاہر اور باطن کا مالک ہے۔ معلوم ہو کہ
جاگتے جاگتے میں پریشان ہو گئی ہوں، فکر میں پڑی رہتی ہوں، تیری جدائی
میں مجھے صبر نہیں آتا۔ اے سورج اور چاند سے زیادہ حسین، محبت مجھے
گھلائے ڈالتی ہے اور اشتیاق مارے ڈالتا ہے، اے دنیا کی رونق اور زندگی
کی زینت، جس کی جان نکل رہی ہو اسے جام میں کیا مزا آئے کیوں کہ
نہ اس کا شمار زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ یہ لکھ کر اس نے خط پر
مشک اور عنبر چھڑکا اور اس پر مہر لگا کر ایک سوداگر کو دے دیا اور کہا
کہ سوا میری بہن نسیم کے اور کسی کے ہاتھ میں نہ دیجیو۔ جب یہ خط نسیم
کے پاس پہنچا تو اس نے اسے مسرور کے پاس بھیج دیا۔ مسرور نے خط
کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور اتنا رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔

یہ تو ان لوگوں کا حال ہوا، اب زین المواصف کے شوہر کی داستان
سنو۔ جب اسے معلوم ہوا کہ دونوں میں خط و کتابت ہوتی ہے تو وہ زین المواصف
اور اس کی کنیزوں کو لیے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتا رہا۔ زین المواصف
نے کہا سبحان اللہ تو ہمیں کہاں کہاں اور وطن سے کتنی دور لے جائے گا؟
اس نے جواب دیا، ایک سال کی دوری پر تاکہ تیرے پاس مسرور کے خط
نہ پہنچ سکیں۔ تم لوگوں نے کس طرح میرا مال لے کر مسرور کو دے دیا،
میرا جتنا مال ضائع ہوا ہے وہ سب میں تم سے وصول کروں گا۔ دیکھوں

اب تمھیں مسرور سے کیا فائدہ پہنچتا ہے یا وہ کس طرح تمھیں میرے پنجے سے چھڑا سکتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ایک لہار کے پاس گیا اور لوہے کی تین بیڑیاں بنوا لایا۔ اور ان کے ریشمی کپڑے اتار کر انھیں بالوں کا لباس پہنایا، ان میں گندھک کی دھونی دی اور لہار کو بلا کر کہا کہ ان لڑکیوں کے پانو میں بیڑیاں ڈال دے۔ سب سے پہلے زین المواصف آگے بڑھی، اسے دیکھتے ہی لہار کے ہوش اُڑ گئے، وہ اپنی انگلیاں کاٹنے لگا، اس کی عقل سلب ہو گئی، وہ اس پر عاشق ہو گیا اور یہودی سے پوچھا کہ ان کنیزوں نے کیا جرم کیا؟ اس نے جواب دیا کہ یہ میری لونڈیاں ہیں، انھوں نے میرا مال چرایا تھا اور میرے پاس سے بھاگ گئی تھیں۔ لہار نے کہا خدا تیرا بھلا کرے! واللہ اگر یہ کنیز قاضی القضاۃ کے پاس ہوتی اور ہر روز ایک ہزار جرم کرتی تو بھی وہ اسے سزا نہ دیتا۔ علاوہ اس کے وہ صورت سے چور نہیں معلوم ہوتی اور بیڑیوں کا بوجھ اس سے نہیں اٹھ سکتا۔ اس کے بعد لہار نے اس سے درخواست کی کہ وہ زین المواصف کو بیڑیاں نہ پہنائے اور سفارش پر سفارش کرتا رہا کہ اسے بیڑیاں نہ پہنائی جائیں۔ جب زین المواصف نے لہار کو سفارش کرتے دیکھا تو اس نے یہودی سے کہا خدا کے لیے مجھے اس غیر مرد کے سامنے نہ کر۔ اس نے جواب دیا تو پھر مسرور کے سامنے کس طرح آئی تھی؟ اس کا کچھ جواب اس نے نہ دیا۔

یہودی نے لہار کی سفارش مان لی۔ زین المواصف کے پانو میں ہلکی بیڑیاں ڈلوا دیں اور لونڈیوں کے پانو میں بھاری بیڑیاں۔ زین المواصف نازک بدن تھی اور سخت کپڑے نہیں پہن سکتی تھی۔ اس لیے دن رات بالوں کے کپڑے پہنتے پہنتے اس کا اور اس کی کنیزوں کے جسم کی کھال

چھل گئی اور چہرے اُتر گئے۔ اُدھر لُہار کو زین المواصف سے بے حد عشق ہو گیا۔ وہ گھر جا کر آہیں بھرنے لگا۔ اتفاق سے اُسی وقت قاضی القضاۃ لُہار کے گھر کے پاس سے گزرا اور اس کی آہیں سُن کر اُسے بُلوایا، پوچھا اے لُہار، تو کس عورت کی یاد کر رہا ہے اور تیرا دل کس کی محبت میں گرفتار ہے؟ لُہار نے اُٹھ کر قاضی کا ہاتھ چوما اور کہا خدا ہمارے مولا قاضی کی عمر دراز کرے اور اس میں برکت دے! پھر لُہار نے لڑکی کے حُسن و جمال اور قد و قامت کی تعریف کی اور یہ کہ اس کا چہرہ خوب صورت ہے، کمر پتلی اور کولھے بھاری۔ اس کے بعد اس نے یہ بھی بیان کیا کہ وہ کس خواری کے ساتھ قید اور بیڑیوں کی تکلیف میں مبتلا ہے اور اسے کس قدر کم کھانے کو دیا جاتا ہے۔ قاضی نے کہا اے لُہار! مجھے اس کے پاس لے چل، اس سے ملا تاکہ میں اس کا حق اسے دلاؤں۔ ورنہ کنیز کا گناہ آیندہ تیری گردن پر ہو گا، اگر تو نے اسے مجھ سے نہ ملایا تو قیامت کے دن خدا تجھ سے بدلہ لے گا۔ لُہار نے کہا سر آنکھوں پر اور فوراً زین المواصف کے مکان پر گیا مگر دیکھا کہ دروازہ بند ہے اور کوئی شخص غم گین دل سے رو رہا ہے۔ لُہار کے آنسو مینھ کی طرح برسنے لگے۔ اس نے دستک دی۔ لڑکیوں نے کہا کہ دروازے پر کون ہے؟ اس نے جواب دیا، میں ہوں لُہار، قاضی تم لوگوں کو اپنے پاس بُلاتا ہے تاکہ اس کے آگے مقدمہ پیش ہو اور تمھارے ساتھ انصاف کیا جائے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔۔۔

آٹھ سو اٹھاونویں رات

آٹھ سو اٹھاونویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، جب لُہار نے کہا کہ تمھیں قاضی بُلاتا ہے تو زین المواصف بولی کہ ہم کیوں کر اس کے پاس جا سکتے ہیں۔ دروازہ بند ہے، ہمارے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور کُنجیاں یہودی کے پاس ہیں۔ لُہار نے کہا کہ میں ابھی کُنجیاں بناکر قفل کھولے دیتا ہوں اور تمھاری بیڑیاں بھی اُتار دوں گا۔ اس نے کہا کہ قاضی کا گھر ہمیں کون بتائے گا؟ لُہار بولا کہ میں اس کا پتا بتادوں گا۔ زین المواصف نے کہا ہم قاضی کے پاس کس طرح جا سکتے ہیں ہمارے کپڑے تو بالوں کے ہیں اور ان میں گندھک بسی ہوئی ہے۔ لُہار نے کہا کہ قاضی اس کا بُرا نہ مانے گا کہ تم اس حالت میں ہو۔ اب لُہار نے فوراً قفلوں کی کُنجیاں بنائیں، دروازہ کھول کر اندر گیا، ان کی بیڑیاں اُتار دیں اور انھیں باہر لاکر قاضی کے گھر کا پتا بتا دیا۔ ہبوب نے اپنی آقا کے کپڑے اُتار ڈالے جو بالوں کے تھے اسے حمام لے گئی اور نہلا دُھلا کر ریشمی کپڑے پہنائے جس سے اُس کے چہرے میں رنگ و روپ آگیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا شوہر کسی تاجر کے ہاں دعوت کھانے گیا ہوا تھا اس لیے وہ خوب بن ٹھن کر قاضی کے گھر پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی قاضی کھڑا ہو گیا اور اُس نے اس شیریں کلامی اور میٹھے الفاظ میں قاضی کو سلام کیا کہ قاضی کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ لڑکی بولی خدا ہمارے مولا قاضی کو سلامت رکھے اور اس کے ذریعے سے فریادیوں کی مدد کرے! اس کے بعد اس نے لُہار کا قصہ سُنایا اور اس کا شریفانہ برتاؤ

بتایا اور اس تکلیف کا ذکر کیا جو یہودی نے اسے پہنچائی تھی اور کہا کہ اس نے ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور کوئی ہمیں چھڑانے والا نہ ملا۔

قاضی نے پوچھا اے لڑکی! تیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا میرا نام زین المواصف اور میری کنیز کا نام ہبوب ہے۔ قاضی بولا تو اسم بامسمّٰی ہے۔ لڑکی نے مسکرا کر اپنا منھ چھپا لیا۔ قاضی نے کہا اے زین المواصف، تیرا شوہر ہے یا نہیں؟ اس نے جواب دیا میرا کوئی شوہر نہیں۔ قاضی نے پوچھا تیرا مذہب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا میرا دین اسلام ہے اور میں خیرالانام کی ملت میں سے ہوں۔ قاضی نے کہا کہ شریعت کی قسم کھا کہ تو رسول اللہ کی ملت میں سے ہے۔ لڑکی نے قسم کھائی اور شہادت کا کلمہ پڑھا۔ قاضی بولا پھر تو اپنی جوانی اس یہودی کے ساتھ کیوں برباد کر رہی ہے؟ اس نے کہا اے قاضی، سُن، مرتے وقت میرے باپ نے پندرہ ہزار دینار ترکے میں چھوڑے اور وہ سب اس یہودی کے حوالے کر دیے تاکہ وہ ان سے تجارت کرے اور نفع میرے اور اس کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہو مگر پونجی شرع کی بنا پر محفوظ رہے۔ جب میرا باپ مر گیا تو یہودی کا جی میرے لیے للچانے لگا اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ میری شادی اس کے ساتھ کر دے۔ میری ماں نے جواب دیا کہ وہ مجھے میرا دین چھڑا کر کس طرح یہودی بنا سکتی ہے! خدا کی قسم میں حکومت میں تیری شکایت کر دوں گی۔ یہ سُن کر یہودی ڈرا اور سارا مال لے کر عدن بھاگ آیا۔ جب ہم نے سُنا کہ وہ عدن چلا گیا ہے تو ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے عدن پہنچے اس سے ملے تو اس نے کہا کہ وہ تجارت اور خرید و فروخت کرتا ہے۔

ہمیں اس کی باتوں کا یقین آگیا۔ اسی طرح وہ ہمیں برابر دھوکا دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے ہمیں قید کردیا اور بیڑیاں ڈال کر ہمیں طرح طرح کی تکلیف پہنچائی۔ ہم یہاں پردیسی ہیں اور سوا خدا اور ہمارے آقا قاضی کے ہمارا کوئی مددگار نہیں۔

یہ قصہ سن کر قاضی نے اس کی کنیز ہبوب سے پوچھا کہ کیا یہ واقعی تیری آقا ہے اور تم لوگ پردیسی ہو اور اس کا کوئی شوہر نہیں؟ وہ بولی ہاں۔ قاضی نے کہا کہ میری شادی اس کے ساتھ کردے اور اگر میں اس کتے کو سزا دے کر تمھارا حق اس سے نہ دلا دوں تو اس کا کفارہ غلام آزاد کرنا، روزہ، حج اور صدقہ ہوگا۔ ہبوب نے کہا تیرا حکم سر آنکھوں پر۔ قاضی نے کہا جا اور مطمئن ہو بیٹھ اور اپنی آقا کو بھی تسلی دے، اگر خدا نے چاہا تو میں کل اس کافر کو بلا کر تمھارا حق تم کو دلا دوں گا اور اسے اتنی سزا دوں گا کہ تم کو تعجب ہوگا۔ لڑکی نے دعا دی اور اسے اپنی محبت میں گرفتار چھوڑ کر چل دی۔ ہبوب اور اس کی آقا قاضی کے گھر سے روانہ ہوگئیں تو انھوں نے لوگوں سے دوسرے قاضی کا پتا پوچھا، اس کا پتا معلوم ہوگیا تو دونوں وہاں پہنچیں اور اس سے بھی وہی باتیں بیان کیں۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے قاضی کے پاس گئیں یہاں تک کہ چاروں سے وہی شکایت کر آئیں۔ ہر قاضی اس سے شادی کی درخواست کرتا اور وہ ہامی بھر دیتی۔ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہوتی اور ان میں سے ہر ایک کا دل لڑکی کے لیے للچاتا۔ یہودی کو ان باتوں کی بالکل اطلاع نہ تھی کیونکہ وہ دعوت میں تھا۔ دوسرے دن صبح کو کنیز نے زین المواصف کو بہترین کپڑے پہنائے اور اسے محکمے میں لے گئی جہاں چاروں قاضی بیٹھے تھے۔

قاضیوں کو دیکھتے ہی لڑکی نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی اور انھیں سلام کیا۔ چاروں نے سلام کا جواب دیا اور اسے پہچان گئے۔ ایک ان میں سے لکھنے میں مشغول تھا، اس کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ ایک باتیں کر رہا تھا، وہ ہکلانے لگا۔ ایک کچھ حساب لگا رہا تھا، اس نے جوڑنے گھٹانے میں غلطی کر دی۔ سب نے لڑکی سے کہا ای خوب صورت اور خوش سیرت، تیرے آگے اب خوشی ہی خوشی ہے، اب ہم تیرا حق ضرور دلوائیں گے اور تیری مُراد پوری ہو جائے گی۔ لڑکی انھیں دُعا دے کر رخصت ہو گئی، اور شہر زاد کو صبح ہو تی۔ . . . . .

آٹھ سو اُنسٹھویں رات

آٹھ سو انسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! لڑکی قاضیوں کو دُعا دے کر رخصت ہو گئی۔ اِدھر یہ لگاوٹ بازیاں ہو رہی تھیں اور اُدھر یہودی ان باتوں سے بے خبر اپنے دوستوں کے ساتھ دعوت میں مشغول تھا۔ ساتھ ہی زین المواصف نے دربار کے حاکموں اور کاتبوں سے بھی درخواست کی کہ وہ اس مردود کافر کے مقابلے میں اس کی مدد کریں اور اسے اس بے پناہ عذاب سے چھٹکارا دیں۔ س کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس میں شروع سے لے کر آخر تک وہ تمام حرکتیں بیان کیں جو یہودی نے اس کے ساتھ کی تھیں اور اپنے سلمان ہونے کا بھی ذکر کیا۔ خط بند کر کے اپنی کنیز ہبوب کو دے دیا ور کہا کہ اسے حفاظت سے اپنی جیب میں رکھیو میں اسے مسرور کو بھیجوں گی۔

اتنے میں یہودی آیا اور انھیں نہایت خوش دیکھ کر کہنے لگا تم اس قدر خوش کیوں ہو؟ زین المواصف نے کہا تیرے پنجے سے ہمیں سوا خدا کے اور کوئی نہیں چھڑا سکتا، وہی ہمیں تیرے ظلم سے نجات دے گا۔ اگر تو نے ہمیں ہمارے وطن نہ پہنچا دیا تو ہم کل تیری شکایت شہر کے حاکم اور قاضی کے سامنے کریں گے۔ یہودی نے پوچھا کہ تمھارے پانو میں سے بیڑیاں کس نے اُتاریں؟ اب میں تم میں سے ہر ایک کے لیے دس دس رطل کی بیڑیاں بنوا کر تمھیں شہر کے گرد پھراؤں گا۔ ہبوب بولی جو کنواں تو نے ہمارے لیے کھود رہا ہے خدا نے چاہا تو تو خود اس میں گرے گا۔ تو نے وطن سے ہمیں بے وطن کیا ہے کل ہمارا اور تیرا فیصلہ شہر کے حاکم کے سامنے ہوگا۔ رات پھر اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں، صبح ہوتے ہی یہودی لہار کے پاس گیا کہ ان کے لیے بیڑیاں بنوائے۔ اِدھر زین المواصف اور اس کی کنیزیں قاضی کے محکمے میں پہنچیں۔ زین المواصف نے قاضیوں کو دیکھتے ہی سلام کیا سب نے سلام کا جواب دیا۔ قاضی القضاۃ نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے کہا کہ یہ لڑکی زہرہ کی طرح ہے، جو اسے دیکھتا ہے عاشق ہو جاتا ہے اور اس کی خوب صورتی کے آگے گردن جھکا لیتا ہے۔ اس کے بعد قاضی نے لڑکی کے ہمراہ چار پیادے بھیجے جو بڑے عہدے کے تھے اور ان سے کہا کہ مجرم کو بری طرح سے پکڑ کر لے آؤ۔

یہ تو ان کا ماجرا ہوا، اب یہودی کا حال سنو۔ جب وہ ان کے لیے بیڑیاں بنوا کر گھر لوٹا تو دیکھا کہ وہ غائب ہیں، حیران و پریشان ہو گیا۔ اتنے میں پیادے آ پہنچے اور انھوں نے پہلے تو اسے پکڑ کر خوب مارا پھر منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے قاضی کے پاس لے گئے۔ قاضی نے اُسے

دیکھتے ہی چلّا کر کہا: ای مردود، خدا کے دشمن، تیری یہ ہمت ہوئی کہ تو نے ایسے ایسے کام کیے اور وطن سے بے وطن کر دیا۔ ان کا مال چھڑا لیا اور اب چاہتا ہو کہ وہ یہودی ہو جائیں، تو مسلمانوں کو کافر بنانا چاہتا ہی؟ یہودی بولا: ای میرے مولا، یہ میری بیوی ہی۔ اس کی یہ بات سُن کر سارے قاضی اسے ڈانٹنے لگے اور کہا اس کتّے کو زمین پر دے پٹکو، اس کے منھ پر جوتیاں مارو اور جتنا پیٹا جائے اسے خوب پیٹو کیوں کہ اس کا گناہ معافی کے قابل نہیں۔ لوگوں نے اس کے ریشمی کپڑے اُتار کر بالوں کا لباس پہنایا، اسے زمین پر پٹک کر اس کی ڈاڑھی نوچنے اور اس کے منھ پر جوتیاں مارنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اسے اُلٹے گدھے پر سوار کیا، گدھے کی دُم اس کے ہاتھ میں دے کر سارے شہر کا چکّر لگایا اور ڈھنڈورا پیٹ کر نہایت ذلّت کے ساتھ اُسے پھر قاضی کے گھر لائے۔ چاروں قاضیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے ہاتھ پانو کاٹ کر اسے سولی چڑھا دیا جائے۔ یہ فیصلہ سُن کر وہ ملعون گھبرا گیا اس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور اس نے کہا ای بزرگ قاضیو! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ کہ یہ میری بیوی نہیں ہی، میرا تمام مال اس کا مال ہی، میں نے اس پر ظلم کیا ہو اور اسے وطن سے بے وطن کیا ہی۔ یہودی نے اس کا اقرار کر لیا اور انھوں نے اس اقرار کو ایک دستاویز میں درج کر لیا اور اس کا سارا مال لے کر زین المواصف کو مع دستاویز کے دے دیا اور وہ لے کر چلتی ہوئی۔ جو اسے دیکھتا اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو جاتا اور ہر قاضی یہی سمجھتا کہ بس اب وہ میرے قبضے میں آگئی۔ گھر پہنچ کر اس نے سارے سامان میں سے جس جس کی ضرورت تھی باندھا۔

دن ختم ہونے کا انتظار کیا اور تمام وہ چیزیں جو ہلکی اور قیمتی تھیں لے کر رات کے اندھیرے میں اپنی کنیزوں کے ساتھ روانہ ہو گئی اور تین رات تین دن برابر چلتی رہی۔ اُدھر قاضیوں نے یہودی کو قید خانے میں ڈال دیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی......

آٹھ سو ساٹھویں رات

آٹھ سو ساٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! قاضیوں نے یہودی کو جو زین المواصف کا شوہر تھا قید خانے میں ڈال دیا۔ صبح ہوئی تو قاضی اور گواہ سب اس انتظار میں رہے کہ زین المواصف ان کے پاس آتی ہو گی لیکن وہ کسی کے پاس بھی نہ آئی۔ اس کے بعد وہ قاضی جس کے پاس لڑکی سب سے پہلے گئی تھی یہ کہہ کر کہ مجھے شہر میں آج کچھ کام ہے اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور غلام کو ساتھ لے کر شہر کے گلی کوچوں میں پھرنے اور زین المواصف کو ڈھونڈنے لگا لیکن کہیں اس کا پتا نہ چلا۔ وہ چکر لگا ہی رہا تھا کہ دیکھا باقی تین قاضی بھی اسی طرح پھر رہے ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تم خچروں پر سوار شہر کے بازار میں کیوں پھر رہے ہو؟ جب انھوں نے اپنا قصہ سنایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہیں جس میں وہ گرفتار ہے۔ وہ بھی اسی کی تلاش میں ہیں جسے وہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ اب چاروں نے مل کر لڑکی کو ڈھونڈنا شروع کیا لیکن کہیں سراغ نہ چلا۔ آخر سب کے سب واپس اپنے اپنے گھر چلے اور بیمار ہو کر بچھونے پر لیٹ گئے قاضی القضاۃ کو بڑے بڑے لُہار کا خیال آیا اور اسے بُلوا کر پوچھنے لگا اے

لُہار! بتا تجھے اُس لڑکی کا کچھ پتا ہے جسے تو ہمارے پاس لایا تھا؟ اگر تو ہمیں اس کا پتا نہ دے گا تو میں تیرے کوڑے ماروں گا۔ لُہار نے کہا اے میرے مولا، خُدا کی قسم جب سے میں تیرے پاس سے آیا ہوں میں نے اسے بالکل نہیں دیکھا۔ میرا دل اُسی میں لگا ہوا ہے، میں اس کے گھر بھی گیا وہ وہاں بھی نہ ملی نہ کوئی اور جو اس کا پتا بتا سکے۔ یا تو وہ غوطہ مار کر سمندر کی تھاہ میں چلی گئی ہے یا آسمان پر چڑھ گئی ہے۔ یہ سُن کر قاضی نے اتنے زور سے چیخ ماری کہ قریب تھا کہ اس کی رُوح نکل جائے اور وہ کہنے لگا واللہ۔ مجھے اس کی پروا نہیں اُدھر لُہار وہاں سے رخصت ہوا اور اِدھر قاضی بچھونے پر لیٹ گیا اور لڑکی کے عشق میں بیمار پڑ گیا۔ یہی حالت باقی تینوں قاضیوں اور گواہوں کی بھی ہوئی۔ حکیم برابر ان کا علاج کرتے تھے مگر ان کی بیماری ایسی تھی جس کا علاج حکیموں کے بس کا نہ تھا۔ اس کے بعد بڑے بڑے لوگ پہلے قاضی کی عیادت کے لیے گئے اور مزاج پُرسی کی۔ قاضی نے اپنا دل کھول کر اُن کے آگے رکھ دیا، رونے اور ٹھنڈے سانس بھرنے لگا اور پھر زور سے ایک چیخ ماری اور اس کی رُوح بدن سے پرواز کر گئی۔ لوگوں نے اُسے غسل دے کر کفن پہنایا اور جنازے کی نماز پڑھا کر دفن کر آئے اور اس کے لیے دُعا کر کے دُوسرے قاضی کے پاس پہنچے، ایک حکیم کو اپنے ساتھ لیتے گئے انھوں نے دیکھا کہ اسے بھی کوئی بیماری نہیں جس کے لیے کسی حکیم کی ضرورت ہو۔ لوگوں نے اس کی مزاج پُرسی کی اور اس نے انھیں سارا ماجرا سنا دیا۔ جب لوگوں نے اسے لعنت ملامت کی تو اس نے ایک چیخ ماری اور اس کی رُوح جسم سے پرواز کر گئی اور لوگ اس کی تجہیز و تکفین کر کے اسے بھی دفن کر آئے اور اس کے لیے دُعا کی۔ پھر تیسرے قاضی

کے پاس گئے، دیکھا کہ وہ بھی بیمار ہے اس کا بھی وہی حال تھا جو دوسروں کا۔ یہی قصہ چوتھے قاضی کے ساتھ بھی پیش آیا اور چاروں کے چاروں اُسی کی محبت کے شکار نکلے اور اسی طرح تمام گواہ بھی۔ غرض کہ جس جس نے اُسے دیکھا تھا سب نے اس کی محبت میں جان دے دی اور جو نہ مرا وہ اس کی محبت کی آگ میں جلتا رہا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی ......

آٹھ سو اکسٹھویں رات

آٹھ سو اکسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جو نہ مرا وہ اس کی محبت کی آگ میں جلتا رہا، خدا اُن سب پر رحم کرے! اُدھر زین المواصف کئی روز تک تیز تیز چلتی رہی یہاں تک کہ دور پہنچ گئی۔ اتفاقاً اس کا گزر ایک دیر پر ہوا جہاں ایک بہت بڑا راہب رہتا تھا۔ اس کا نام دانس تھا اور اس کے نیچے چالیس بطریق تھے۔ راہب نے دیکھا کہ زین المواصف اتنی حسین ہے تو وہ نکل کر اس کے پاس آیا اُسے دعوت دی اور کہا کہ ہمارے ہاں اُتر کر دس دن تک آرام کر لو پھر آگے چلنا۔ لڑکی اور اس کی کنیزیں خانقاہ میں ٹھہر گئیں۔ اسے دیکھ کر راہب کے ایمان میں خلل آگیا اور اسے پرچانے کے لیے اس نے بطریقوں کو ایک ایک کر کے اس کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ جو بطریق اس کے پاس جاتا وہ اس کی محبت کے جال میں پھنس جاتا اور اسے پھسلاتا لیکن وہ ان کے آگے عذر پیش کرتی اور انہیں منع کرتی۔ اسی طرح دانس نے ایک ایک کر کے چالیسوں کو بھیجا جو اسے دیکھتا لٹو ہو جاتا اس کی بڑی آؤ بھگت کرتا اور اسے پھسلاتا، دانس کا

نام تک نہ لیتا، وہ انھیں اس فعل سے روکتی اور سخت جواب دیتی۔ جب دانش کو بالکل صبر نہ رہا اور اس کی محبت کی آگ بھڑکنے لگی تو اس نے اپنے دل میں کہا، کیا خوب مثل ہے کہ میرے بدن کو میرے ناخنوں سے بہتر کوئی کھجا نہیں سکتا، میری مراد کو سوا میرے اور کوئی پورا نہیں کر سکتا! یہ کہہ کر وہ اٹھا نفیس کھانا تیار کر کے لڑکی کے پاس لایا اور کہا کہ بسم اللہ، نوش کر، بہترین کھانا وہی ہے جو نصیب ہو۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اپنی کنیزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ وہ کھا چکی تو راہب نے اپنے عشق کا اظہار کیا، زین المواصف نے کہا خام خیالات کو اپنے دل سے نکال ڈال۔ راہب اپنی خانقاہ میں جا کر سوچ میں پڑ گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، اور رات بڑی طرح سے گزری۔ رات بالکل اندھیری ہو گئی تو زین المواصف اٹھی اور اس نے کنیزوں سے کہا کہ چلو، چالیس رہبانوں کے مقابلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے، سب کے سب مجھے پھسلانا چاہتے ہیں۔ کنیزیں بولیں کہ سر آنکھوں پر اور اپنے خچروں پر سوار ہو کر دیر کے دروازے سے نکل کھڑی ہوئیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔۔۔۔۔۔

آٹھ سو باسٹھویں رات

آٹھ سو باسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! زین المواصف اور اس کی کنیزیں چلی جا رہی تھیں کہ انھیں ایک قافلہ دکھائی دیا، قافلے کے قریب پہنچیں تو معلوم ہوا کہ وہ عدن سے آ رہا ہے

یہاں وہ خود تھی اور اس نے سُنا کہ لوگ زین المواصف کا ذکر کر رہے ہیں کہ
قاضیوں اور گواہوں نے اس کی محبت میں جان دے دی اور شہر والوں نے
دوسرے قاضی اور گواہ مقرر کر لیے اور زین المواصف کے شوہر کو قید خانے
سے چھوڑ دیا۔ یہ سُن کر زین المواصف نے اپنی کنیزوں سے کہا سنتی ہو یہ باتیں؟
ہبوب نے کہا اگر راہب جن کے مذہب میں عورتوں سے کنارہ کشی ہے
تیری محبت کے شکار ہو گئے تو قاضی تو معافی کے قابل ہیں کیوں کہ ان کا
عقیدہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ بہر حال چپکے سے وطن چلی چل
کیوں کہ اب تک ہمارا حال کسی کو معلوم نہیں۔ یہ کہہ کر وہ اور زیادہ تیزی
سے سفر کرنے لگیں۔

یہ تو زین المواصف اور اس کی کنیزوں کا قصہ ہوا۔ اب راہبوں کا حال
سنو۔ صبح ہوئی اور وہ زین المواصف کو سلام کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے
دیکھا کہ مکان خالی پڑا ہے ان کا دل بیٹھ گیا۔ پہلے راہب نے اپنے کپڑے
پھاڑ ڈالے اور اس کی محبت میں رونے لگا۔ یہی حال باقی بطریقوں اور
راہبوں کا بھی تھا، وہ سب کے سب دور رہے تھے۔ ان کا شیخ دانس کی کیفیت
سب سے بدتر تھی۔ جب وہ سب مایوس ہو گئے تو انھوں نے مل کر یہ فیصلہ
کیا کہ اس کی تصویر بنا کر اپنے پاس رکھیں۔ اس پر سب نے اتفاق کیا یہاں تک
کہ مزوں کو کرکرا کرنے والی موت آ پہنچی۔

یہ تو خانقاہ کے رہبانوں کا قصہ ہوا، اب زین المواصف کا ماجرا سنو۔
وہ برابر اپنے محبوب مسرور کی طرف سفر کرتی رہی، چلتے چلتے آخر اپنے گھر
پہنچ گئی اور گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ پھر اس نے اپنی بہن
نسیم کو بُلا بھیجا۔ نسیم بہت خوش ہوئی اس کے لیے فرش اور نفیس کپڑے

لائی اور مکان کو عود، عنبر اور مشک سے اس قدر بسایا کہ وہ مہک اٹھا بغرض کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے بعد زین المواصف نے بہترین لباس پہنا اور خوب بناؤ سنگار کیا۔ ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اُدھر مسرور کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ آگئی ہے بلکہ وہ بے حد رنج و غم میں مبتلا تھا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ....

آٹھ سو تریسٹھویں رات

آٹھ سو تریسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! مسرور کو اس کے آنے کی خبر تک نہ تھی وہ رنج و غم میں مبتلا تھا۔ زین المواصف اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی ان کنیزوں سے باتیں کرنے لگی جو سفر میں اس کے ساتھ نہ تھیں۔ پھر اس نے ہبوب کو چند درہم دے کر کہا کہ جا کر میرے اور کنیزوں کے لیے کھانے کی چیزیں خرید لا۔ ہبوب جا کر وہ تمام چیزیں کھانے پینے کی لے آئی جو اس نے کہی تھیں۔ سب کھا پی چکیں تو زین المواصف نے ہبوب سے کہا، اب جا کر دیکھ کہ مسرور کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔ مسرور کی یہ حالت تھی کہ نہ اسے چین آتا تھا نہ صبر۔ جب اس کا شوق زور پکڑتا تو وہ زین المواصف کے گھر جا کر دیوار کو بوسے دیتا۔ اس وقت بھی وہ اسی کے گھر سے ہو کر آیا تھا۔ مایوسی کے عالم میں روتے روتے اُسے نیند آگئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ زین المواصف اپنے گھر لوٹ کر آگئی ہے، وہ روتا ہوا اُٹھ کر زین المواصف کے گھر کی طرف چل دیا اس کی گلی میں پہنچا تو اسے خوشبوئیں آنے لگیں اور اس کا دل محبت سے اور بے چین ہو گیا۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ ہیوب کسی کام کے لیے جا رہی ہے اور ابھی گلی سے نکلی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ ہیوب کی نظر اس پر پڑی تو اس نے قریب آکر سلام کیا، زین المواصف کے آنے کی خوش خبری دی اور کہا کہ اس نے مجھے تیری تلاش میں بھیجا ہے۔ مسرور یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہیوب اسے لے کر اپنی آقا کے پاس گئی۔ مسرور کو دیکھتے ہی زین المواصف اپنے تخت سے اتر پڑی اور اسے چومنے لگی وہ اُسے چومنے لگا اور دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے اور اتنی دیر تک بوسے دیتے اور گلے ملتے رہے کہ انھیں غش آگیا۔ جب انھیں ہوش آیا تو زین المواصف نے اپنی کنیز ہیوب سے کہا کہ ایک کوزے میں شکر کا اور ایک میں نیبو کا شربت لے آئے۔ کنیز لے آئی اور انھوں نے کھایا پیا۔ کھاتے پیتے انھیں رات ہو گئی پھر دونوں نے اپنی اپنی داستانیں شروع سے لے کر آخر تک سنائیں۔ لڑکی نے اس سے کہا کہ میں اسلام لے آئی ہوں۔ اس پر مسرور کو بڑی خوشی ہوئی وہ بھی مسلمان ہو گیا اور کنیزیں بھی۔ سب نے مل کر خدا کے آگے توبہ کی۔ صبح ہوئی تو اس نے قاضی اور گواہوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ میں بیوہ ہوں، عدت پوری ہو چکی ہے اور میں مسرور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے اس کا نکاح نامہ لکھ دیا اور وہ نہایت عیش و عشرت سے رہنے لگے۔

یہ تو زین المواصف اور مسرور کا قصہ ہوا، اب اس کے شوہر یہودی کا ماجرا سنو۔ جب شہر والوں نے اسے قید سے رہا کر دیا تو وہ وہاں سے اپنے وطن کی طرف چل دیا اور چلتے چلتے اتنے قریب پہنچ گیا کہ محض تین دن کی راہ اور باقی رہ گئی، زین المواصف کو اس کی خبر ملی تو اس نے

اپنی کنیز ہبوب کو بُلا کر کہا کہ یہودیوں کے قبرستان میں جا کر ایک قبر کھدوا اور اس پر پھول رکھ کر اس کے آس پاس پانی چھڑکوا دے۔ یہودی آئے اور میرے بارے میں دریافت کرے تو کہیو کہ میری آقا تجھ سے اتنی ناراض تھی کہ مرگئی اور اُسے مرے بیس دن ہو چکے ہیں۔ اگر وہ کہے کہ چل کر اس کی قبر دکھا تو اسے اسی قبر کے پاس لے آئیو اور کسی چال سے اُسے زندہ دفن کر دیجیو۔ کنیز نے کہا بسر و چشم۔ اس کے بعد تمام فرش اٹھا دیا گیا اور زین المواصف محل میں بیٹھ کر مسرور کے گھر چلی گئی۔ دونوں کھانے پینے میں مشغول ہو گئے اور تین دن تک برابر ان کا یہی شغل رہا۔

یہ تو ان لوگوں کا ماجرا ہوا، اب یہودی کا حال سنو۔ جب وہ سفر سے لوٹ کر گھر پہنچا تو اس نے دروازہ کھڑکھڑایا۔ ہبوب نے اندر سے پوچھا کہ دروازے پر کون ہے؟ اس نے جواب دیا تیرا آقا۔ ہبوب نے آکر دروازہ کھولا۔ یہودی نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں، پوچھا کہ تو کیوں رو رہی ہے اور تیری آقا کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ وہ تیرے اوپر اتنی ناراض تھی کہ مرگئی۔ یہ سن کر اُسے سخت حیرت ہوئی وہ بلک بلک کر رونے لگا اور کہا اے ہبوب، اس کی قبر کہاں ہے؟ ہبوب اسے لے کر قبرستان گئی اور وہ قبر دکھائی جو اس نے کھدوائی تھی۔ اب وہ اور زیادہ رونے پیٹنے اور واویلا کرنے لگا اور غش کھا کر گر پڑا۔ اسی غشی کی حالت میں ہبوب نے اسے کھینچ کر زندہ قبر میں ڈال دیا۔ قبر پاٹ کر اپنی آقا کے پاس گئی اور اس سے سارا ماجرا بیان کیا۔ آقا یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور دونوں کھانے پینے اور لہو و لعب میں عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگے

یہاں تک کہ مزوں کو کرکرا اور صحبتوں کو درہم برہم کرنے والی اور لڑکوں لڑکیوں کو مارنے والی موت آپہنچی۔

علی نورالدین اور مریم زنّاریہ کی کہانی

پرانے زمانے میں مصر میں ایک تاجر تاج الدین رہتا تھا۔ بہت بڑے تاجر ہونے کے علاوہ اس کی شرافت کی بھی بڑی دھوم تھی۔ اسے شوق تھا کہ ہر ملک کا سفر کرے اور درہم ودینار کی خواہش میں جنگل بیابان، میدان، پہاڑ اور سمندر کے جزیرے چھانتا پھرے۔ اس کے پاس بہت سے غلام نوکر چاکر اور کنیزیں تھیں سفر میں اس نے اتنی تکلیفیں اور خطرے اٹھائے تھے کہ جن سے بچے بوڑھے ہوجائیں۔ وہ اپنے زمانے کے تمام تاجروں سے زیادہ مال دار اور خوش گفتار تھا۔ اس کے پاس بہت سے گھوڑے، خچر، اونٹ، اونٹنیاں، سامان، مال اور لاجواب کپڑے تھے۔ مثلاً حمص کی ململ، بعلبک کا زربفت، سندس کی روئی کے کپڑے، مرو کے تھان، بغداد کی جالی، مغرب کی شالیں، ترکی غلام، حبشی نوکر چاکر، رومی کنیزیں اور مصری لڑکے۔ اس کا تجارتی سامان ریشم کے گٹھوں میں باندھا جاتا تھا کیوں کہ اس کی دولت مندی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

اس تاجر کا علی نورالدین نام ایک بیٹا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند حسین وجمیل خوش قامت اور سڈول۔ ایک روز یہ لڑکا اپنے باپ کی دکان پر بیٹھا ہوا دستور کے مطابق خرید وفروخت اور لین دین کر رہا تھا، دوسرے تاجرزادے اس کے سامنے ایسے معلوم ہوتے

تھے جیسے چاند کے آگے تارے۔ تاجرزادوں نے اُسے دعوت دی اور کہا
اے ہمارے آقا نورالدین، ہم چاہتے ہیں کہ آج فلاں باغ میں چل کر سیر
کریں۔ اس نے جواب دیا پہلے میں اپنے باپ سے اجازت لے لوں کیوں کہ
اس کی بے اجازت میں نہیں جا سکتا۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اس کا
باپ آگیا اور اس نے کہا اے ابا جان، تاجرزادے مجھے فلاں باغ
میں سیر و تفریح کے لیے دعوت دیتے ہیں، کیا میں جا سکتا ہوں؟ باپ
نے کہا ہاں بیٹا۔ اس کے بعد اس نے بیٹے کو کچھ دام دیے اور کہا کہ
ان کے ساتھ جا۔ تاجرزادے گدھوں اور خچروں پر سوار ہو گئے اور
نورالدین بھی ایک خچر پر بیٹھ گیا اور ان کے ساتھ ایک ایسے باغ
میں پہنچا جہاں دماغ اور آنکھوں کی لذت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔
اُس کے ستون مضبوط اور عمارت بلند تھی، اس کا ایک دروازہ محراب دار
تھا گویا وہ ایک محل سرا تھی اور ایک دروازہ آسمانی رنگ کا، گویا وہ جنت
کے دروازے تھے اور اس کے دربان کا نام رضوان تھا۔ اس کے اوپر
طرح طرح کے انگور تھے، بعض مرجان کی طرح لال، بعض حبشیوں کی
ناکوں کی طرح کالے اور بعض کبوتر کے انڈوں کی طرح سفید۔ باغ میں
ناشپاتیاں، انار، امرود، شفتالو اور سیب تھے۔ یہ سارے میوے مختلف
رنگ کے تھے بعض خوشوں میں اور بعض اکیلے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی...

آٹھ سو چونسٹھویں رات

آٹھ سو چونسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!

جب سوداگر زادے باغ کے اندر گئے تو انھیں رنگ رنگ کے انگور دکھائی دیے۔ چلتے چلتے وہ ایک برساتی کے پاس پہنچے دیکھا کہ باغ کا رکھوالا رضوان اس میں بیٹھا ہوا ہے، گویا وہ واقعی جنت کا دربان رضوان ہے۔ اس باغ میں طرح طرح کے میوے، اور رنگ بہ رنگ کی چڑیاں تھیں۔ مثلاً فاختہ، بُلبل، تیتر، قمری، کبوتر جو ٹہنیوں پر گا رہی تھیں، نہروں میں پانی بہ رہا تھا اور ان کے اِرد گرد پھول اور پھل لدے پڑے تھے۔ ہر میوہ شاداب، انار جیسے قیروانی گیند۔ سیب میٹھے اور خوش بو دار، واما نی، شفتالو بادامی، کافوری جیلانی اور عنتابی، بیر اور شاہ دانے، انگور جو بیماروں کو شفا دیں اور سر کے چکّر اور صفرے کو دور کریں، لال اور ہرے انجیر جنھیں دیکھ کر عقل دنگ ہو جائے۔ علاوہ بریں اس باغ میں طوری، حلبی اور رومی امرود تھے طرح طرح کے اور رنگ بہ رنگ، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔۔

آٹھ سو پینسٹھویں رات

آٹھ سو پینسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!

جب سوداگر زادے باغ میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں طوری، حلبی اور رومی امرود ہیں، بعض زرد، بعض ہرے، سلطانی شفتالو، کچھ زعفرانی، کچھ لال، ہرے بادام بہت میٹھے اور ایسے جیسے گرم کلّے، اس کی گری تین تین غلافوں کے اندر، خدا کی صنعت، طرح طرح کے بیر گچھوں میں اور الگ الگ، نارنگیاں خولنجاں کی طرح، لیمو جن کا رنگ سونے کی طرح جو ڈالیوں میں جھولتے تھے، کھٹ مٹھے ٹہنیوں سے لٹکے ہوئے گویا غزالوں کی سی

کنواری لڑکیوں کے سینے۔ غرض کہ اس باغ میں ہر طرح کے میوے، خوش بودار بوٹیاں، سبزیاں اور پھول تھے، مثلاً چنبیلی، مہندی، مرچ، عنبری سنبل، طرح طرح کے گلاب اور کیلے۔ یہ باغ بے تشبیہہ جنّت کا ایک ٹکڑا تھا۔ اگر اس میں کوئی بیمار بھی داخل ہو جائے تو تیوری چڑھائے ہوئے شیر کی طرح نکلے، اس کی تعریف سے زبان قاصر تھی، اس میں اتنی عجیب و غریب چیزیں تھیں جو سوائے جنّت کے اور کہیں پائی نہیں جاتیں۔ اس کے دربان کا نام رضوان تھا۔ اگرچہ دونوں رضوانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سیر و تفریح کرنے کے بعد سوداگرزادے آکر ایک چبوترے پر بیٹھ گئے اور نورالدین کو بارہ دری کے بیچ میں بٹھایا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . .

آٹھ سو چھیاسٹھویں رات

آٹھ سو چھیاسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، سوداگرزادوں نے نورالدین کو بارہ دری کے بیچ میں چمڑے کے فرش پر بٹھایا جس پر زردوزی کا کام تھا اور اسے ایک تکیہ لگانے کو دیا جس میں شتر مرغ کے پر بھرے ہوئے تھے اور ایک پنکھا جو شتر مرغ کے پروں کا تھا۔ اس کے بعد سوداگرزادوں نے اپنے اپنے عمامے اور قبائیں اتار ڈالیں اور بیٹھ کر باتیں چیتیں کرنے لگے لیکن ہر ایک کی نظر نورالدین ہی کی طرف لگی ہوئی تھی اور وہ سب اس کی خوب صورتی میں محو تھے جب انھیں بیٹھے بیٹھے کچھ وقت گزر گیا تو ایک غلام اپنے سر پر کھانے کی سینی لیے پہنچا جس میں چینی اور بلوری برتن تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

باغ جانے سے پہلے ایک سوداگرزادہ اپنے گھر کھانے کا حکم دے آیا تھا اس سینی میں زمین پر چلنے والے، ہوا میں اُڑنے والے اور پانی میں تیرنے والے جانوروں کا گوشت تھا۔ دسترخوان بچھایا گیا سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر صاف پانی اور مشکی صابون سے ہاتھ دھوئے، ریشمی رومالوں سے منہ پونچھے اور نورالدین کو ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک رومال دیا جس پر سُرخ سونے کا کام تھا۔ اس کے بعد قہوہ آیا سب نے جی بھر کر پیا اور پھر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں باغ بان ایک ٹوکری بھر گلاب کے پھول لے آیا اور کہنے لگا اے میرے آقا، کہو ان خوش بودار پھولوں کی کیسی رہی؟ ایک سوداگرزادے نے کہا خوب رہی خاص کر گلاب کے پھول جو ہمیشہ دل پسند ہیں۔ باغ بان بولا ٹھیک ہے لیکن ہمارا دستور ہے کہ ہم گلاب کے پھول اس وقت تک نہیں دیتے جب تک کہ مزے مزے کی باتیں نہ ہوں۔ لہذا جو شخص گلاب کے پھول لینا چاہے وہ مناسب شعر سُنائے۔ سوداگر زادے دس تھے، ان میں سے ایک بولا اچھا مجھے دے، میں مناسب شعر سناتا ہوں۔ باغ بان نے اسے ایک گُل دستہ دیا اور اس نے گُل دستے پر کچھ شعر سنائے۔ اسی طرح باغ بان نے ایک ایک کر کے سب کو گل دستے دیے اور سب نے اشعار سُنائے۔

جب سب کے پاس پھولوں کا ایک ایک گل دستہ پہنچ گیا تو باغ بان نے شراب کا دسترخوان بچھایا، پہلے ایک جام بھر کر خود پیا، دوسروں کو دینا شروع کیا۔ تاج الدین تاجر کے بیٹے نورالدین کا نمبر آیا اور باغ بان جام بھر کر سامنے لایا تو نورالدین نے کہا تو جانتا ہے کہ یہ چیز میرے لیے غیر معروف ہے میں نے کبھی نہیں پی کیوں کہ اس کے پینے میں بڑا گناہ ہے

اور خدا نے اسے اپنی کتاب میں حرام کردیا ہے۔ باغ بان بولا اے میرے آقا نورالدین، اگر تو محض گناہ کی وجہ سے نہیں پیتا تو جان لے کہ خدا کریم، حلیم، غفور اور رحیم ہے، بڑے بڑے گناہوں کو معاف کردیتا ہے، اس کی رحمت سب پر حاوی ہے۔ ساتھ ہی ایک تاجرزادے نے کہا اے میرے آقا نورالدین تجھے میری جان کی قسم اس جام کو پی لے۔ اس کے بعد ایک دوسرا جوان آگے بڑھا اور اسے سخت قسم دی، پھر تیسرا آکر عاجزی سے کھڑا ہو گیا۔ نورالدین نے شرم کے مارے باغ بان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر ایک گھونٹ منہ میں لے کر تھوک دیا اور کہا یہ کڑوی ہے۔ نوجوان باغ بان بولا اے میرے آقا نورالدین، اگر وہ کڑوی نہ ہوتی تو اس میں اتنے فائدے بھی نہ ہوتے۔ تجھے معلوم نہیں کہ میٹھی چیز بھی اگر دوا کے طور پر پی جائے تو وہ کڑوی لگتی ہے۔ شراب میں بہت سے فائدے ہیں، منجملہ ان کے وہ کھانا ہضم کرتی، رنج وغم دور کرتی ہے، ریح کو زائل اور خون کو صاف کرنے والی ہے، رنگ نکھارتی ہے اور جسم کو چست و چاق کرتی ہے، بزدل کو دلیر بناتی اور جماع کی قوت دیتی ہے۔ اگر میں اس کے تمام فائدے بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔

اب باغ بان فوراً اٹھا اور بارہ دری کا ایک کمرہ کھول کر قند کا کوزہ لے آیا، ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر نورالدین کے پیالے میں ڈال دیا اور کہنے لگا میرے آقا، اگر تو شراب کی تلخی سے ڈرتا ہے تو اب یہ میٹھی ہو گئی ہے، پی جا۔ یہ سن کر نورالدین نے پیالہ اٹھایا اور پی گیا۔ اس کے بعد ایک تاجرزادے نے پیالہ بھرا اور کہا اے میرے آقا نورالدین، میں تیرا غلام ہوں۔ اسی طرح دوسرا بولا کہ میں تیرے نوکروں میں سے ہوں، تیسرا بولا کہ میری خاطر، چوتھے نے کھڑے ہو کر کہا اے میرے آقا نورالدین، میری دل شکنی نہ کر۔ اسی طرح

دسوں نوجوانوں نے نورالدین کو ایک ایک کرکے دس پیالے پلا دیے، چوں کہ نورالدین کے پیٹ میں اس دن سے پہلے کبھی شراب نہیں گئی تھی اس کا دماغ چکرانے لگا، اسے خوب نشہ ہوگیا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی زبان موٹی پڑ گئی وہ کہنے لگا ای لوگو، تم خوب صورت ہو اور تمھاری باتیں پیاری ہیں اور یہ تمھاری جگہ خوب صورت ہے مگر ایک عمدہ گانے کی کمی ہے۔ اگر شراب کے ساتھ گانا بجانا نہ ہو تو خالی پینا پلانا کس کام کا۔ یہ سُن کر جوان باغ بان اٹھا اور ایک سوداگر زادے کے خچر پر چڑھ کر غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مصری لڑکی لے کر لوٹا جو ایسی تھی جیسے دنبے کی موٹی تازی دُم یا صاف چاندی یا سینی پر دینار یا جنگل میں غزال، اس کے چہرے کے آگے روشن سورج مات تھا، آنکھیں جادو بھری اور بھویں جیسے کھنچی ہوئی کمانیں، رُخسار گلابی، دانت موتیوں کی لڑی، ہونٹ قند کے، آنکھیں متوالی، سینہ ہاتھی دانت سا، کمر پتلی اور شکن دار، کولھے جیسے بھرے ہوئے تکیے، رانیں شامی ستونوں کی مانند۔ الغرض وہ لڑکی ایسی تھی جیسے چودھویں رات کا چاند۔ اس کی پوشاک نیلی تھی، نقاب سبز اور چہرہ آن بان والا جسے دیکھ کر عقل دنگ ہو جائے اور سمجھ دار لوگ حیران رہ جائیں، اور شہرزاد کو صبح ہوگئی ......

آٹھ سو سترسٹھویں رات

آٹھ سو سترسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، بادشاہ نے لڑکی سے کہا ای حسینوں کی سرتاج، میں تجھے یہاں محض اس

غرض سے لایا ہوں کہ تو اس خوب صورت نوجوان نورالدین کے ساتھ نشست و برخاست کرے کیوں کہ یہ آج پہلی بار ہمارے ہاں آیا ہے۔ لڑکی بولی کاش تو نے پہلے سے کہہ دیا ہوتا تاکہ میں اپنے ساتھ اور کچھ بھی لیتی آتی! باغ بان نے کہا اے میری آقا، میں جاکر لیے آتا ہوں۔ لڑکی بولی جیسی تیری مرضی۔ اس نے کہا مجھے کوئی نشانی دے دے، لڑکی نے اسے ایک رومال دے دیا۔ رومال لے کر وہ چل دیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سنہری رنگ کی ایک تھیلی لے کر لوٹا جو اطلس کی تھی جس پر سونے سے دو تصویریں کڑھی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے تھیلی کو کھولا، اس میں سے بتّیس ٹکڑے لکڑی کے نکلے۔ اب اس نے ان ٹکڑوں کو آپس میں جوڑا اور وہ ایک ایسی سارنگی بن گئی جیسی کہ ہندستان والے بناتے ہیں۔

سارنگی جوڑ کر لڑکی اس پر ایسی جھکی جیسے ماں بچے پر اور اس پر اپنی انگلیاں چلانے لگی، سارنگی اپنی پرانی جگہوں کو یاد کرکے رونے لگی، اسے اس پانی کی یاد آئی جس نے اسے سینچا تھا، اس زمین کی جہاں وہ اُگ کر بڑی ہوئی تھی، ان بڑھیوں کی جنھوں نے اسے کاٹا چھانٹا تھا ان روغن سازوں کی جنھوں نے اس پر روغن چڑھایا تھا، ان تاجروں کی جو اُسے لے کر آئے تھے اور ان کشتیوں کی جن پر وہ لدکر آئی تھی۔ ان تمام باتوں کو یاد کرکے وہ گریہ زاری کرنے لگی۔ اس کے بعد لڑکی نے بجانا بند کر دیا۔ پھر اسے دوبارہ اپنی گود میں رکھ کر اور کئی طرح کے راگ بجائے۔ لڑکی کو گاتے بجاتے دیکھ کر نورالدین اسے محبت بھری نگاہ سے دیکھنے لگا گویا اس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُدھر لڑکی کا بھی یہی حال تھا کیوں کہ جب اس نے تمام سوداگر زادوں کی طرف نظر

کی تو وہ نور الدین کے سامنے ایسے معلوم ہوے جیسے چاند کے آگے تارے۔ وہ نہایت شیریں گفتار، آن بان والا، سڈول بدن کا اور حسین و جمیل تھا۔ نسیم سے زیادہ لطیف اور تسنیم سے زیادہ رقیق، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی ۔۔۔۔۔

آٹھ سو اڑسٹھویں رات

آٹھ سو اڑسٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، لڑکی کا گانا بجانا نور الدین کو بہت پسند آیا اور نشے کے چڑھاؤ میں وہ اس کی تعریف کرنے لگا۔ نور الدین کے مُنہ سے اپنی تعریف سُن کر لڑکی کی آنکھیں بھی محبت میں لڑکھڑانے لگیں، اس کا عشق دوبالا ہوگیا، اس کے حُسن و جمال اور رعنائی و زیبائی دیکھ کر دنگ ہوگئی اور بے ساختہ سارنگی دوبارہ اپنی گود میں لے کر گانے بجانے لگی۔ نور الدین کو اس کی شیریں بیانی اور خوش سرائی پر نہایت تعجب ہوا، مارے محبت اور شوق کے اس کے ہوش جاتے رہے، صبر ہاتھ سے جاتا رہا اور وہ اس کی طرف جُھکا اسے اپنے سینے سے لگا لیا لڑکی بھی اس سے لپٹ گئی اس کی پیشانی اور مُنہ چومنے لگی گویا ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ جو وہ کرتا وہ بھی کرتی تھی۔ یہاں تک کہ حاضرین مزے میں آکر کھڑے ہو گئے اور نور الدین نے شرما کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد لڑکی نے سارنگی لے کر مختلف راگ بجائے۔ نور الدین مارے خوشی کے سر تا پا اس کی طرف متوجہ ہوگیا، تعجب کے مارے اس کی عقل ٹھکانے نہ رہی۔ سارنگی لے کر وہ خود گانے

بجانے لگا اور ایسا گایا بجایا کہ لڑکی دنگ ہو گئی۔ پھر لڑکی نے سارنگی لے کر گانا بجانا شروع کیا۔ بعدازاں نورالدین نے۔ اور پھر لڑکی نے گایا بجایا اور نورالدین نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تعریف پر لڑکی کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے اپنا لباس اور گہنا اُتار ڈالا اور اکڑوں بیٹھ کر اس کی پیشانی اور رخسار کے تل کو بوسے دینے لگی اور ساری چیزیں اس کے نذر کر دیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو انہتّرویں رات

آٹھ سو انہترّویں رات ہوئی تو اُس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، لڑکی نے نورالدین کو ساری چیزیں دے کر کہا کہ ہدیہ، ہدیہ دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ نورالدین نے اسے قبول کر لیا اور پھر واپس دے دیا!! اس کے مُنہ، رخساروں اور آنکھوں کو بوسہ دیا۔ جب یہ سب کچھ ختم ہو چکا، ہمیشہ قائم رہنے والی تو محض خدا کی ذات ہے جو مور اور اُلّو دونوں کی رزّاق ہے، تو نورالدین اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے پوچھا ای میرے آقا، کہاں؟ اس نے جواب دیا اپنے باپ کے گھر۔ سوداگرزادوں نے اُسے قسم دی کہ وہ ان کے ساتھ سوئے لیکن وہ نہ مانا اور اپنے خچّر پر سوار ہو کر گھر چلا گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اس کے پاس آکر پوچھا بیٹا، تو اب تک کہاں غائب رہا؟ خدا کی قسم تیرے غائب رہنے سے میں اور تیرا باپ دونوں پریشان تھے، ہمارا دل تجھ ہی میں لگا ہوا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی ماں آگے بڑھی کہ اس کے مُنہ کو بوسہ دے لیکن یہ دیکھ کر اس کے

مُنہ سے شراب کی بُو آرہی ہے۔ کہنے لگی بیٹا، نماز اور عبادت کے بعد تو نے شراب پینی شروع کردی اور خدا کی نافرمانی کرنے لگا۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اس کا باپ آگیا اور نورالدین فرش پر گر کر سو گیا۔ باپ نے پوچھا کہ نورالدین کو کیا ہوا؟ ماں نے کہا کہ باغ کی ہوا سے اس کے سر میں چکر آگیا ہے۔ باپ اس کی طرف بڑھا کہ اس سے پوچھے کہ تجھے کیا ہوا۔ اسے بھی نورالدین کے مُنہ سے شراب کی بُو آنے لگی۔ تاج الدین شراب پینے والوں سے بہت نفرت کرتا تھا بولا بیٹا، بڑے افسوس کی بات ہے، کیا تو اس درجہ گر گیا کہ شراب پینے لگا؟ نورالدین نشے میں تو تھا ہی ہاتھ اٹھا کر اس کے ایک طمانچہ مار دیا۔ خدا کا کرنا کہ طمانچہ اس کی داہنی آنکھ پر پڑا اور وہ پھوٹ گئی۔ تاج الدین غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لوگوں نے اس پر گلاب چھڑکا، ایک پہر کے بعد اسے ہوش آیا

ہوش آتے ہی وہ بیٹے کو مارنے چلا ماں نے اسے روک لیا۔ بیوی کے آڑے آجانے سے اس وقت تو تاج الدین رُک گیا لیکن اس نے کہا کہ اگر کل سویرا ہوتے ہی اس کا داہنا ہاتھ نہ کاٹ ڈالوں تو اس کی ماں کو طلاق۔ یہ سُن کر بیوی بہت گھبرائی اور بیٹے کے متعلق ڈرنے لگی۔ بار بار میاں کے پاس جا کر سمجھاتی یہاں تک کہ وہ سو گیا۔ ماں نے چاند نکلنے کا انتظار کیا جب چاند نکلا تو بیٹے کے پاس گئی۔ اس وقت اس کا نشہ اُتر چکا تھا، ماں نے کہا اے نورالدین، یہ تو نے اپنے باپ کے ساتھ کیا حرکت کی؟ وہ بولا میں نے باپ کے ساتھ کیا کیا؟ ماں بولی تو نے اس کی داہنی آنکھ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ پھوٹ گئی، اب اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر وہ کل صبح تیرا داہنا ہاتھ نہ کاٹ ڈالے تو مجھے طلاق

ہے۔ نورالدین یہ سن کر سخت پشیمان ہوا لیکن اب پشیمان ہونے سے کیا بنتا تھا ماں نے کہا بیٹا، اب پشیمانی سے کوئی فائدہ نہیں، بہتر یہ ہے کہ تو فوراً اٹھ کر بھاگ جا، اپنے آپ کو بچا، اپنے جانے کی کسی کو خبر نہ کر کسی اپنے دوست کے پاس جا کر چھپ رہ اور دیکھ کہ خدا کیا کرتا ہے کیوں کہ وہ حالتیں بدلتا رہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس کی ماں نے ایک صندوق کھولا اور اس میں سے سو دینار کا ایک توڑا نکال کر بیٹے سے کہا ان سے اپنا کام چلائیو اور جب یہ ختم ہو جائیں تو مجھے خبر بھیجیو تاکہ میں تجھے اور بھیج دوں اور جب تو مجھے خط لکھے تو چھپا کر بھیجیو۔ ممکن ہے کہ خدا تیری تقدیر میں خوشی لکھ دے اور تو گھر لوٹ آئے۔

یہ کہہ کر ماں نے نورالدین کو رخصت کیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ نورالدین توڑا لے کر باہر جانے والا ہی تھا کہ اس نے صندوق کے ایک کونے میں ایک اور توڑا دیکھا جس میں ایک ہزار دینار تھے جسے اس کی ماں بھول گئی تھی۔ نورالدین نے اسے بھی لے لیا اور دونوں کو کمر سے باندھ کر دن نکلتے نکلتے شہر سے نکل گیا اور بولاق کی طرف چل دیا۔ لوگ نماز پڑھنے اور کام پر جانے لگے تو وہ بولاق پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ سمندر کے کنارے ٹہلنے لگا، اس کی نظر ایک کشتی پر پڑی جس کے بادبان اٹھے ہوئے تھے لوگ اس میں آ جا رہے تھے چاروں لنگر زمین میں دبے ہوئے اور ملاح کھڑے ہوئے تھے۔ نورالدین نے ان سے پوچھا تم کہاں جاتے ہو؟ وہ بولے اسکندریہ۔ نورالدین بولا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو۔ وہ بولے اے حسین جوان، اہلاً وسہلاً ومرحبا۔ نورالدین فوراً اٹھا اور بازار جا کر کھانا، بچھونا اور اوڑھنا غرض کہ جن جن چیزوں

کی اسے ضرورت تھی لے آیا۔ جب وہ لوٹا تو کشتی لنگر اٹھانے والی تھی۔ نورالدین کشتی پر چڑھا ہی تھا کہ وہ چل دی اور چلتے چلتے رشید جا پہنچی۔ نورالدین نے دیکھا کہ ایک چھوٹی کشتی اسکندریہ جارہی ہے وہ اُس میں بیٹھ کر خلیج کے پار ہوگیا اور ایک پُل کے پاس پہنچا جس کا نام قنطرۃ الجامی تھا۔ وہاں نورالدین کشتی سے اُترا اور باب السدرہ سے داخل ہوا، خدا نے اس کی پردہ پوشی کی اور جتنے لوگ دروازے پر کھڑے تھے ان میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی اور نورالدین اسکندریہ میں داخل ہوگیا، اور شہرزاد کو صبح ہوئی۔۔۔۔۔

آٹھ سو ستّرویں رات

آٹھ سو ستّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، جب نورالدین اسکندریہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کی شہر پناہ بڑی مضبوط ہے، سیرگاہیں خوش نما ہیں اور وہاں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ سردیاں جا چکی ہیں، بہار کا موسم گلاب کے پھولوں کو لے کر آگیا ہے، کلیاں کھل رہی ہیں، درختوں پر جوبن ہے، پھل پک گئے ہیں اور نہریں اُبل رہی ہیں، شہر نہایت خوب صورت ہے اور شہر والے بہترین لوگ۔ جب اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو لوگ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سیر کرتا نورالدین تاجروں کے بازار میں پہنچا وہاں سے صرّافوں کے بازار میں، وہاں سے میوہ فروشوں کے بازار میں، وہاں سے سبزی منڈی میں اور وہاں سے عطر فروشوں کے بازار میں۔ شہر کو دیکھ کر نورالدین کی حیرت بڑھتی جاتی

تھی کہ جیسا اس کا نام سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ وہ عطر فروشوں کی دُکان سے گزر رہی رہا تھا کہ ایک بوڑھے نے اپنی دُکان سے اُتر کر اسے سلام کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ نورالدین نے دیکھا کہ گلی صاف ستھری پانی چھڑکا ہوُا، ہوا ٹھنڈی، درختوں کے پتّوں کا سایہ۔ اس گلی میں تین مکان ہیں جو مکان صدر میں ہے اس کی بنیاد بڑی مضبوط ہے اور دیواریں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اس کے آگے کا چوک نہایت اُجلا، پاکیزہ، آنے جانے والوں کو پھوُلوں کی خوش بوُ آرہی ہے، گویا جنّت کا ایک ٹکڑا ہے۔ چوک کے آگے مکان ڈیوڑھی تک مرمر کا فرش ہے۔ بوُڑھا نورالدین کو لیے ہوے مکان کے اندر گیا اس کے آگے کھانا پیش کیا دونوں نے مل کر کھایا۔

کھا پی چکے تو بوُڑھے نے نورالدین سے پوُچھا توُ قاہرہ سے یہاں کب آیا؟ نورالدین نے جواب دیا چچا، آج ہی رات کو آیا ہوُں۔ بوڑھا بولا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا علی نورالدین۔ بوُڑھا کہنے لگا بیٹا نورالدین، اگر تو یہاں رہ کر مجھ سے الگ رہا تو میری بیوی کو تین طلاقیں، میں تیرے رہنے کے لیے ایک الگ مکان دیے دیتا ہوں۔ نورالدین نے کہا اے میرے آقا، بتا کہ توُ ہے کون۔ بوڑھے نے کہا بیٹا، میں ایک سال قاہرہ گیا تھا وہاں میں نے خرید و فروخت کی۔ اسی اثنا میں مجھے ایک ہزار دینار کی ضرورت پڑگئی اور تیرے باپ تاج الدین نے بے اس کے کہ وہ مجھے جانتا ہو دینار تول کر دے دیے رسید تک نہ لی یہاں تک کہ میں اسکندریہ پہنچا اور ایک غلام کے ہاتھ وہ قرضہ اور اس کے ساتھ ایک ہدیہ تیرے باپ کے پاس بھیجا۔ میں نے تجھے بھی دیکھا تھا لیکن اُس وقت تو بہت چھوٹا تھا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو میں اس کے احسان کے بدلے میں تیرے

ساتھ بھی کچھ احسان کروں گا۔ یہ سن کر نورالدین خوش ہوگیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے وہ توڑا نکالا جس میں ایک ہزار دینار تھے اور اسے بوڑھے کو دے کر کہا کہ اسے اپنے پاس بہ طور امانت کے رکھے، کچھ مدت کے بعد میں اس سے تجارت کروں گا۔ اس کے بعد نورالدین کئی دن تک اسکندریہ میں رہا، ہر روز وہاں کی گلیوں میں سیر کرتا، کھاتا پیتا اور مزے اڑاتا یہاں تک کہ وہ سو دینار جو وہ خرچ کے لیے لایا تھا ختم ہوگئے اور وہ بوڑھے عطرفروش کے پاس آیا تاکہ ایک ہزار دیناروں میں سے کچھ لے جائے اور خرچ کرے، لیکن اسے دکان پر نہ پایا۔ بیٹھ کر واپس آنے کی راہ دیکھنے لگا، دائیں بائیں تاجروں کی چہل پہل دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔

وہ اسی شغل میں تھا کہ ایک عجمی خچر پر سوار بازار میں آیا اس کے پیچھے ایک لڑکی تھی ایسی جیسے خالص چاندی یا حوض میں بلطیہ مچھلی یا جنگل میں غزال۔ اس کے چہرے کے آگے سورج مات تھا، آنکھیں جادو بھری تھیں، سینہ ہاتھی دانت کی تختی دانت موتی، کمر پتلی، اس کا حسن و جمال مکمل تھا اور قد و قامت سڈول۔ عجمی نے خچر سے اتر کر لڑکی کو اتارا دلال کو آواز دی اور کہا کہ اس لڑکی کو لے جاکر بولی لگوا۔ دلال اسے لے جاکر بیچ بازار میں پہنچا، آبنوس کی ایک کرسی بچھائی جس پر ہاتھی دانت کا کام تھا۔ دلال نے لڑکی کو اس پر بٹھا دیا اور اس کی نقاب الٹ دی، اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دیلمی ڈھال یا چمکدار تارہ، گویا وہ چودھویں رات کا چاند تھی۔ نہایت حسین۔ اب دلال نے تاجروں سے کہا کہ تم اس یگانہ موتی اور سونے کی چڑیا کی کیا قیمت لگاتے ہو؟

ایک تاجر بولا سنو! دینار میں میں لیتا ہوں، دوسرے نے دو سو دینار لگائے تیسرے نے تین سو۔ اسی طرح لوگ بڑھا بڑھا کر بولیاں بولنے لگے یہاں تک کہ اس کی قیمت نو سو پچاس تک پہنچ گئی۔ یہ آخری بولی تھی اور اب محض ایجاب قبول کی دیر تھی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی دی ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو اکہتّرویں رات

آٹھ سو اکہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب لڑکی کے نو سو پچاس دینار لگ چکے تو دلّال نے اس کے مالک عجمی کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا بول، کیا تو ان داموں بیچنا چاہتا ہے؟ عجمی بولا کیا وہ اس پر راضی ہے؟ مجھے اس کی خاطر منظور ہے کیوں کہ اس سفر میں اس نے میری بہت خدمت کی ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ اُسے ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا جسے وہ چاہے گی۔ اب تو جا کر اسی سے مشورہ کر، اگر وہ کہے کہ بیچ ڈال تو بیچ ڈالیو اور اگر وہ کہے کہ نہ بیچ تو نہ بیچیو۔ یہ سُن کر دلّال لڑکی کے پاس گیا اور کہنے لگا اے حسینوں کی سرتاج، تیرا بکنا تیرے آقا نے تیری مرضی پر چھوڑ دیا ہے اور تیرے دام نو سو پچاس دینار تک پہنچ چکے ہیں، کیا تیری اجازت ہے کہ میں تجھے بیچ دوں؟ کنیز بولی اس شخص کو مجھے دکھا دے جو مجھے خریدنا چاہتا ہے تاکہ بیچنا سے پہلے میں اسے دیکھ لوں۔ دلّال اسے ایک تاجر کے پاس لے گیا جو بے حد بوڑھا تھا۔ کنیز اس کی طرف تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی

اور پھر دلّال سے کہنے لگی اے دلّال، کیا تو پاگل ہوگیا ہے اور تیری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں؟ کیا خدا اس بات کی تجھے اجازت دے سکتا ہے کہ تو مجھ جیسی جوان کو اس بڈھے کھوسٹ کے ہاتھ بیچے!

وہ بوڑھا تاجروں کا چودھری تھا اس نے کنیز کو اپنی شان میں یہ بُرے الفاظ کہتے سُنا تو بے حد ناراض ہوا اور دلّال سے بولا اے منحوس ترین دلّال، تو کس کم بخت کنیز کو بازار میں لے آیا ہے کہ وہ میرا مذاق اُڑاتی اور تاجروں کے سامنے میری بُرائی کرتی ہے؟ دلّال کنیز کو لے کر وہاں سے چل دیا اور اس سے کہا اے میری آقا، بے ادب نہ بن جس بوڑھے کو تو بُرا بھلا کہتی ہے وہ بازار کا چودھری، محتسب اور تاجروں کا مشیر ہے۔

کنیز نے دلّال سے کہا اے میرے آقا، واللہ میں اس کے ہاتھ بکنا نہیں چاہتی، مجھے کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ۔ اگر وہ میرے سامنے شرمندہ ہوگا تو مجھے لے جا کر کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالے گا اور میں محض نوکرانی ہو کر رہ جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ اپنے بیچنے کی خود میں مختار ہوں۔ دلّال اُسے ایک اور بڑے تاجر کے پاس لے گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا اے میری آقا، کیا میں تجھے اپنے آقا شریف الدین کے ہاتھ نو سو پچاس دینار میں بیچ سکتا ہوں؟ کنیز نے اس کی طرف نظر اٹھائی دیکھا وہ بھی بوڑھا ہے مگر اُس کی داڑھی رنگی ہوئی ہے، لڑکی دلّال سے کہنے لگی کیا تو دیوانہ ہے یا تیری عقل ماری گئی ہے، تجھے بوڑھوں کے سوا کوئی جوان میسّر نہیں، میں کباڑیے کی دکان کا مال تو نہیں کہ تو مجھے ایک بوڑھے سے دوسرے بوڑھے کے پاس لے جا رہا ہے۔ دونوں کی مثال

ایسی دیوار کی ہی جو گرنے والی ہو یا ایسے دیو کی جنھیں ستاروں نے مار کر گرا دیا ہو۔ اور دوسرا بوڑھا تو مکّار بھی ہی اس نے اپنے بڑھاپے کو کالا کر رکھا ہی اور داڑھی رنگ کر لوگوں کو دھوکا دیتا ہی۔ لڑکی کی یہ باتیں سُن کر خضاب والا بوڑھا بے حد ناراض ہوا اور دلّال سے کہنے لگا ای منحوس ترین دلّال، آج تو یہ کیسی رذیل کنیز لے کر بازار میں آیا ہی کہ وہ ایک ایک کر کے ہم سب پر فقرے کستی اور ہماری ہجو کرتی ہی؟ یہ کہ کر تاجر دُکان سے اُترا اور دلّال کے ایک طمانچہ مارا۔ دلّال غصّے میں آ کر وہاں سے چل دیا لڑکی اس کے ساتھ تھی اس سے کہا خُدا کی قسم مَیں نے تجھ سے زیادہ بے شرم لڑکی عمر بھر نہیں دیکھی۔ تیری وجہ سے آج ہم دونوں کا رزق اٹھ گیا ہی اور سب تاجر مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ راستے میں ایک اور تاجر کی نظر ان پر پڑی، اس نے لڑکی کی قیمت میں دس دینار اور بڑھا دیے، اس تاجر کا نام شہاب الدین تھا۔ دلّال نے لڑکی سے پوچھا کیا تجھے بیچ سکتا ہوں؟ لڑکی بولی مَیں پہلے اُسے ایک نظر دیکھنا اور اس سے ایک چیز کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ چیز اس کے پاس ہوئی تو مَیں اُس کے ہاتھ بک جاؤں گی ورنہ نہیں۔ دلّال لڑکی کو چھوڑ کر تاجر کے پاس گیا اور بولا ای میرے آقا شہاب الدین، یہ لڑکی مجھ سے کہتی ہی کہ وہ ایک چیز کے متعلّق تجھ سے پوچھنا چاہتی ہی، اگر وہ تیرے پاس ہوگی تو وہ تیرے ہاتھ بک جائے گی۔ لیکن تو سُن چکا ہی کہ اس نے اور تاجروں سے کیا کہا ہی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی ......

آٹھ سو بہتّرویں رات

آٹھ سو بہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ دلاّل نے تاجر سے کہا کہ تو سُن چکا ہی کہ لڑکی نے دوسرے تاجروں سے کیا کہا ہی۔ واللہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں اُسے تیرے پاس لایا تو کہیں وہ تیرے ساتھ بھی وہی حرکت نہ کرے جو اس نے تیرے پڑوسیوں کے ساتھ کی ہی اور مجھے تیرے آگے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ تیری اجازت ہو تو میں اُسے لے آؤں۔ تاجر بولا لے آ۔ دلاّل کنیز کو لے آیا۔ کنیز نے اُسے دیکھ کر پوچھا ای میرے آقا شہاب الدین، کیا تیرے گھر میں ایسے گول تکیے ہیں جن کے اندر گلہری کی کھال کے ٹکڑے بھرے ہوں؟ اس نے کہا ہاں ای حسینوں کی سرتاج، میرے گھر میں ایسے دس تکیے ہیں، لیکن خدا کے لیے بتا تو سہی کہ تو ان کا کیا کرے گی۔ لڑکی بولی کہ جب سو جائے گا تو میں انھیں تیرے مُنہ اور ناک میں ٹھونس دوں گی تاکہ تو مر جائے۔ یہ کہہ کر وہ دلاّل کی طرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی ای منحوس ترین دلاّل، کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہی کہ ایک پہر پہلے تو نے مجھے دو بوڑھوں کے آگے پیش کیا جن میں دو دو عیب تھے اور اب تو مجھے میرے آقا شہاب الدین کے آگے پیش کرتا ہی جس میں تین عیب ہیں، ایک تو وہ پستہ قد ہی دوسرے اس کی ناک بڑی ہی اور تیسرے اس کی ڈاڑھی لمبی ہی۔ لڑکی کی یہ باتیں سُن کر شہاب الدین دکان سے اُترا دلاّل کا گریبان پکڑ لیا اور کہنے لگا ای منحوس ترین دلاّل، تو ایسی کنیز کو لے کر ہمارے پاس آیا جو ہمیں بدنام کرتی اور بُرا بھلا کہتی ہی۔ دلاّل کنیز کو لے کر وہاں سے

بھی چل دیا اور اس سے کہنے لگا خدا کی قسم میں نے عمر بھر یہی پیشہ کیا ہے لیکن تو سب سے زیادہ بے ادب اور میرے لیے سب سے زیادہ منحوس نکلی۔ میری آج کی روزی تو نے برباد کر دی اور نفع میں مجھے ایک مکّا ملا اور میرا گریبان پکڑا گیا۔

اس کے بعد دلّال کنیز کو لے کر ایک اور تاجر کے پاس ٹھیرا جس کے پاس بہت سے کالے اور گورے غلام تھے اور اس سے کہنے لگا کیا تو اس تاجر علاالدین کے ہاتھ بکنا چاہتی ہے۔ کنیز نے دیکھا تو وہ کبڑا تھا، کہنے لگی ارے یہ تو کبڑا ہے۔ دلّال اسے جلدی سے لے کر ایک اور تاجر کے پاس گیا اور پوچھا تجھے اس کے ہاتھ بیچوں؟ لڑکی نے دیکھا کہ وہ گنجا ہے، کہنے لگی تو مجھے اس گنجے کے ہاتھ کیوں کر بیچ سکتا ہے! پھر دلّال اُسے لے کر ایک لمبی ڈاڑھی والے کے پاس پہنچا، کنیز نے اس پر بینڈھے کی پھبتی کسی کہ اس کی دُم حلق میں آ کر نکلی ہے۔ تو نے سُنا نہیں کہ لمبی داڑھی والا کم عقل ہوتا ہے اور داڑھی جتنی لمبی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی عقل گھٹتی جاتی ہے۔ یہ بات تو دانش مندوں میں مشہور ہے۔ اب دلّال اُسے لے کر مُڑا۔ لڑکی نے پوچھا تو مجھے کہاں لیے جاتا ہے؟ دلّال بولا تیرے آقا عجمی کے پاس۔ جو آج تیرے سبب سے مجھ پر گُزری وہ بہت کافی ہے، تیری بے ادبی کی وجہ سے میری اور اُس کی روزی جاتی رہی۔ کنیز نے بازار میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے نظر دوڑائی خدا کا کرنا کہ اس کی نظر نورالدین علی مصری پر جا پڑی اس نے دیکھا کہ وہ خوش رو جوان ہے اس کے رُخسار صاف سُتھرے قد سڈول ہے، عمر چودہ سال کی ہوگی، نہایت حسین و جمیل ہے، گویا

چودھویں رات کا چاند، اس کی پیشانی بارونق ہے، رخسار سُرخ، گلاب کی طرح، دانت جیسے ہیرے اور لعاب شکر سے زیادہ میٹھا۔ اُسے دیکھتے ہی لڑکی اس پر عاشق ہوگئی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی.....

آٹھ سو تہتّرویں رات

آٹھ سو تہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، کنیز علی نورالدین کو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگئی اور دلاّل سے مخاطب ہو کر کہنے لگی، یہ نوجوان تاجر جو دوسرے تاجروں کے بیچ میں لمبی آستینوں کی مرزئی پہنے بیٹھا ہے کیا اس نے میرے دام بالکل نہیں بڑھائے؟ دلاّل نے جواب دیا اے حسینوں کی سرتاج، یہ نوجوان قاہرہ کا رہنے والا پردیسی ہے، اس کا باپ وہاں کے سارے تاجروں میں بڑا ہے۔ اسے یہاں آئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے اور وہ اپنے باپ کے ایک دوست کے ہاں ٹھیرا ہے۔ اس نے تیرے دام نہ بڑھائے نہ گھٹائے۔ یہ سُن کر کنیز نے اپنی انگلی سے یاقوت کی ایک قیمتی انگوٹھی اُتاری اور دلاّل سے کہا مجھے اس خوش رو جوان کے پاس لے چل اگر اس نے مجھے خرید لیا تو یہ انگوٹھی تیرا محنتانہ ہے۔ دلاّل خوش ہوگیا اور نورالدین کے پاس پہنچا۔ لڑکی نے اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ گویا پورا چاند ہے۔ اس سے کہنے لگی اے میرے آقا، خدا کی قسم بتا کہ میں خوبصورت نہیں ہوں؟ اس نے کہا اے حسینوں کی سرتاج، دنیا میں تجھ سے زیادہ خوب صورت بھلا کوئی ہو سکتا ہے! کنیز نے کہا پھر یہ کیسے ہوا، تو نے

دیکھا کہ تاجر میرے دام بڑھا رہے ہیں اور تو بالکل چُپ رہا اور کچھ بھی نہ کہا، میرے داموں میں ایک دینار بھی نہ بڑھایا۔ ای میرے آقا، گویا میں تجھے بالکل پسند نہیں۔ اس نے کہا ای میری آقا، اگر میں اپنے وطن میں ہوتا تو میں اپنی ساری دولت دے کر تجھے خرید لیتا۔ لڑکی بولی میں تجھ سے یہ نہیں کہتی کہ تو مجھے خواہ مخواہ خرید لے لیکن اگر تو میرے دام بڑھاتا تو میرا دل خوش ہو جاتا خواہ تو مجھے نہ خریدتا لیکن تاجر کہتے ہیں کہ اگر یہ کنیز حسین نہ ہوتی تو یہ قاہرہ کا تاجر اس کے دام نہ بڑھاتا کیوں کہ قاہرہ والوں کو کنیزوں کی پرکھ ہے۔ کنیز کی یہ باتیں سُن کر نورالدین شرما گیا۔ اس نے دلّال سے پوچھا کہ اس کنیز کے دام کہاں تک پہنچ چکے ہیں؟ دلّال بولا کہ دلّالی کے علاوہ نوسو پچاس دینار، اور بادشاہ کا حق بیچنے والے پر ہے۔ نورالدین بولا کہ قیمت اور دلّالی ملا کر اسے ایک ہزار دینار میں بیچ ڈال۔ کنیز دلّال کو چھوڑ کر آگے بڑھی اور کہنے لگی میں اس خوش رو جوان کے ہاتھ ایک ہزار دینار میں بک گئی۔

یہ سُن کر نورالدین چُپ ہو گیا۔ ایک بولا کہ ہم نے اسے بیچ ڈالا، دوسرے نے کہا کہ وہ اس لڑکی کا اہل ہے، تیسرا کہنے لگا کہ جو دام بڑھائے اور نہ خریدے اس پر لعنت اور اس کے باپ پر لعنت! چوتھا بولا کہ خدا کی قسم وہ ایک دوسرے کے لائق ہیں۔ نورالدین کو پتا بھی نہیں چلا کہ دلّال قاضیوں اور گواہوں کو لے آیا۔ انھوں نے بیع نامہ لکھ کر نورالدین کے حوالے کیا اور دلّال نے کہا کہ کنیز کو لے، خدا اُسے تیرے لیے مبارک کرے! وہ سوا تیرے اور کسی کے لائق نہیں اور تو سوا اُس کے اور کسی کے لائق نہیں۔ تاجروں کی شرم کے مارے

نورالدین فوراً اٹھا اور ایک ہزار دینار لا کر جو اس نے امانتاً عطر فروش کے پاس رکھ چھوڑے تھے تول دیے اور کنیز کو لے کر اس مکان میں گیا جہاں عطر فروش بوڑھے نے اسے ٹھیرایا تھا۔ جب لڑکی مکان میں داخل ہوئی تو اس نے وہاں پھٹا ہوا فرش اور پرانا قالین دیکھا کہنے لگی ای میرے آقا! کیا میری قدر تیرے دل میں بالکل نہیں اور کیا میں اس قابل نہیں کہ تو مجھے اپنے خاص گھر میں لے چلے جہاں تیرا سامان ہو؟ تو نے مجھے اپنے باپ کے گھر لا کر کیوں اتارا ہی؟ نورالدین نے کہا ای حسینوں کی سرتاج! میں اسی مکان میں رہتا ہوں، اس کا مالک ایک عطر فروش بوڑھا ہی جو اسی شہر کا رہنے والا ہی، اس نے مجھے یہ مکان رہنے کے لیے دے رکھا ہی۔ میں نے کہا نہ تھا کہ میں پردیسی قاہرہ کا رہنے والا ہوں۔ لڑکی بولی ای میرے آقا، وطن جانے سے پہلے ہمارے لیے چھوٹے سے چھوٹا مکان بھی کافی ہی، لیکن ای میرے آقا! خدا کے لیے جا کر کچھ بھنا ہوا گوشت، شراب، خشک میوہ اور تازے پھل لے آ۔ نورالدین نے کہا ای حسینوں کی سرتاج! خدا کی قسم میرے پاس وہی ایک ہزار دینار تھے جو میں نے تول کر تیری قیمت میں دے دیے۔ ان کے بعد اب میرے پاس کچھ نہیں اور جو چند درہم تھے بھی وہ کل تک خرچ ہو چکے۔ لڑکی نے کہا کیا اس شہر میں تیرا کوئی دوست نہیں جس سے تو پچاس درہم قرض لے آئے تاکہ میں ان کا مصرف بتاؤں؟ اس نے جواب دیا کہ سوا عطر فروش کے میرا کوئی دوست نہیں۔ یہ کہہ کر وہ عطر فروش کے پاس گیا اور کہا چچا! السلام علیک۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور کہا بیٹا! تو نے آج ایک ہزار دینار

میں کیا خریدا ہے؟ نورالدین نے جواب دیا ایک کنیز۔ عطر فروش نے کہا بیٹا، کیا تیرا سر پھر گیا ہے کہ تو نے ایک ہزار دینار میں ایک کنیز خریدی؟ نہ معلوم وہ کیسی کنیز ہوگی۔ نورالدین نے کہا چچا، وہ ایک فرنگن کنیز ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو چوہتّرویں رات

آٹھ سو چوہتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! نورالدین نے بوڑھے عطر فروش سے کہا وہ ایک فرنگن کنیز ہے۔ بوڑھا بولا بیٹا، اس شہر میں بہترین فرنگنوں کی قیمت سو دینار ہے، بیٹا، اس میں کسی نے تیرے ساتھ چال چلی ہے۔ اگر وہ تجھے پسند ہو تو آج رات کو اس کے ساتھ سو اور اس سے اپنا مطلب نکال کر صبح اُسے بازار میں بیچ ڈالیو، خواہ اس میں تجھے دو سو دینار کا ٹوٹا ہی کیوں نہ ہو اور سمجھ لیجیو کہ وہ پانی میں گر پڑے یا ڈاکو راہ سے لے اُڑے۔ نورالدین نے کہا تو ٹھیک کہتا ہے لیکن چچا، تو جانتا ہے کہ میرے پاس وہی ہزار دینار تھے جن سے میں نے کنیز خریدی اور اب میرے پاس خرچ کرنے کے لیے ایک درہم تک نہیں۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے پچاس درہم اُدھار دے دے تاکہ کل تک خرچ چلے، کل میں کنیز کو بیچ کر اس کے داموں میں سے تیرا قرضہ ادا کر دوں گا۔ بوڑھے نے پچاس درہم تول کر دے دیے اور کہا بیٹا، تو ابھی کم سن ہے اور یہ کنیز خوب صورت، اگر تیرا دل اس سے پھنس گیا تو اس کا

بیچنا تیرے لیے آسان نہ ہوگا، اور تیرے پاس خرچ کرنے کے لیے دام نہیں۔
جب یہ پچاس درہم ختم ہو جائیں گے تو تو پھر میرے پاس آئے گا اور میں
ایک بار دون گا دو بار دوں گا تین بار دوں گا دس بار دے چکوں گا اور
تو پھر میرے پاس آئے گا تو میں تیرے شرعی سلام کا جواب بھی
نہ دوں گا اور جو محبت مجھے تیرے باپ سے ہے وہ بھی اکارت جائے گی۔
یہ کہہ کر بوڑھے نے اسے پچاس درہم دے دیے اور وہ انھیں لے کر
کنیز کے پاس آیا۔ کنیز نے کہا اے میرے آقا، ابھی بازار جا کر میرے
لیے بیس درہم کا ریشم لے آ جو پانچ مختلف رنگوں کا ہو اور باقی تیس
درہم کا گوشت، روٹی، پھل، شراب اور عطر۔

نورالدین بازار جا کر وہ تمام چیزیں خرید لایا جو لڑکی نے کہی تھیں۔
لڑکی نے فوراً آستینیں چڑھالیں، خوب اچھی طرح سالن پکایا،
اس کے آگے لا رکھا اور دونوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے بعد وہ
شراب لائی اور دونوں نے پی۔ لڑکی اسے برابر پلاتی جاتی اور پیار کی
باتیں کرتی جاتی یہاں تک کہ وہ نشے میں آکر سو گیا۔ اب لڑکی نے
اٹھ کر اپنے بقچے میں سے ایک طائفی چمڑے کی تھیلی نکالی۔ تھیلی میں
سے دو بُننے کی سوئیاں اور بُننے لگی۔ تھوڑی دیر میں ایک پیٹی بُن کر تیار
کر دی اسے صاف کر کے استری کی اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر تکیے کے نیچے رکھ دی۔
پھر اس نے اٹھ کر اپنے کپڑے اُتارے اور نورالدین کے پاس
لیٹ کر اُسے دابنے لگی یہاں تک کہ اس کی آنکھ کُھل گئی۔ اس
نے دیکھا کہ اس کے پہلو میں ایک لڑکی ہے گویا وہ خالص چاندی
ہے ریشم سے زیادہ نرم اور دنبے کی دُم سے زیادہ تر و تازہ، میانہ

قد، سینہ اُبھرا ہوا، بھنویں جیسے کھنچی ہوئی کمانیں، آنکھیں غزالوں کی سی اور رخسار شقائق النعمان جیسے۔ نورالدین نے اسے دیکھ کر فوراً سینے سے لگا لیا، پہلے نیچے کا ہونٹ چوسا پھر اوپر کا اور پھر اس کی بکارت زائل کر کے اس طرح اس کے بوسے لینے لگا جیسے پانی میں سنگ ریزے گرتے ہوں کیوں کہ نورالدین کو تمنا تھی کہ وہ اس حور کو گلے سے لگائے اور اس کے ہونٹ چوسے، بال کھولے، کمر میں ہاتھ ڈالے اور رخسار کاٹے۔ اس کے بعد نورالدین اور کنیز بڑے مزے سے صبح تک سوتے رہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی......

آٹھ سو چھہتّرویں رات

آٹھ سو چھہترویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! نورالدین اور کنیز بڑے مزے سے صبح تک سوتے رہے۔ صبح ہوئی اور دن چڑھا تو نورالدین جاگا دیکھا کہ وہ پانی لائی ہے، دونوں نے غسل کیا اور نورالدین نے نماز پڑھی، لڑکی ناشتہ لائی اس نے کھایا پیا۔ اس کے بعد لڑکی نے تکیے کے نیچے ہاتھ بڑھا کر وہ پیٹی نکالی جو اس نے رات کو بنائی تھی اور نورالدین کو دے کر کہا ای میرے آقا، یہ پیٹی لے۔ اس نے پوچھا یہ پیٹی کہاں سے آئی؟ لڑکی نے کہا ای میرے آقا، یہ اسی ریشم کی ہے جو تو نے کل بیس درہم میں خریدا تھا۔ اسے لے کر عجمی بازار میں جا دلاّل کو دے کر کہیو کہ لوگ اس پر بولی بولیں اور اس وقت تک نہ بیچیو جب تک دلاّلی نکال کر پورے بیس دینار تجھے نہ ملیں۔ نورالدین

نے کہا ای حسینوں کی سرتاج، بیس درہم کی چیز تھی جو ایک رات میں بن
گئی ہو نہیں بیس دینار میں بکی ہی، لڑکی نے کہا ای میرے آقا، تجھے اس
کی قیمت کی خبر نہیں۔ تو اسے بازار لے جاکر دلاّل کو دے تو سہی، جب
وہ آواز لگائے گا تو تجھے اس کی قیمت معلوم ہو جائے گی۔ نورالدین پٹی
کو لے کر عجمی بازار میں گیا اور اسے دلاّل کو دے کر کہا اس پر آواز لگا۔
نورالدین ایک دُکان کی چوکی پر بیٹھ گیا اور دلاّل پٹی کو لے کر چل دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد اس نے نورالدین کے پاس آکر کہا ای میرے آقا،
چل کر اپنی پٹی کی قیمت لے لے، اس کی قیمت بے دلاّلی کاٹے بیس
دینار تک پہنچ گئی ہی۔ دلاّل کی باتیں سُن کر نورالدین کو بڑا اچنبھا ہوُا
وہ مارے خوشی کے وجد کرنے لگا اور جاکر بیس دینار لے آیا لیکن اس
کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ حقیقت ہی یا دھوکا۔ دینار لے کر اس نے
سب کا رنگ بہ رنگ ریشم مول لے لیا تاکہ لڑکی ان سب کی پٹیاں
بنا ڈالے۔

اب نورالدین نے گھر جاکر لڑکی کو سارا ریشم دے دیا اور کہا کہ
ان سب کی پیٹیاں بنا ڈال بلکہ مجھے بھی سکھا دے تاکہ میں بھی تیرے
ساتھ بیٹھ کر بناؤں، عمر بھر اس صنعت سے بہتر صنعت میری نظر سے
نہیں گزری اور نہ اس سے زیادہ فائدے مند۔ تجارت کرنے سے یہ
ہزار درجے بہتر ہی۔ اس کی باتیں سُن کر لڑکی ہنس پڑی اور کہنے لگی ای
میرے آقا نورالدین، اپنے دوست عطر فروش کے پاس جاکر بیس درہم
اور قرض لے آ اور کل پٹی کی قیمت میں سے یہ تیس اور پہلے کے پچاس
درہم ادا کر دیجیو۔ نورالدین نے عطر فروش کے پاس جاکر کہا چچا،

تیس درہم اور مجھے دے دے اگر خدا کو منظور ہے تو میں کل تمام اسی درہم لاکر
تجھے دے دوں گا۔ عطر فروش نے تیس درہم لاکر تول دیے۔ نورالدین انھیں
لے کر بازار گیا اور کل کی طرح گوشت روٹی، خشک اور تر میوہ اور عطر
خرید کر لڑکی کے پاس لے آیا۔ اس لڑکی کو پٹی والی مریم کہتے تھے۔ گوشت
لے کر اس نے فوراً پکایا اور عمدہ کھانا تیار کر کے اُسے اپنے آقا نورالدین
کے آگے لا رکھا۔ اس کے بعد اس نے شراب کا دسترخوان بچھایا دونوں
نے شراب پی، لڑکی بھر بھر کر اُسے پلاتی جاتی وہ اُسے پلاتا جاتا اور دونوں
ایک دوسرے سے باتیں چیتیں کرتے جاتے لڑکی اسے پیالہ دیتی اور کہتی
اسے بھر کر مجھے پلا اور جب وہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا تو وہ شرارت
سے ہٹ جاتی۔ نشے کی وجہ سے اس کا حسن وجمال دوبالا ہو گیا تھا، اسی
حالت میں نورالدین نشے میں آکر سو گیا اور لڑکی اٹھ کر دستور کے مطابق
پٹی بُننے کے کام میں لگ گئی۔ جب وہ بُن چکی تو اس نے اُسے ٹھیک
ٹھاک کر کے ایک کاغذ میں لپیٹ دیا اور اپنے کپڑے اُتار کر نورالدین
کے پہلو میں جا لیٹی اور سویرے تک سوتی رہی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی
دکھائی دی۔۔۔۔۔

آٹھ سو چھتّرویں رات

آٹھ سو چھتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
پٹی والی مریم نے پٹی بنا اُسے ٹھیک ٹھاک کر ایک کاغذ میں لپیٹ دیا
اور صبح تک نورالدین کے ساتھ سوتی رہی۔ جب نورالدین سو کر اٹھا اور

اپنی ضروریات سے فارغ ہو چکا تو لڑکی نے اسے پیٹی دی اور کہا اسے
کل کی طرح بیس دینار میں بیچ آ۔ وہ اسے لے کر بازار گیا اور بیس دینار
میں بیچ عطر فروش کے اسّی درہم ادا کر آیا، اس کی عنایت کا شکریہ ادا
کیا اور اسے دُعا دی۔ اس نے کہا بیٹا، کیا تو کنیز کو بیچ آیا؟ نور الدین
بولا تو مجھے بد دُعا دیتا ہے، میں کس طرح روح کو جسم سے نکال کر بیچ
سکتا ہوں! یہ کہہ کر اس نے شروع سے لے کر آخر تک سارا ماجرا کہہ سُنایا
بوڑھا عطر فروش بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا بیٹا، خدا کی قسم تو نے
مجھے دل شاد کر دیا، خدا نے چاہا تو تو ہمیشہ خیر و عافیت سے رہے گا۔
تیرے باپ کی محبّت کی وجہ سے میں ہمیشہ تیری بھلائی چاہتا ہوں۔
بوڑھے عطر فروش کے پاس سے رخصت ہو کر نور الدین فوراً بازار گیا
اور دستور کے موافق گوشت، میوے، شراب اور دوسری ضروری چیزیں
مول لے کر لڑکی کے پاس آیا۔ غرض کہ ایک سال تک دونوں اسی عیش
و عشرت سے زندگی بسر کرتے رہے، لڑکی ہر رات ایک پیٹی بناتی اور
نور الدین صبح ہوتے ہی اسے بیس دینار میں بیچ آتا اور ضرورت کے
مطابق اس میں سے خرچ کرتا، باقی لڑکی کے پاس اٹھا رکھتا تاکہ ضرورت
کے وقت کام آئے۔

ایک سال گزر گیا تو لڑکی نے کہا اے میرے آقا نور الدین، کل جب
تو پیٹی بیچ چکے تو اس کے داموں میں سے چھ رنگ کا ریشم الگ لیتا آئیو۔
میرے دماغ میں یہ خیال آیا ہے کہ میں تیرے لیے ایک رومال بنوں
جسے تو اپنے کندھے پر ڈالا کرے۔ ایسے رومال کی خوشی تاجر زادوں
کو تو در کنار شاہ زادوں کو بھی نصیب نہ ہوتی ہوگی۔ نور الدین نے بازار

جا کر پیٹی بیچی اور جس جس رنگ کا ریشم لڑکی نے کہا تھا خرید کر اس کے پاس لے آیا۔ مریم زنّاریہ ایک ہفتے تک اس کے بُننے میں مشغول رہی اس طرح سے کہ جب اسے پیٹی سے فرصت ملتی تو وہ رؤمال میں مشغول ہو جاتی۔ آخر اس نے رؤمال تیار کر کے نور الدین کو دے دیا، جب کبھی وہ اسے کندھے پر ڈال کر بازار میں نکلتا تو تاجر راہ چلنے اور شہر کے بڑے لوگ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے تاکہ اس رؤمال کا تماشہ دیکھیں۔ ایک رات جب کہ نور الدین سو رہا تھا اس کی آنکھ کھُل گئی دیکھا کہ لڑکی بلک بلک کر رو رہی ہے اس نے پوچھا اے میری آقا مریم، تو کیوں رو رہی ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ جدائی کے صدمے سے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ جدائی ہونے والی ہے۔ نور الدین نے کہا اے حسینوں کی سرتاج، کون ہے جو ہمیں جدا کر سکتا ہے کیوں کہ میں تجھے ساری دُنیا سے پیارا ہوں! لڑکی بولی میرا خیال اس سے بھی زیادہ ہے لیکن خوشی میں محو ہو جانا انسان کو ایک روز دُکھ دکھاتا ہے۔ اے میرے آقا نور الدین، اگر تیری یہ تمنا ہے کہ جدائی نہ ہو تو ایک فرنگی سے بچ کر رہیو جو دائیں آنکھ سے کانا اور بائیں پاؤں سے لنگڑا ہے، بوڑھا ہے، گندہ رنگ ڈاڑھی بھری ہوئی۔ وہی ہماری جدائی کا سبب ہوگا۔ میں نے اسے اس شہر میں آتے دیکھا ہے میرا خیال ہے کہ وہ میری ہی تلاش میں آیا ہوگا۔ نور الدین نے کہا اے حسینوں کی سرتاج، اگر میری نظر اس پر پڑ گئی تو میں اسے قتل کر دوں گا تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ مریم بولی اے میرے آقا، نہ قتل کیجیو نہ اسے منھ لگائیو نہ اس سے لین دین کیجیو نہ کوئی معاملہ کیجیو نہ اس کے پاس بیٹھیو نہ اس کے ساتھ چلیو اور نہ اس سے کوئی

بات کیجیو بلکہ شرعی جواب تک نہ دیجیو۔ اب خدا سے دُعا کر کہ وہ ہمیں اس کی بُرائی اور مکر سے بچائے ۔

دن نکلا تو نورالدین پیٹی لے کر بازار گیا اور ایک دُکان کے چبوترے پر بیٹھ کر تاجر زادوں سے باتیں کرنے لگا اتنے میں اُسے نیند کا ایک جھونکا آیا اور وہ وہیں چبوترے پر سو گیا۔ اسی وقت اتفاق سے فرنگی سات اور فرنگیوں کو لیے اِدھر سے گُزرا، دیکھا کہ نورالدین رؤمال سے منہ ڈھانکے دُکان کے چبوترے پر سو رہا ہے اور اس کا ایک کنارہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ فرنگی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور رؤمال کا ایک کونا پکڑ کر اسے دیر تک الٹتا پلٹتا رہا۔ آہٹ سے نورالدین جاگ اٹھا دیکھا کہ وہی فرنگی جس کا ذکر لڑکی نے کیا تھا اس کے سرہانے بیٹھا ہے نورالدین نے اس زور سے اسے ڈانٹا کہ وہ سہم گیا۔ فرنگی بولا تو ہمیں کیوں ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے؟ کیا ہم نے تیری کوئی چیز لے لی ہے؟ نورالدین نے کہا اے ملعون، خدا کی قسم اگر تو نے میری کوئی چیز لے لی ہوتی تو میں تجھے والی کے پاس لے جاتا۔ بولا اے مسلمان! تجھے اپنے دین ایمان کی قسم بتا کہ یہ رؤمال تجھے کہاں سے ملا؟ نورالدین نے کہا: میری ماں نے بنایا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . . .

آٹھ سو ستّرویں رات

آٹھ سو ستّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب فرنگی نے نورالدین سے پُوچھا کہ رؤمال کس نے بنایا ہے تو اس نے

جواب دیا کہ میری ماں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ فرنگی نے کہا اسے میرے ہاتھ بیچ ڈال اور مجھ سے دام لے لے۔ نورالدین بولا ای ملعون، خدا کی قسم نہ اسے میں تیرے ہاتھ بیچوں گا نہ کسی اور کے ہاتھ، ماں نے یہی ایک رؤمال بنایا ہے اور وہ بھی میرے نام پر۔ فرنگی نے کہا میرے ہاتھ بیچ ڈال میں ابھی اس کی قیمت پانسو دینار ادا کیے دیتا ہوں، تو جاکر اپنی ماں سے اس سے بہتر بنوا لیجیو۔ نورالدین بولا میں اسے ہرگز نہیں بیچ سکتا کیوں کہ اس کا جواب شہر بھر میں نہیں۔ فرنگی نے کہا ای میرے آقا، کیا تو خالص سونے کے چھ سو دینار میں بھی نہ بیچے گا؟ فرنگی اسی طرح سَو سَو دینار بڑھاتا رہا یہاں تک کہ نو سو دینار لگا دیے۔ نورالدین بولا کہ بے اس کے بکے خدا میری حاجت روائی کردے گا، میں اسے ہرگز ہرگز نہیں بیچوں گا خواہ تو دو ہزار دینار ہی کیوں نہ لگائے۔ فرنگی نورالدین کو لالچ دِلاتا دِلاتا ایک ہزار دینار تک پہنچ گیا۔ چند تاجر بولے کہ ہم تیرے ہاتھ یہ رؤمال بیچتے ہیں، لا دام نکال۔ نورالدین بولا خدا کی قسم میں تو نہیں بیچوں گا۔ ایک تاجر نے کہا، بیٹا، اس رؤمال کی قیمت زیادہ سے زیادہ سَو دینار ہو سکتی ہے بہ شرطے کہ کوئی قدردان مل جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ دینے کے لیے بھی تیار ہو، یہ فرنگی تو تجھے ایک ہزار دینار دے رہا ہے، اس میں تجھے نو سو دینار کا فائدہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتا ہے؟ میری رائے میں تو اس رؤمال کو ایک ہزار میں بیچ ڈال اور جس نے یہ رؤمال بنایا ہے ایسا ہی اس سے دؤسرا بنوا لے یا اس سے بھی اچھّا اور اس ملعون، دین کے دشمن سے ایک ہزار دینار کھرے کر لے۔

تاجروں کی شرم کے مارے نورالدین نے وہ رومال فرنگی کے ہاتھ ایک ہزار دینار میں بیچ ڈالا اور فرنگی نے سب کے سامنے دام نکال کر دے دیے۔ نورالدین چاہتا ہی تھا کہ مریم کے پاس جا کر اسے فرنگی کا ماجرا سنائے کہ فرنگی نے کہا ای تاجرو، نورالدین کو ابھی جانے نہ دینا، تم اور وہ سب آج رات میرے مہمان ہو، میرے پاس پرانی رومی شراب کا ایک پیپا ہے، ایک موٹا تازہ دُنبہ، خشک اور تر میوے اور خوش بوئیں۔ آج رات کے لیے تم سب میری دعوت قبول کرو ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک بھی رہ جائے۔ تاجروں نے کہا ای ہمارے آقا نورالدین، ایسی دعوت میں ہماری خواہش ہے کہ تو بھی ہمارے ساتھ ہو تاکہ ہم باتیں چیتیں کر سکیں۔ مہربانی کر کے ہمارے ساتھ چل اس فرنگی نے ہم سب کو دعوت دی ہے اور وہ بڑا سخی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اسے طلاق کی قسم دے کر کہا کہ گھر نہ جا، اور انھوں نے اپنی دُکانیں بند کر کے نورالدین کو ساتھ لیا اور فرنگی کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور اس کے ہاں ایک کمرے میں پہنچے جو صاف ستھرا اور بڑا تھا جس کے اندر دو چبوترے تھے۔ فرنگی نے انھیں وہاں بٹھایا، ان کے آگے ایک عجیب و غریب کاری گری کا دسترخوان بچھایا جس میں فاتح اور مفتوح، عاشق اور معشوق، بھیک مانگنے والے اور دینے والے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس دسترخوان پر فرنگی نے چینی اور بلور کے عمدہ عمدہ برتن رکھے جن میں نفیس نفیس میوے اور خوش بوئیں تھیں ایک پیپا پرانی رومی شراب کا لے آیا اور ایک موٹی تازی بھیڑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا، وہ آگ جلا کر گوشت بھونتا، تاجروں کو کھلاتا

اس کے ساتھ شراب پلاتا جاتا اور ان سے اشارے سے کہتا جاتا کہ نورالدین کو بھی پلاؤ۔ تاجر اسے خوب شراب پلاتے رہے یہاں تک کہ نورالدین مست ہو گیا۔ جب فرنگی نے دیکھا کہ وہ نشے میں چور ہے تو اس سے کہنے لگا ای میرے آقا نورالدین، آج رات تو نے ہمیں بہت خوش کیا، مرحبا مرحبا!

اسی طرح فرنگی اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر تھوڑی دیر تک اسے اپنی باتوں میں محو رکھا پھر کہنے لگا ای میرے آقا نورالدین، کیا تو وہ کنیز میرے ہاتھ بیچنا چاہتا ہے جسے تو نے ایک سال ہوا کہ انھیں تاجروں کے سامنے ایک ہزار دینار میں خریدا تھا۔ میں اس کی قیمت پانچ ہزار دینار دینے کے لیے تیار ہوں یعنی چار ہزار زیادہ۔ نورالدین نے انکار کر دیا لیکن فرنگی اسے برابر کھلاتا پلاتا اور مال کا لالچ دلاتا رہا یہاں تک کہ دس ہزار تک دام لگا دیے۔ نورالدین نشے میں تو تھا ہی تاجروں کے سامنے بول اٹھا کہ ہاں بیچتا ہوں، لا دس ہزار دینار۔ یہ سُن کر فرنگی خوش ہو گیا اور تاجروں سے کہا گواہ رہنا۔ رات بھر اسی طرح کھانا پینا، ہنسی مذاق رہا اور جب صبح ہوئی تو فرنگی نے غلاموں کو بلا کر کہا کہ دینار لاؤ۔ وہ لائے تو اس نے دس ہزار دینار گن کر اسے نقد دے دیے اور کہا ای میرے آقا نورالدین، یہ دینار اپنی تحویل میں لے، یہ تیری اس کنیز کی قیمت ہے جو تو نے رات ان مسلمان تاجروں کے سامنے میرے ہاتھ بیچی ہے۔ نورالدین بولا ای ملعون، میں نے تیرے ہاتھ کچھ نہیں بیچا، تو مجھ پر بہتان لگاتا ہے، میرے پاس کنیزیں کہاں سے آئیں! فرنگی نے کہا

تو نے واقعی اپنی کنیز میرے ہاتھ بیچی ہے اور اس سودے کے یہ تاجر گواہ ہیں۔ تمام تاجروں نے کہا ہاں اے نورالدین، تو نے ہمارے سامنے اپنی کنیز کو بیچا ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو نے کنیز کو اس کے ہاتھ دس ہزار دینار میں فروخت کر دیا ہے۔ اُٹھ اور دام لے کر کنیز کو اس کے حوالے کر دے، خدا اس کے بدلے اس سے بہتر تجھے دے گا۔ اے نورالدین یہ کیا بُرا سودا ہے کہ تو نے ایک کنیز ایک ہزار دینار میں مول لی ڈیڑھ سال تک اس کے حسن و جمال کا مزا اُڑایا، دن رات اس کی صحبت میں حظ اٹھاتا اور وصال کا شربت پیتا رہا اور پھر اس کی اصلی قیمت پر نو ہزار دینار کا فائدہ مل رہا ہے! علاوہ بریں وہ ہر روز تیرے لیے ایک پیٹی بناتی تھی جسے تو بیس دینار میں بیچتا تھا۔ ان تمام باتوں کے بعد بھی تو بیچنا پسند نہیں کرتا اور اس فائدے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس فائدے سے بڑھ کر آخر کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور اس لین دین سے زیادہ اور کون سا لین دین ہے! مانا کہ تجھے اس سے محبت تھی لیکن اس مدت میں اس سے سیر ہو چکا ہو گا، لہٰذا دام لے لے اور جا کر اس سے اچھی کنیز مول لے آ۔ اگر تو چاہتا ہے تو ہم اپنی کسی بیٹی سے تیری شادی کر دیں گے اور اس کے آدھے سے کم مہر لیں گے باقی آدھے تیرے پاس بہ طور پونجی کے رہیں گے اور وہ لڑکی بھی اس سے زیادہ حسین ہو گی۔

غرض کہ تاجر نورالدین کے ساتھ نرمی سے باتیں کرتے اور اسے پھسلاتے رہے یہاں تک کہ اس نے کنیز کے بدلے دس ہزار دینار لے لیے۔ فرنگی نے فوراً قاضیوں اور گواہوں کو بلوایا۔ انھوں

سے نے نورالدین کی طرف سے اس کنیز کا بیع نامہ لکھ دیا جس کا نام مریم زناریہ تھا۔ اِدھر تو نورالدین پر یہ گزر رہی تھی اُدھر مریم زناریہ دن بھر بیٹھی شام تک اپنے آقا کا انتظار کرتی رہی پھر شام سے لے کر آدھی رات تک اور بہت پریشان ہوئی رونے لگی۔ اُس کے رونے کی آواز بوڑھے عطرفروش کے کان میں پڑی تو اس نے اپنی بیوی کو اس کے پاس بھیجا۔ بیوی نے جا کر دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، وہ کہنے لگی ای میری آقا تو کیوں رو رہی ہے؟ لڑکی بولی اماں، میں بیٹھی اپنے آقا نورالدین کی راہ دیکھ رہی ہوں لیکن وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری خاطر کسی نے اس پر کوئی چال نہ چلی ہو اور اس نے دھوکے میں آ کر مجھے بیچ نہ ڈالا ہو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو اٹھتّرویں رات

آٹھ سو اٹھتّرویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! مریم نے عطرفروش کی بیوی سے کہا کہ کہیں اس نے دھوکے میں آ کر مجھے بیچ نہ ڈالا ہو۔ عطرفروش کی بیوی بولی ای میری مریم آقا! اُسے تو تجھ سے اتنا پیار ہے کہ اگر کوئی اُسے اتنا سونا دے کہ یہ کوٹھڑی بھر جائے پھر بھی وہ تجھے نہیں بیچے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ قاہرہ سے اس کے والدین کے پاس سے آئے ہوں اور اس نے ان کی دعوت وہیں کر دی ہو جہاں وہ اُترے ہوں اور انھیں یہاں لانے سے وہ شرماتا ہو کیوں کہ یہ مکان اُن کے لیے چھوٹا ہے، یا وہ کم درجے کے لوگ ہوں جنھیں وہ گھر میں لانا

مناسب نہ سمجھتا یا تیرا حال ان سے چھپانا چاہتا ہو اور رات کو انھی کے پاس رہ گیا ہو۔ خدا نے چاہا تو کل وہ بہ خیریت یہاں آجائے گا۔ ای میری آقا، تو بالکل رنج نہ کر، اس کے نہ آنے کا یہی سبب ہوگا۔ میں آج رات تیرے پاس سوؤں گی اور تیرے آقا کے آنے تک تجھے تسلّی دوں گی۔ اس کے بعد عطر فروش کی بیوی مریم کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی اور اسے تسلّی دیتی رہی یہاں تک کہ رات ختم ہوگئی۔ صبح ہوتے مریم نے دیکھا کہ نورالدین گلی میں داخل ہوا اور اُس کے پیچھے پیچھے وہ فرنگی ہو اور ارد گرد دوسرے تاجر۔ انھیں دیکھتے ہی مریم کانپنے لگی اس کا چہرہ زرد پڑگیا اور وہ اس طرح کانپنے لگی جیسے طوفان کے وقت سمندر میں کشتی۔ عطر فروش کی بیوی نے اسے دیکھ کر کہا ای میری آقا مریم، تجھے کیا ہوا کہ تیری حالت بدل گئی، چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں؟ لڑکی نے کہا ای میری آقا، مجھے معلوم ہوتا ہو کہ جدائی کی گھڑی آگئی۔

یہ کہہ کر لڑکی سسکیاں بھرنے لگی اور اتنا روئی کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اُسے جُدائی کا بالکل یقین آگیا اور وہ عطر فروش کی بیوی سے کہنے لگی ای میری آقا، میں نے تجھ سے کہا نہ تھا کہ میرے بیچنے کے بارے میں نورالدین پر کوئی چال چلی گئی ہو۔ مجھے یقین ہو کہ اس نے رات کو مجھے اس فرنگی کے ہاتھ بیچ ڈالا، حالاں کہ میں نے اسے خبردار کردیا تھا۔ لیکن قسمت کے لکھے کے آگے خبرداری کام نہیں کرتی۔ تجھے معلوم ہوگیا نہ کہ میں ٹھیک کہتی تھی۔ وہ دونوں یہ باتیں کرہی رہی تھیں کہ نورالدین مریم کے پاس پہنچا، مریم نے دیکھا کہ اس کا رنگ فق ہوگیا ہو، وہ کانپ رہا ہو اور اس کے چہرے سے غم اور پشیمانی ٹپک رہی ہو اور وہ کہنے لگی ای میرے آقا

نورالدین، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ تو نے مجھے بیچ ڈالا۔ یہ سُن کر وہ رونے، ٹھنڈے سانس بھرنے اور آہیں کھینچنے لگا، لڑکی کے آگے معذرت کی اور کہنے لگا ای میری آقا! جو کچھ قسمت میں بدا تھا ہو گیا۔ تیرے بیچنے کے بارے میں لوگ مجھ پر چال چل گئے اور میں نے تجھے بیچ ڈالا۔ واقعی تیرے حق میں میں نے بڑا گناہ کیا، لیکن ممکن ہو کہ جس خدا نے جدائی کا حکم دیا ہو وہی ہمیں پھر ملا کر ہم پر احسان کرے۔ لڑکی بولی، میں نے تجھے اس سے خبردار کر دیا تھا لیکن تو خبردار نہ ہوا۔ یہ کہہ کر لڑکی نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی چومنے لگی۔

اتنے میں فرنگی اُن کے پاس پہنچ گیا اور بڑھ کر شہزادی مریم کے ہاتھ چومنے چاہے کہ لڑکی نے اس کے منھ پر ایک طمانچہ مارا اور کہا دور ہو ای ملعون، آخر تو میرے پیچھے لگا ہی رہا یہاں تک کہ تو نے میرے آقا کو دھوکا دے دیا لیکن ای ملعون، خدا نے چاہا تو اس میں بہتری ہو گی۔ یہ سُن کر فرنگی ہنس پڑا، اس کی حرکت پر تعجب کرنے لگا اور معذرت کرتے ہوئے بولا ای میری آقا مریم، میں نے کیا گناہ کیا؟ تیرے آقا نورالدین ہی نے تو تجھے اپنی مرضی سے میرے ہاتھ بیچا ہو۔ مسیح کی قسم اگر اسے تجھ سے محبت ہوتی تو کبھی یہ حرکت نہ کرتا اور اگر وہ تجھ سے اپنا مقصد پورا نہ کر چکا ہوتا تو تجھے ہرگز نہ بیچتا۔

یہ لڑکی افرنجہ کے بادشاہ کی بیٹی تھی، افرنجہ بہت بڑا شہر ہو اور قسطنطنیہ کی طرح کاری گری کا مرکز، اس میں عجیب و غریب چیزیں پائی جاتی ہیں اور بہت پیداوار ہوتی ہو۔ لڑکی کے اس شہر کو چھوڑنے کی وجہ نہایت عجیب و غریب ہو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . . .

آٹھ سو اناسیویں رات

آٹھ سو اناسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ!
لڑکی کے اپنے ماں باپ کے شہر کو چھوڑنے کی وجہ عجیب و غریب ہے اور وہ
یہ ہے کہ اس کی تربیت ماں باپ کے پاس نہایت اچھے طریقے سے ہوئی
تمام دست کاریاں اس نے سیکھیں، مثلاً زردوزی، سینا پرونا، بُننا، پٹی
بناتا، بساط خانے کا سامان بنانا اور سونے پر چاندی اور چاندی پر سونے
کی پچی کاری کرنا، علاوہ اس کے فصاحت، لکھنا پڑھنا، حساب کتاب،
شہ سواری اور شمشیر زنی، غرض کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے علوم و
فنون سیکھے یہاں تک کہ وہ اپنے زمانے میں یکتا ہو گئی۔ اس پر خدا نے
اسے اتنا حُسن و جمال دیا تھا کہ اس کا جواب دُنیا میں ملنا ناممکن تھا۔ جب
جزیروں کے بادشاہوں نے اس کی شادی کی درخواستیں بھیجیں تو اس
کے باپ نے انکار کر دیا کیوں کہ وہ اسے بے حد پیار کرتا تھا اور دم بھر
بھی اس کی جدائی اس کو گوارا نہ تھی۔ اس کے علاوہ باپ کی اور کوئی
بیٹی بھی نہ تھی بیٹے کئی تھے لیکن وہ بیٹوں سے زیادہ بیٹی کو چاہتا تھا۔
ایک بار وہ اتنی بیمار ہوئی کہ مرنے کے قریب پہنچ گئی، اس نے نذر مانی کہ
اگر میں اچھی ہو گئی تو فلاں دیر کی زیارت کو جاؤں گی جو فلاں جزیرے
میں ہے۔ یہ دیر ان کے نزدیک بڑے درجے کا تھا اور لوگ تبرکاً نیاز مانا
کرتے تھے۔ مریم اچھی ہو گئی تو اس نے ارادہ کیا کہ اپنی نذر پوری کرے
اُس کے باپ افرنجہ کے بادشاہ نے اسے ایک چھوٹی سی کشتی میں بٹھا
کر دیر کو روانہ کر دیا اور اس کی خدمت کے لیے شہر کی بعض شہزادیاں

اور بطریق ساتھ کردیے۔

جب مریم اس دیر کے قریب پہنچی تو مسلمانوں کے ایک جہاز نے حملہ کردیا جس میں وہ مسلمان تھے جو خدا کی راہ میں جہاد کرتے پھرتے تھے۔ انھوں نے کشتی میں سے بطریقوں، لڑکیوں اور مال و دولت کو لے کر قیروان میں جا بیچا اور مریم ایک عجمی تاجر کے ہاتھ بک گئی۔ یہ عجمی نامرد تھا اور وہ مریم سے محض اوپری خدمت لیا کرتا۔ ایک بار یہ عجمی اتنا بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب پہنچ گیا اور کئی مہینے تک بیمار رہا۔ اس بیماری میں مریم نے اس کی اتنی خدمت کی کہ خدا نے اسے اچھا کردیا۔ اچھا ہوگیا تو عجمی نے اس بات کا احساس کیا کہ مریم نے کس شفقت اور محبت سے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی اور اس کے اس احسان کا بدلہ دینا چاہا اور پوچھا کہ مریم، مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے جواب دیا اے میرے آقا، میں یہ چاہتی ہوں کہ تو مجھے ایسے شخص کے ہاتھ بیچ دے جسے میں چاہتی ہوں۔ عجمی نے کہا بہت خوب، یہ تیرا حق میرے اوپر ہے؛ خدا کی قسم اے مریم، میں تجھے اسی شخص کے ہاتھ بیچوں گا جسے تو پسند کرے، تیرا بیچا جانا تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ عجمی نے اس کے آگے اسلام پیش کیا وہ مسلمان ہوگئی، اسے نماز سکھائی اور اس نے اس مدت میں اسلام کی تمام باتیں سیکھیں۔ عجمی نے اسے قرآن حفظ کرایا، فقہ اور حدیث پڑھائی اور اسکندریہ لاکر اسے ایسے شخص کے ہاتھ بیچا جسے وہ چاہتی تھی اور وہ یہی علی نورالدین تھا جس نے اسے خریدا تھا۔

یہ تو مریم کے وطن سے نکلنے کا قصہ ہوا، اب اس کے باپ افرنجہ

کے بادشاہ کا حال سنو۔ یہ سنتے ہی کہ بیٹی اور اس کے ساتھیوں پر کیا گزری ہر قیامت بپا ہو گئی، اس نے فوراً اس کی تلاش میں جہاز روانہ کیے اور ان کے ساتھ بطریق، شہ سوار اور بہادر پیادے بھیجے۔ انھوں نے مسلمانوں کے جزیروں میں اُسے بہت تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتا نہ چلا وہ شکستہ دل ہو کر نہایت افسوس کے ساتھ اس کے باپ کے پاس لوٹ آئے۔ باپ کو نہایت صدمہ پہنچا اور پھر اس نے بیٹی کی تلاش میں اسی شخص کو بھیجا جو دائیں طرف سے کانا اور بائیں طرف سے لنگڑا لیکن اس کا بڑا وزیر تھا، حد درجے کا چالاک اور بڑی کاٹ چھانٹ کا آدمی، اور اُسے حکم دیا کہ مسلمانوں کے تمام ملکوں میں شہزادی کو تلاش کرے اگر کشتی بھر سونے کے بدلے بھی وہ مل سکے تو اسے خرید لائے۔ اس ملعون نے سمندر کے تمام جزیروں اور ہر بڑے شہر میں اُس کی تلاش کی کہیں سراغ نہ ملا۔ بالآخر وہ اسکندریہ پہنچا اُسے خبر ملی کہ شہزادی قاہرہ والے نورالدین علی کے پاس ہے۔ اس کے بعد جو ماجرا پیش آیا معلوم ہے یعنی رومال کے ذریعے سے اس کا پتا لگا کر جو اس خوبی کے ساتھ اور کوئی نہ بنا سکتا تھا اس نے دھوکے سے اسے خرید لیا۔ اس کی خبر اس نے تاجروں کو پہلے سے دے دی تھی اور ان سے مل کر وہ یہ چال چلا تھا۔ جب شہزادی اس کے پاس پہنچی تو وہ برابر روتی اور آہیں بھرتی رہی۔ وزیر نے کہا اے میری آقا، رونا پیٹنا جانے دے اور وہاں چل جہاں تیرے باپ کا ملک، تیری حکومت اور عزت کی جگہ اور تیرا وطن ہے تاکہ تو اپنے نوکروں اور غلاموں کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اس ذلت اور غربت کو خیر باد کہہ، تیری وجہ سے جو سفر کی تکلیف

مجھے اٹھانی پڑی اور جو خرچ ہوا وہ بہت کافی ہے۔ ڈیڑھ سال سے برابر تکلیفیں اٹھا رہا اور خرچ کر رہا ہوں۔ تیرے باپ نے حکم دیا ہے کہ اگر کشتی بھر سونا بھی صرف ہو جائے تو میں تجھے خرید کر ضرور لے آؤں۔

غرض افرنجہ کے بادشاہ کا وزیر اس کے قدم چومتا اور اس کی خوشامد کرتا رہا لیکن وہ برابر ناراض ہوتی اور یہی کہتی رہی کہ ای مردود، خدا تجھے ہمیشہ نامراد رکھے! اتنے میں غلام ایک خچر لے آئے جس پر زردوزی کی زین پڑی ہوئی تھی شہزادی کو اس پر سوار کر دیا، اس کے اوپر ریشم کی ایک چھتری لگالی جس کے ڈنڈے سونے اور چاندی کے تھے، اور فرنگی اس کے ارد گرد ہو لیے یہاں تک کہ وہ باب البحر سے نکل آئی۔ یہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی ناؤ پر سوار کیا اُسے کھیتے ہوئے بڑے جہاز کے پاس پہنچے اور شہزادی کو اس میں سوار کر دیا۔ اس کے بعد کانا وزیر جہاز پر آیا اور ملاحوں سے کہا کہ لنگر اٹھا دو۔ انھوں نے فوراً لنگر اٹھا کر بادبان کھول دیے اور چپّو مارنے لگے جہاز چل دیا۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر مریم کی نظر اسکندریہ کی طرف لگی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ وہ آنکھوں سے اوٹ ہو گیا اور مریم دل ہی دل میں کُڑھنے اور رونے لگی اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو اٹھائیسویں رات

آٹھ سو اٹھائیسویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! مریم زنّاریہ برابر اسکندریہ کی طرف دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ نظر

سے اوٹ ہوگیا۔ اس کے بعد بھی وہ اسے یاد کرکر کے روتی رہی۔ بطریق اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے لیکن وہ نہ مانتی اور اپنے خیال میں محو رہتی۔ راہ بھر اُس کی یہی حالت رہی کہ اسے چین آتا نہ صبر۔

یہ تو مریم اور کانے لنگڑے وزیر کا ماجرا ہوا، اب نورالدین علی مصری کا حال سنو۔ جب مریم جہاز پر سوار ہوکر روانہ ہوگئی تو دنیا اسے تنگ معلوم ہونے لگی۔ دل اور آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اس گھر سے ہیں گیا جہاں وہ مریم کے ساتھ رہتا تھا وہ اس کو سیاہ اور تاریک نظر آیا۔ وہاں اس نے وہ سامان بھی دیکھے جن سے وہ پیٹیاں بنایا کرتی، وہ کپڑے بھی جو وہ پہنتی اس نے انھیں اپنے سینے سے لگا لیا، اس کے آنسو بہنے لگے وہ اتنا رویا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ اٹھا دروازے میں قفل ڈال کر سمندر کی طرف چل کھڑا ہوا اور اس جگہ کو دیکھ دیکھ کر جہاں سے جہاز اُسے لے کر روانہ ہوا تھا رونے پیٹنے اور یا مریم یا مریم پکارنے لگا اور کہا کہ کیا میں نے تجھے محض خواب میں دیکھا تھا؟ نورالدین اسی طرح روتا اور مریم مریم چلاتا تھا کہ ایک بوڑھا ایک کشتی میں سے نکل کر اس کے پاس آیا اور کہنے لگا بیٹا، شاید تو اس لڑکی پر روتا ہے جو کل فرنگی کے ساتھ گئی ہے۔ بوڑھے کی یہ بات سنتے ہی نورالدین غش کھا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو بلک بلک کر رونے لگا۔ بوڑھے نے دیکھا کہ نورالدین نہایت حسین وجمیل، خوش قد، بدن کا سڈول اور خوش بیان ہے تو اسے اس پر ترس آگیا۔ یہ بوڑھا ایک جہاز کا ناخدا تھا جو اسی لڑکی کے شہر کو جانے والا تھا اور جس میں سو مومن مسلمان تاجر تھے، وہ کہنے لگا صبر کر، آئندہ تیرے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ خدا کو منظور ہے تو میں

تجھے اُس تک پہنچا دوں گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو اکیاسیویں رات

آٹھ سو اکیاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ!
بوڑھے نے کہا کہ خدا کو منظور ہی تو میں تجھے اس تک پہنچا دوں گا تو نورالدین نے پوچھا کہ کب تک روانگی ہوگی؟ ناخدا بولا تین دن اور باقی ہیں، پھر اگر ہم سب بخیریت رہے تو چل دیں گے۔ ناخدا کی یہ باتیں سُن کر نورالدین بہت خوش ہوا اور اُس کے احسان اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اُسے وصال کے دن اور اس بے نظیر لڑکی کی صحبت یاد آنے لگی اور وہ زار زار رونے لگا۔ اس کے بعد نورالدین بازار گیا، کھانے پینے اور سفر کی تمام ضروری چیزیں لاکر ناخدا کے پاس پہنچا۔ ناخدا نے کہا بیٹا، تیرے پاس یہ کیا ہو؟ اس نے کہا کہ راہ کے لیے کھانا پینا اور سفر کی باقی ضروریات۔ یہ سُن کر ناخدا ہنس پڑا اور کہنے لگا بیٹا، اپنے خیال میں تو عمود الصواری کی سیر کرنے جارہا ہو، تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں تو جانا چاہتا ہو دو مہینے کی راہ ہو، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ہوا موافق اور مطلع صاف ہو۔ یہ کہہ کر بوڑھے نے نورالدین سے کچھ دام لیے اور بازار جاکر اتنی چیزیں خرید لایا کہ اس کے لیے سفر میں کافی ہوں اور ایک پیپا میٹھے پانی کا بھر لایا۔ اب نورالدین تین دن جہاز میں بیٹھا رہا یہاں تک کہ تاجر تیار ہوگئے اور ضرورت کی چیزیں لاکر جہاز میں بیٹھ گئے۔ ناخدا نے لنگر اٹھا دیے اور جہاز اکیاون دن تک چلتا رہا۔ جہاز امن کے ساتھ چلا جارہا

تھا کہ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا، جہاز لوٹ لیا، تمام مسافروں کو پکڑ کر افرنجہ لے گئے اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا، نورالدین بھی انھی میں تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ ان سب کو قید خانے بھیج دیا جائے۔

یہ لوگ بادشاہ کے پاس سے قید خانے کی طرف جا رہے تھے کہ جنگی جہاز آ پہنچا جس میں مریم زنّاریہ اور کانا وزیر تھا۔ جب یہ جہاز کنارے آ کر لگا تو وزیر اُتر کر بادشاہ کے پاس گیا اور خوش خبری دی کہ اس کی بیٹی مریم زنّاریہ صحیح و سلامت آ گئی ہے۔ شادیانے بجنے لگے، شہر خوب سجایا گیا بادشاہ تمام لشکر اور امرا کے ساتھ سوار ہو کر بیٹی کے خیر مقدم کے لیے سمندر کی طرف چلا۔ مریم جہاز سے اُتری تو باپ نے اُسے گلے لگا لیا، سلام کیا۔ بیٹی نے باپ کو سلام کیا بادشاہ نے گھوڑا منگوایا وہ سوار ہو کر محل پہنچی۔ ماں نے اس کا خیر مقدم کیا اُسے گلے لگایا سلام کیا اس کی خیریت پوچھی اور یہ کہ تو اب تک پہلے کی طرح باکرہ ہے یا عورت ہو چکی ہے؟ مریم نے جواب دیا اماں جان، جب کوئی لڑکی مسلمانوں کے ملکوں میں ایک تاجر کے ہاتھ سے دوسرے تاجر کے ہاتھ بکتی پھرے اور محکوم ہو کر رہے تو کیسے باکرہ رہ سکتی ہے! جس تاجر نے مجھے پہلے خریدا اس نے ڈرا دھمکا کر میری بکارت زائل کر دی اور دوسرے تاجر کے ہاتھ بیچ ڈالا، پھر اس نے ایک اور تاجر کے ہاتھ۔ اس کی یہ بات سن کر ماں کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ماں نے اس کے باپ سے یہ ماجرا بیان کیا تو وہ بھی ہاتھ ملنے لگا، اس نے امرا اور بطریقوں سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اے بادشاہ! مسلمانوں نے اسے نجس کر دیا ہے اور یہ اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ سنو مسلمانوں کی گردن نہ اُڑا دی جائے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ مسلمان قیدی جو قید خانے میں ہیں حاضر کیے جائیں۔ وہ لائے گئے تو نورالدین بھی ان میں تھا۔ بادشاہ نے حکم دے دیا کہ ان کی گردنیں اُڑادی جائیں۔ سب سے پہلے ناخدا کی گردن اُڑائی گئی پھر ایک ایک کر کے تمام تاجروں کی، سوا نورالدین کے اور کوئی باقی نہ رہا۔

اب انھوں نے نورالدین کے دامن میں سے ایک پٹی پھاڑی اس کی آنکھیں باندھ کر اسے قتل کی چٹائی پر لے گئے اور چاہتے ہی تھے کہ اس کی گردن اُڑادیں کہ ایک بڑھیا بادشاہ کے پاس پہنچی اور کہنے لگی ای میرے مالک، تو نے نذر مانی تھی کہ اگر تیری بیٹی مریم کو خدا واپس لے آئے تو تو ہر گرجا کی خدمت کے لیے پانچ پانچ مسلمان قیدی دے گا۔ اب چوں کہ تیری بیٹی آگئی ہو اپنی نذر پوری کر۔ بادشاہ نے کہا والدہ، مسیح اور اس کے سچے دین کی قسم اس وقت میرے پاس قیدیوں میں سے محض یہ قیدی بچا ہو، اسے لے جا تاکہ وہ گرجا کی خدمت میں تیری مدد کرے۔ جب اور مسلمان قیدی آئیں گے تو میں چار اور بھیج دوں گا۔ اگر تو ان کے قتل سے پہلے آتی ہوتی تو جتنے تو چاہتی میں دے دیتا۔

بڑھیا نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور دُعا دی کہ خدا اس کی عزت، بقا اور نعمتیں قائم رکھے! پھر فوراً نورالدین کی طرف بڑھ کر اُسے خونی چٹائی پر سے لے آئی، دیکھا کہ وہ خوش رو اور خوش قد جوان ہو۔ اس کا چہرہ ایسا ہو جیسا چودھویں رات کا چاند۔ بڑھیا اسے لے کر گرجا کی طرف روانہ ہو گئی اور اس سے کہا بیٹا، اپنے یہ کپڑے اُتار

ڈال کیوں کہ ان کپڑوں میں تو بادشاہ کی خدمت کی جاتی ہے۔ یہ کہہ کر بڑھیا نورالدین کے لیے ایک کالا اونی جبّہ، ایک کالا اونی عمامہ اور ایک چوڑی پٹی لے آئی، اُسے وہ جبّہ پہنایا، عمامہ باندھا، پٹی کمر میں لگائی اور اس سے کہا اب گرجا کی خدمت کر، اس نے سات دن تک خدمت کی۔ ساتویں دن جب کہ وہ خدمت کر رہا تھا بڑھیا آئی اور کہنے لگی ای مسلمان، تو اپنے ریشمی کپڑے پہن لے، یہ دس درہم لے اور فوراً سیر کرنے چلا جا یہاں بالکل نہ ٹھیر ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔ نورالدین نے کہا اماں، کیا بات ہے؟ بڑھیا بولی بیٹا، سُن، بادشاہ کی بیٹی شہزادی مریم زنار یہ ابھی گرجا میں آنے والی ہے تاکہ اس کی زیارت کرے، تبرک حاصل کرے اور اس خوشی میں کہ وہ مسلمانوں کے ملک سے چھوٹ کر آئی ہے چڑھاوا چڑھائے اور نیاز کرے کیوں کہ مسیح نے اسے نجات دی۔ اس کے ساتھ چار سو لڑکیاں اور آئیں گی جو حسن و جمال میں یکتا ہیں، منجملہ ان کے وزیرزادی اور دیگر امرا زادیاں ہیں۔ وہ سب ذرا دیر میں آنے والی ہیں، اگر انھوں نے تجھے کہیں دیکھ پایا تو تجھے تلواروں سے کاٹ کر پھینک دیں گی۔ نورالدین نے اپنے کپڑے پہن کر بڑھیا سے دس درہم لیے اور بازار جا کر شہر کی گلیوں کی سیر کرنے لگا تاکہ اُسے شہر کی سمتیں اور دروازے معلوم ہو جائیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی۔۔۔

آٹھ سو بیاسیویں رات

آٹھ سو بیاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ!

نورالدین اپنے کپڑے پہن، بڑھیا سے دس درہم لے بازار چلتا ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد گرجا لوٹ آیا، دیکھا کہ بادشاہ زادی مریم زناریہ چار سو باکرہ لڑکیوں کے ساتھ جو چاندی کی طرح خوب صورت ہیں گرجا میں آئی، منجملہ ان کے کانے وزیر کی بیٹی اور دیگر امرا کی بیٹیاں ہیں اور وہ ان کے درمیان اس طرح چل پھر رہی ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ جوں ہی نورالدین کی نظر اس پر پڑی تو اس سے نہ رہا گیا، بے تاب ہو کر بے ساختہ یا مریم یا مریم چلانے لگا۔ لڑکیوں نے نورالدین کو یا مریم چلاتے سنا تو انھوں نے اس کی طرف بڑھ کر تلواریں کھینچ لیں اور چاہتی ہی تھیں کہ قتل کر ڈالیں، اتنے میں مریم نے اسے غور سے دیکھا، دیکھتے ہی پہچان گئی اور لڑکیوں سے کہنے لگی کہ اس جوان کو جانے دو، وہ پاگل ہے اس کے پاگل پن کا پتا اس کے چہرے سے چلتا ہے۔ مریم کو یہ کہتے ہوئے سن کر نورالدین نے اپنا سر ننگا کر دیا اور آنکھیں پھرانے اور ہاتھ مٹکانے اور پانو چلانے لگا اس کے منھ سے جھاگ نکلنے لگے۔ مریم نے لڑکیوں سے کہا میں نے کہا نہ تھا کہ یہ دیوانہ ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ اور تم لوگ ہٹ جاؤ، میں ذرا سنوں تو کہ وہ کیا کہتا ہے کیوں کہ میں عربوں کی بولی سمجھتی ہوں۔ اور یہ بھی معلوم کروں کہ اس کے پاگل پن کا علاج ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لڑکیاں اسے اٹھا کر مریم کے پاس لے آئیں اور ادھر ادھر چلی گئیں۔ مریم نے اس سے پوچھا کیا تو میری خاطر جان پر کھیل کر اور پاگل بن کر یہاں آیا ہے؟ نورالدین بولا کہ جینے کا مزا تو محض پاگلوں کے لیے ہے۔

مریم نے کہا نورالدین، تو نے واللہ اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ میں نے

آج سے پہلے تجھے اس دن سے خبردار کیا تھا لیکن تو نے میری بات نہ سُنی اور جیسا چاہا کیا۔ میں نے جو کچھ تجھ سے کہا تھا وہ نہ کشف تھا نہ فراست نہ خواب بلکہ مشاہدے کی بنا پر تھا کیوں کہ جوں ہی میں نے کانے وزیر کی شکل دیکھی میں تاڑ گئی کہ وہ شہر میں محض مجھے ڈھونڈنے آیا ہے۔ نورالدین نے کہا اے میری آقا، عاقل کی غلطی سے ہم خُدا کے آگے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کے بعد نورالدین اور شہزادی مریم زنّاریہ ایک دوسرے سے شکوے شکایت کرنے لگے، دونوں نے اپنی اپنی سرگزشت سُنائی، اشعار پڑھے اور دونوں کے رخساروں پر دریا کی طرح آنسو بہنے لگے۔ غرض کہ دونوں نے اپنا اپنا دُکھڑا اتنا رویا کہ ان کے مُنھ تھک گئے دن ختم ہو گیا اور اندھیرا چھانے لگا۔ مریم اس وقت سبز پوشاک پہنے ہوئے تھی جس سے اس کا حُسن دوبالا ہو گیا تھا۔ رات ہوئی تو شہزادی مریم نے لڑکیوں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم نے دروازہ بند کر دیا ہے؟ وہ بولیں ہاں بند کر دیا ہے۔

اب شہزادی مریم لڑکیوں کو لے کر اس کوٹھری میں گئی جس کا نام مریم عذرا اُمّ نور کی کوٹھری تھا کیوں کہ عیسائیوں کے اعتقاد کے بہ موجب حضرت مریم کی رُوح اور دل اس جگہ تھے۔ لڑکیاں وہاں تبرک لینے اور گرجا کا طواف کرنے لگیں۔ جب وہ فارغ ہو چکیں تو شہزادی مریم نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا اب میں چاہتی ہوں کہ اس گرجا میں اکیلی جا کر تبرک لوں، میں مسلمانوں کے ملکوں میں اتنے عرصے تک رہی ہوں کہ مجھے تبرک کا اشتیاق ہے۔ تم لوگ زیارت سے فارغ ہو کر جہاں چاہنا سو رہنا۔ وہ بولیں کہ سر آنکھوں سے، تیرا جو جی چاہے کر۔ یہ کہہ کر

وہ اس سے رخصت ہوگئیں اور گرجا میں اِدھر اُدھر جاکر سو رہیں۔ مریم ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاکر نورالدین کی تلاش میں نکلی دیکھا کہ وہ اس کے انتظار میں گویا انگاروں پر بیٹھا ہوا ہے۔ جب وہ اس کے سامنے آئی تو اس نے اٹھ کر اس کے ہاتھ چومے، وہ بیٹھ گئی اور اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا، اپنا بیرونی لباس اور گہنے اُتار کر نورالدین کو سینے سے لگا لیا اور دونوں ایک دوسرے سے بوس و کنار کرنے لگے۔ وہ اسی مزے اور خوشی میں تھے کہ ایک غلام نے گرجا کی چھت پر گجر بجایا تاکہ لوگ عبادت کے لیے آئیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو تراسیویں رات

آٹھ سو تراسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! غلام نے ناقوس بجایا تو مریم نے اٹھ کر اپنے کپڑے اور گہنے پہن لیے۔ نورالدین کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی وہ رونے اور آنسو بہانے لگا۔ اس کے بعد شہزادی مریم نے نورالدین کو سینے سے لگالیا اس کے رخسار کو بوسہ دے کر کہا اے نورالدین تو اس شہر میں کتنے دنوں سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ سات دن سے۔ مریم بولی کہ شہر کی بھی سیر کی ہے اور اس کی گلیاں اور باہر جانے کے راستے اور دروازے بھی معلوم ہیں جو خشکی یا سمندر کی طرف نکلتے ہیں؟ اس نے جواب دیا ہاں۔ مریم نے پوچھا تجھے اس صندوق کا راستہ بھی معلوم ہے جس میں گرجا کی نذر نیاز کی چیزیں رکھی جاتی ہیں؟ نورالدین نے کہا ہاں۔ مریم بولی چوں کہ

تجھے یہ سب چیزیں معلوم ہیں تو کل تہائی رات گزرنے کے بعد اسی وقت اس صندوق کو کھول کر اس میں سے جو تیرا جی چاہے نکال لیجیو اور پھر گرجا کا وہ دروازہ کھول کر جہاں سے سرنگ جاتی ہے سمندر تک چلا جائیو۔ وہاں تجھے ایک بجرا ملے گا جس میں دس ملاح ہوں گے۔ جوں ہی ناخدا کی نظر تجھ پر پڑے تو اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیجیو، وہ تیرا ہاتھ پکڑ کر تجھے بجرے میں بٹھالے گا، جب تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں تو اسی کے پاس رہیو۔ اور خبردار، خبردار! رات میں نہ جائیو ورنہ پچھتائے گا اور پچھتانے سے کچھ نہ بنے گا۔ یہ کہہ کر شہزادی مریم نورالدین سے رخصت ہوئی اور فوراً جاکر اپنی کنیزوں اور باقی لڑکیوں کو جگایا اور گرجا کے دروازے پر آکر اسے کھڑکھڑایا۔ بڑھیا نے دروازہ کھولا، مریم نے باہر نکل کر دیکھا کہ نوکر چاکر اور بطریق باہر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے زرد وزی خچر پیش کیا اور وہ اس پر سوار ہوگئی۔ بطریقوں نے اس پر ریشمی چھتری لگائی اور خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی، لڑکیاں پیچھے پیچھے ہولیں اور چاؤش لوگ ننگی تلواریں لے کر اس کے ارد گرد اور اسے باپ کے محل تک پہنچا آئے۔

یہ تو مریم زناریہ کی کہانی ہوئی، اب نورالدین مصری کا ماجرا سنو۔ جس پردے کے پیچھے وہ اور مریم چھپے ہوئے تھے وہیں وہ صبح تک چھپا بیٹھا رہا۔ جب گرجا کا دروازہ کھلا اور لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تو نورالدین بھی ان کے ساتھ مل گیا اور اس بڑھیا کے پاس پہنچا جو گرجا کی رکھوالی تھی۔ بڑھیا نے پوچھا آج رات تو کہاں سویا؟ اس نے جواب دیا ایک جگہ جو شہر کے اندر تھی جیسا کہ تو نے حکم دیا تھا۔ بڑھیا بولی بیٹا، تو نے ٹھیک کیا، اگر تو نے رات گرجا میں گزاری ہوتی تو شہزادی تجھے بری موت مارتی۔

نورالدین نے کہا شکر ہے خدا کا کہ اس نے رات کی مصیبت سے مجھے پناہ میں رکھا۔ دن بھر نورالدین اپنے کام میں مشغول رہا یہاں تک کہ رات ہوگئی، اس نے اٹھ کر نذر کا صندوق کھولا اس میں سے وہ چیزیں نکال لیں جو ہلکی اور قیمتی تھیں۔ جب تہائی رات گزر چکی تو وہ سُرنگ والے دروازے سے نکل کھڑا ہوا اور خدا سے دُعا مانگی کہ وہ پردہ پوشی کرے۔ سُرنگ کا دروازہ کھول کر وہ سمندر پر پہنچ گیا، دیکھا کہ وہیں دروازے کے قریب ایک کشتی لنگر ڈالے کھڑی ہے اس کا ناخدا ایک بہت بوڑھا خوب صورت شخص ہے جس کی ڈاڑھی بہت لمبی ہے اور بیچ کشتی میں کھڑا ہوا ہے، ناخدا کے آس پاس دس شخص اور ہیں۔ نورالدین نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جیسا کہ مریم نے اس سے کہا تھا، ناخدا نے ہاتھ پکڑ کر اسے کشتی میں کھینچ لیا۔

اب بوڑھے ناخدا نے ملاحوں کو آواز دے کر کہا کہ کشتی کے لنگر اٹھا دو اور دن نکلنے سے پہلے چل دو۔ ایک ملاح نے کہا اے میرے آقا ناخدا، ہم کیسے چل سکتے ہیں! بادشاہ نے ہمیں خبر بھیجی ہے کہ وہ کل اس کشتی پر بیٹھ کر سمندر کی چھان بین کرے گا کیوں کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں مسلمان چور اس کی بیٹی کو نہ چُرا لے جائیں۔ ناخدا نے ڈانٹ کر کہا اے مردود، ستیا ناس ہو تمہارا کیا تمہاری یہ ہمت ہوگئی کہ تم میرا حکم نہیں مانتے ہو اور مجھے پلٹ کر جواب دیتے ہو؟ یہ کہہ کر بوڑھے ناخدا نے اپنی تلوار کھینچ لی اور اُس ملاح پر ایسا وار کیا کہ تلوار چمکتی ہوئی اس کی گردن کے پار ہوگئی۔ ایک دوسرا ملاح بولا ہمارے ساتھی نے کیا جرم کیا کہ تو نے اس کی گردن مار دی؟ یہ سن کر ناخدا نے دوسرے ہاتھ میں اس کی گردن بھی اُڑا دی۔ ناخدا اسی طرح ایک ایک کی گردن اُڑاتا رہا یہاں تک کہ دسوں

کے سر کاٹ کر کنارے پر پھینک دیے۔ اس کے بعد وہ نورالدین کی طرف مخاطب ہوا اور چلا کر کہا کھونٹی سے رسّی کھول دے۔ نورالدین ڈرا کہ کہیں اس پر بھی تلوار کا وار نہ ہو جائے، اٹھ کر دوڑا اور خشکی پر کود کر کھونٹی سے رسّی کھول دی اور پھر بجلی کی طرح اُچک کر کشتی پر آگیا۔ ناخدا اس سے کہتا جاتا کہ یہ کر وہ کر اور یوں گھما اور ستاروں کی طرف دیکھ، نورالدین سب کی تعمیل کرتا جاتا مگر اس کے دل کا اللہ ہی مالک تھا۔ اس کے بعد نورالدین نے بادبان کھول دیے اور کشتی متلاطم سمندر میں چل کھڑی ہوئی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو چوراسیویں رات

آٹھ سو چوراسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! بوڑھے ناخدا نے کشتی کے بادبان کھول دیے تو کشتی موافق ہوا کے ساتھ اسے اور نورالدین کو لے کر متلاطم سمندر میں چل دی، اِدھر کشتی چلی جا رہی تھی اور ادھر نورالدین رسّا چرخی پکڑے ہوئے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اسے خبر بھی نہ تھی کہ غیب میں اس کے لیے کیا پوشیدہ ہے۔ جب اس کی نظر ناخدا پر پڑ جاتی اس کا دل کانپ اٹھتا اور اسے کچھ پتا نہ لگتا کہ ناخدا اُسے کدھر لیے جا رہا ہے۔ اسی پریشانی میں صبح ہو گئی۔ نورالدین نے دیکھا کہ ناخدا نے اپنی ڈاڑھی ہاتھ سے پکڑ کر کھینچی اور وہ اپنی جگہ سے اُکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آگئی، معلوم ہوا کہ وہ جھوٹی اور محض چپکی ہوئی تھی۔ اب جو نورالدین نے ناخدا کی طرف نظر ڈالی تو وہ تو اُس کی معشوقہ اور دلی محبوبہ شہزادی مریم

تھی۔ یہ اس کی صرف چال تھی، اس نے ناخدا کو قتل کرکے اس کی ڈاڑھی مع چہرے کی کھال کے اُتار اپنے چہرے پر لگالی تھی۔ نورالدین کو اس کی اس کارستانی، بہادری اور دل کی مضبوطی پر سخت تعجب ہوا، حیرت سے ہوش جاتے رہے اس کو اطمینان ہوگیا اور کہنے لگا ای میری دلی آرزو اور انتہائی مقصد، مرحبا۔ نورالدین جھومنے لگا اور اسے یقین آگیا کہ اب میری مُراد برآئی۔

شہزادی مریم دل کی بڑی مضبوط تھی سمندر میں کشتی کھینا جانتی تھی موسم کے حالات سے واقف تھی اور سمندر کے تمام راستے اُسے معلوم تھے۔ نورالدین بولا ای میری آقا، اگر تو اور زیادہ یہی کھیل کھیلتی تو مارے ڈر کے میں مرجاتا خاص کر محبت کی آگ اور جُدائی کی تکلیف کی وجہ سے۔ اس کی باتیں سُن کر مریم ہنس پڑی اور اس نے فوراً اٹھ کر کھانے پینے کی چیزیں نکالیں، دونوں نے کھایا پیا اور مزے اُڑائے۔ اس کے بعد اس نے یاقوت، جواہرات، طرح طرح کے معدنیات اور سونا چاندی نکالا جو وہ اپنے باپ کے محل اور خزانے میں سے ہلکے اور قیمتی دیکھ کر لے آئی تھی انھیں نورالدین کے آگے پیش کیا اور وہ انھیں دیکھ کر خوش ہوگیا۔ اس ساری مدت میں ہوا معتدل رہی، کشتی برابر چلا کی۔ وہ اسکندریہ پہنچ گئے اس کے نئے پُرانے نشانات اور عمود الصواری انھیں دکھائی دینے لگے۔ کنارے پہنچ کر نورالدین فوراً کشتی پر سے اُتر پڑا اور اسے ایک پتھر سے باندھ کر کچھ قیمتی پتھر اپنے ساتھ لیے اور شہزادی مریم سے کہا ای میری آقا، تو کشتی میں بیٹھی رہ جب تک میں تجھے اس طرح سے نہ اتاروں جیسے کہ میرا جی چاہتا ہی۔ مریم بولی مگر یہ جلد ہونا چاہیے کیوں کہ دیر کرنے

میں پشیمانی اٹھانی پڑے۔ نورالدین نے کہا میں دیر نہیں کروں گا۔ مریم کشتی
میں بیٹھی رہی اور نورالدین اپنے باپ کے دوست عطر فروش کے گھر گیا تاکہ
وہ اسکندریہ کے دستور کے موافق نقاب، چادر، جوتیاں اور جبہ لے کر آئے،
لیکن یہ اس کو کیا معلوم تھا کہ زمانہ اس کے لیے کیا حوادث مہیا کر رہا ہے۔

یہ تو مریم اور نورالدین کی کہانی ہوئی، اب اس کے باپ افرنجہ کے
بادشاہ کا حال سنو۔ صبح ہوئی تو اس نے اپنی بیٹی مریم کو ڈھونڈا لیکن کہیں
اس کا پتا نہ چلا، اس کی کنیزوں اور غلاموں سے دریافت کیا۔ انھوں نے
کہا اے ہمارے مولا، کل وہ یہاں سے گرجا گئی تھی، اس کے بعد کی ہمیں
بالکل خبر نہیں۔ بادشاہ کنیزوں اور غلاموں سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ محل
کے نیچے سے دو بار ایسی چیخ کی آوازیں آئیں کہ محل گونج اٹھا۔ بادشاہ نے
پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اے بادشاہ، سمندر کے کنارے دس آدمی
مرے ہوئے پائے گئے ہیں، شاہی بجرا غائب ہے۔ سُرنگ کا دروازہ جو
گرجا کی طرف ہے کھلا پڑا ہے اور قیدی جو گرجا کی خدمت کرتا تھا نادارد ہے۔
بادشاہ بولا اگر میرا بجرا جو سمندر میں تھا غائب ہے تو شک نہیں کہ میری بیٹی
مریم اس میں ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو پچاسیویں رات

آٹھ سو پچاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! افرنجہ
کے بادشاہ نے کہا اگر میرا بجرا غائب ہے تو بلا شک میری بیٹی اس میں ہے۔
اس کے بعد بادشاہ نے بندرگاہ کے سردار کو بلوایا، اس سے کہا کہ قسم ہے

مسیح اور سچے دین کی اگر تو میرے بجرے اور اس کے مسافروں کو نہ لے آیا تو میں تجھے اتنی بُری طرح ماروں گا کہ لوگوں کو عبرت ہوگی۔ یہ کہہ کر اس نے اسے زور سے ڈانٹا وہ کانپتا ہوا گرجا کی بڑھیا کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا، تو نے کبھی قیدی سے سُنا تھا کہ وہ کس ملک کا رہنے والا ہے؟ بڑھیا نے جواب دیا وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اسکندریہ کا رہنے والا ہوں۔ بڑھیا سے یہ سن کر ناخدا فوراً بندرگاہ پر آیا اور ملاحوں کو پکار کر کہا تیار ہو جاؤ اور بادبان کھول دو۔ ملاحوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور روانہ ہو گئے دن رات چلتے چلتے بالآخر اسکندریہ اُس وقت پہنچے جب کہ نورالدین مریم کو کشتی میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ ان فرنگیوں کے ساتھ وہ کانا اور لنگڑا وزیر بھی آیا تھا جس نے مریم کو نورالدین سے مول لیا تھا۔ شاہی بجرا دیکھ کر ملاح پہچان گئے، اپنے جہاز کو انھوں نے دور جا کر باندھا اور ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر بجرے کے پاس آئے، یہ کشتی چپوؤں سے کھیئی جاتی تھی، اس میں سو جنگ جو جوان تھے اور کانا لنگڑا وزیر بھی جو بڑا قوی ہیکل مردود شیطان اور ایسا چال باز ڈاکو تھا کہ اس کی چال بازیوں کا توڑ کسی کے پاس بھی نہ تھا، غرض اس کو ابو محمد بطال سمجھو۔ کھیتے کھیتے وہ اس بجرے کے پاس پہنچ گئے اور اس پر یک بارگی دھاوا بول دیا، لیکن دیکھا کہ اس میں سوا مریم کے اور کوئی نہیں۔ تھوڑی دیر تک کنارے پر ٹھیرنے کے بعد وہ مریم اور بجرے کو اپنے جہاز کے پاس لے گئے اور بغیر لڑائی کے ان کا مقصد پورا ہو گیا یہاں تک کہ انھیں ہتھیار نکالنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ اب وہ عیسائی ملکوں کی طرف روانہ ہو گئے، ہوا موافق تھی اور وہ سپاہیوں کی پناہ میں تھے، اس طرح وہ افرنجیا پہنچے

اور شہزادی مریم کو لے کر اس کے باپ کے پاس گئے جو اس وقت تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

مریم کے باپ نے اسے دیکھ کر کہا اے دغا باز تو نے باپ داداؤں کا دین کیسے چھوڑ دیا، مسیح کی پناہ سے کیوں نکل گئی جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور خانہ بدوشوں کا مذہب یعنی اسلام کیوں اختیار کیا جو صلیب اور بتوں کی ضد میں تلوار کے ذریعے سے قائم کیا گیا ہے؟ مریم بولی اس میں میری کیا خطا ہے! میں رات کو گرجا گئی ہوئی تھی تاکہ حضرت مریم کی زیارت اور تبرک حاصل کروں۔ بے خبری کی حالت میں مسلمان ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا، میرا منھ بند کر کے مشکیں باندھ دیں اور مجھے کشتی میں ڈال کر اپنے ملک کی طرف لے چلے۔ میں نے انھیں دھوکا دے کر ان کے دین کی باتیں شروع کر دیں یہاں تک کہ انھوں نے میری مشکیں کھول دیں۔ اتنے میں یکایک تیرے لوگ پہنچ گئے اور انھوں نے مجھے چھڑا لیا۔ مسیح اور سچے دین کی قسم، صلیب اور اس کی قسم جو صلیب پر چڑھایا گیا ہے کہ میں مسلمانوں کے پنجے سے چھوٹ کر بہت خوش ہوئی۔ باپ نے کہا اے بدکار تو جھوٹی ہے۔ قسم ہے انجیل اور اس کے اٹل حلال و حرام احکام کی کہ میں تجھے بری طرح قتل کروں گا تاکہ لوگ تیری بری مثال سے عبرت پکڑیں۔ کیا یہ تیرے لیے کافی نہ تھا کہ تو ایک بار جھوٹ بول چکی ہے تو اب پھر ہمیں دھوکا دینا چاہتی ہے! بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قتل کر کے محل کے دروازے کے قریب صلیب پر چڑھا دیا جائے۔ اسی وقت کانا وزیر اندر آیا، وہ بہت دنوں سے اسے چاہتا تھا، کہنے لگا اے بادشاہ، اسے قتل نہ کر بلکہ میرے نکاح میں دے دے۔ میں اس کی بڑی حفاظت کروں گا اور اس وقت تک

اس سے ہم بستر نہ ہوں گا جب تک میں اس کے لیے سخت پتھر کا ایک محل نہ بنوالوں اور دیواریں اتنی اونچی نہ کروالوں کہ کوئی چور اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب وہ محل بن چکے گا تو میں اس کے دروازے پر تیس مسلمانوں کی اپنی اور اس کی طرف سے بھینٹ چڑھاؤں گا۔ بادشاہ نے مہربانی فرماکر مریم کی شادی اس سے منظور کرلی، پادریوں، رہبانوں اور بطریقوں کو اجازت دے دی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے بیاہ دیں۔ انھوں نے مریم کا نکاح کانے وزیر سے کردیا، بادشاہ نے یہ بھی حکم دے دیا کہ اس کی شان کے موافق ایک مضبوط محل کی بنیاد رکھی جائے، اور فوراً کام شروع ہوگیا۔

یہ تو شہزادی مریم، اس کے باپ اور کانے وزیر کا ماجرا ہوا، اب نورالدین اور بوڑھے عطر فروش کی کہانی سنو۔ عطر فروش کے گھر پہنچ کر نورالدین نے اس کی بیوی سے جبّہ، نقاب، جوتیاں اور ایسے کپڑے لیے جو اسکندریہ کی عورتیں پہنتی ہیں اور سمندر پہنچ کر اس کشتی کی طرف چلا جس میں شہزادی مریم تھی مگر اس نے دیکھا کہ میدان خالی پڑا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو چھیاسیویں رات

جب آٹھ سو چھیاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! میدان خالی دیکھ کر نورالدین کا دل بیٹھ گیا اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور وہ سمندر کے کنارے دائیں بائیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ لوگ کنارے پر کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں اے مسلمانو! اب اسکندریہ کی کوئی حرمت باقی نہیں رہی، فرنگی یہاں گھس آتے ہیں اور جو چاہتے ہیں مزے سے لے کر چل دیتے ہیں ان کا تعاقب نہ کوئی مسلمان کرتا ہے نہ مجاہد لشکر نورالدین نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے جواب دیا بیٹا، ابھی فرنگیوں کے ایک جہاز نے جس میں لشکر تھا اس بندرگاہ پر حملہ کر دیا اور ایک کشتی کو جو یہاں لنگر ڈالے کھڑی تھی مع ایک لڑکی کے پکڑ اپنے ملک کو چل دیے۔ یہ سنتے ہی نورالدین غش کھا کر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو لوگوں نے ماجرا پوچھا، اس نے شروع سے آخر تک سب کچھ کہہ سنایا۔ لوگوں کو اصل واقعہ کا پتا چلا تو سب اسے برا بھلا کہنے لگے کہ آخر تو نے اسے بے جتے اور نقاب کے کیوں نہ باہر نکال لیا؟ غرض کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی تکلیف دہ بات کہتا۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ اسے چھوڑ دو، اس کی یہی سزا تھی۔ لوگ نورالدین سے اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ بوڑھا عطر فروش آ پہنچا اس نے دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور بیچ میں نورالدین بے ہوش پڑا ہے۔

عطر فروش نے نورالدین کے سرہانے بیٹھ کر اسے ہوشیار کیا اور جب وہ ہوش میں آچکا تو اس نے کہا بیٹا یہ تیری کیا حالت ہے؟ نورالدین بولا چچا، جو لڑکی میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی اسے جا کر میں اس کے باپ کے شہر سے کشتی میں بٹھا کر لایا تھا اور اس کے لانے میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلی تھیں، جب میں یہاں پہنچا تو کشتی کو باندھ کر اور لڑکی کو اسی میں بٹھا چھوڑ تیرے گھر گیا اور تیری بیوی سے کپڑے لے کر

لڑکی کو لینے آیا، اتنے میں فرنگی آکر کشتی اور لڑکی کو اُڑا لے گئے۔ یہ سُن کر بوڑھے عطر فروش کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، وہ نورالدین پر بڑا افسوس کرنے لگا اور کہا بیٹا، تو نے بغیر جتے کے اسے کیوں نہ اُتار لیا؟ لیکن اب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیٹا، اُٹھ میرے ساتھ شہر چل، ممکن ہے کہ خدا تجھے اس سے زیادہ حسین لڑکی عنایت کرے اور تو اُسے بھول جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس لڑکی میں تجھے ٹوٹا نہیں ہوا بلکہ فائدہ ہی فائدہ رہا۔ بیٹا سُن، جُدائی اور ملاپ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ نورالدین نے کہا چچا، خدا کی قسم میں اُسے کبھی بھول نہیں سکتا ہوں خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔ عطر فروش نے کہا بیٹا، تیرے دل میں کون سی بات ہے جو تو کرنا چاہتا ہے؟ نورالدین بولا میں چاہتا ہوں کہ پھر رُوم کے مُلک میں جا کر افرنجہ پہنچوں اور جان پر کھیل جاؤں۔ اس میں یا تو میرا مقصد پُورا ہو جائے اور یا میں مر جاؤں۔ بوڑھے عطر فروش نے کہا مثل ہے کہ گھڑا ہر بار سالم نہیں نکلتا۔ اگرچہ انھوں نے پہلی بار تجھے چھوڑ دیا ممکن ہے کہ اس بار وہ تجھے قتل کر ڈالیں، خاص کر اس وجہ سے کہ اب وہ تجھے خوب پہچان گئے ہیں۔ نورالدین بولا چچا، مجھے جانے دے تاکہ میں اس کی محبت میں جلد قتل ہو جاؤں اور اس کی جدائی میں گھُٹ گھُٹ کر نہ مروں۔ اتفاق سے اس وقت ایک جہاز بندرگاہ میں لنگر ڈالے سفر کے لیے تیار کھڑا تھا، مسافر اپنا اپنا کام نبٹا چکے تھے اور ملاح لنگر اٹھانے ہی والے تھے کہ نورالدین اس میں بیٹھ گیا، ہوا موافق تھی کشتی کئی دن تک چلتی رہی۔

وہ چلے جا رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ کئی فرنگی جہاز سمندر میں چکر لگا رہے ہیں اور جس کشتی کو دیکھتے ہیں پکڑ لیتے ہیں کیوں کہ انھیں اندیشہ

ہو کہ مسلمان ڈاکو کہیں شہزادی کو نہ لے جائیں۔ جب وہ کسی کشتی کو پکڑتے تو سارے مسافروں کو افرنجہ کے بادشاہ کے پاس لے جاتے اور وہ انھیں ذبح کر کے اپنی نذر پوری کرتا جو اس نے بیٹی کے بارے میں مانی تھی۔ جب ان کی نظر اس کشتی پر پڑی جس پر نورالدین تھا تو انھوں نے اسے بھی پکڑ لیا اور تمام مسافروں کو لے کر بادشاہ کے پاس پہنچے جو مریم کا باپ تھا۔ جب قیدی صف باندھ کر کھڑے ہوئے تو بادشاہ نے دیکھا کہ وہ سو مسلمان ہیں اس نے فوراً ان کے قتل کا حکم دے دیا، انھی میں نورالدین بھی تھا۔ سب ذبح کر دیے گئے محض نورالدین باقی رہ گیا، جلاد نے اس کی کم سنی اور خوب صورتی کی وجہ سے اُسے سب کے بعد میں رکھا تھا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر پہچان گیا اور کہنے لگا کہ کیا تو نورالدین نہیں ہے جو اس سے پہلے ایک بار اور یہاں آیا تھا؟ اس نے جواب دیا میں پہلے کبھی یہاں نہیں تھا، نہ میرا نام نورالدین ہے بلکہ ابراہیم۔ بادشاہ بولا تو جھوٹا ہے، تیرا نام نورالدین ہے، تجھے میں نے اس بڑھیا کے حوالے کیا تھا جو گرجا کی سردار ہے تاکہ تو گرجا کی خدمت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ نورالدین نے کہا اے میرے مولا، میرا نام ابراہیم ہے۔ بادشاہ بولا اگر بڑھیا یہاں آئے اور تجھے دیکھے تو وہ ٹھیک بتا سکتی ہے کہ تو نورالدین ہے یا کوئی اور۔ وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ کانا وزیر جس نے شہزادی سے نکاح کیا تھا آ پہنچا اور بادشاہ کے آگے زمین چوم کر کہنے لگا کہ بادشاہ سلامت، محل بن کر تیار ہو چکا ہے اور تجھے معلوم ہے کہ میں نے نذر مانی تھی کہ جب میں محل بنا کر تیار کر لوں گا تو اس کے دروازے پر تیس مسلمانوں کو ذبح کروں گا۔ اس وقت میں اسی لیے آیا تھا کہ تجھ سے تیس مسلمان لے کر ذبح کروں تاکہ

مسیح کی نذر پوری ہو جائے۔ بادشاہ نے کہا کہ مسیح اور سچے دین کی قسم سوا اس قیدی کے میرے پاس اور کوئی نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے نورالدین کی طرف اشارہ کیا اور کہا اسے تو ابھی ذبح کر ڈال اور جب اور مسلمان قیدی میرے پاس آئیں گے تو میں باقی بھی تیرے پاس بھیج دوں گا۔ کانا وزیر نورالدین کو لے کر چل دیا تاکہ اُسے اپنے دروازے کی دہلیز پر ذبح کرے لیکن رنگ کرنے والوں نے اس سے کہا اے ہمارے مولا، ہمارا دو روز کا کام اور باقی ہے، اس لیے ابھی ٹھہر جا، جب ہم رنگ و روغن کر چکیں تو اسے ذبح کیجیو۔ ممکن ہے کہ اس وقت تک باقی انتیس بھی آ جائیں اور تو سب کو ایک ساتھ ذبح کر کے نذر پوری کر سکتا ہے۔ یہ سُن کر وزیر نے حکم دیا کہ نورالدین کو قید کر دیا جائے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو ستاسیویں رات

آٹھ سو ستاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب وزیر نے نورالدین کے قید کیے جانے کا حکم دیا تو لوگ اس کے بیڑیاں ڈال کر اصطبل میں لے گئے۔ وہ بھوکا پیاسا اپنے اوپر افسوس کر رہا تھا، اسے موت ہی موت ہر طرف دکھائی دیتی تھی۔ بادشاہ کے دو گھوڑے بھائی بھائی تھے، ایک کا نام سابق اور دوسرے کا لاحق تھا اور وہ ایسے تھے کہ ایک ایک کی تمنا بڑے بڑے بادشاہوں کو ہو سکتی ہے۔ ایک ان میں سے اشہب تھا چمک دار اور دوسرا ادہم رات کی طرح کالا۔ جزیروں کے بادشاہوں نے کہہ رکھا تھا کہ جو کوئی ان دونوں میں سے ایک گھوڑا بھی

چرا لائے تو وہ جس قدر سونا اور موتی جواہرات مانگے ہم دیں گے۔ پھر بھی
کسی کو ایک گھوڑے کے چرانے میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اتفاقاً ان میں
سے ایک بیمار پڑ گیا، یرقان اور آنکھوں میں جالا۔ بادشاہ نے ملک کے
تمام بیطار بلوائے لیکن کسی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ ایک بار بادشاہ
کے پاس وہی کانا وزیر آیا جس نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی دیکھا کہ
وہ گھوڑے کے بارے میں بہت غمگین ہے۔ غم دور کرنے کی غرض سے
اس نے بادشاہ سے کہا کہ یہ گھوڑا مجھے دے دے، میں اس کا علاج کروں گا۔
بادشاہ نے اسے گھوڑا دے دیا اس نے گھوڑے کو لے جا کر اسی اصطبل
میں رکھا جہاں نورالدین بند تھا۔ جب یہ گھوڑا اپنے بھائی سے الگ ہو گیا
تو اتنا چیخنے چلانے اور ہنہنانے لگا کہ لوگ پریشان ہو گئے۔ وزیر سمجھ گیا کہ
گھوڑا اپنے بھائی کی جدائی کی وجہ سے چلاتا ہے اور بادشاہ کو اس کی خبر کی۔
جب بادشاہ نے اس کی تحقیق کی تو کہنے لگا اگر یہ جانور اپنے بھائی کی جدائی
گوارا نہیں کر سکتا تو پھر انسانوں کی کیا حالت ہو گی! یہ کہہ کر اس نے غلاموں
کو حکم دیا کہ دوسرے گھوڑے کو بھی وزیر کے ہاں پہنچا آؤ اور اس سے
کہنا کہ اپنی بیٹی کی خاطر میں یہ دونوں گھوڑے تجھے انعام دیتا ہوں۔

ایک رات نورالدین کی نگاہ ان دونوں گھوڑوں پر پڑی، اس نے
دیکھا کہ ایک کی آنکھوں میں جالا ہے۔ نورالدین کو گھوڑوں کی پہچان اور
ان کے علاج میں کچھ مشق تھی۔ اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کی قسم یہ موقع ہے،
میں ابھی جا کر وزیر سے کہتا ہوں کہ میں اس گھوڑے کا علاج کروں گا، پھر
اگر اس نے اجازت دے دی تو ایسی دوا دوں گا کہ وہ اندھا ہو جائے
اور وزیر مجھے قتل کر دے، اس رذالت کی زندگی سے تو کسی طرح نجات

ملے۔ وزیر گھوڑوں کو دیکھنے اصطبل میں آیا تو نورالدین نے کہا ای میرے مولا، اگر میں علاج کر کے اس گھوڑے کی آنکھوں کو اچھا کر دوں تو تو مجھے کیا دے گا؟ وزیر بولا مجھے اپنے سر کی قسم اگر تو نے اسے اچھا کر دیا تو میں تجھے ذبح نہ کروں گا اور جو تو مانگے گا دوں گا۔ نورالدین نے کہا ای میرے مولا، میرے ہاتھ کھلوا دے وزیر نے حکم دے دیا کہ اس کے ہاتھ کھول دیے جائیں اور اس نے ایک دوا تیار کر کے گھوڑے کی آنکھوں میں لگائی، ان پر پٹی باندھ دی اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اب اس کی آنکھیں جاتی رہیں گی اور وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس کے بعد نورالدین خوب آرام سے سویا، خدا کے آگے گڑگڑایا اور کہا ای میرے پروردگار، جو میری دعا ہے تو خوب جانتا ہے۔ جب صبح ہوئی اور دن چڑھنے لگا تو وزیر نے اصطبل میں آکر گھوڑے کی آنکھوں سے پٹی کھولی دیکھا کہ خدا کی قدرت سے وہ بالکل صاف اور خوب صورت ہو گئی ہیں۔ نورالدین سے کہا ای مسلمان! تجھ سے بڑھ کر معالج میں نے دنیا بھر میں نہیں دیکھا۔ قسم ہے مسیح اور سچے دین کی کہ میں تجھ سے بے حد خوش ہوں ہمارے ملک کا ایک بیطار بھی اس گھوڑے کا علاج نہ کر سکا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اپنے ہاتھ سے اس کی بیڑیاں اتار دیں، اسے ایک نفیس پوشاک پہننے کو دی اصطبل کا داروغہ بنا دیا، ماہانہ اور روزینہ مقرر کیا اور اصطبل کی ایک منزل اسے رہنے کو عطا کی۔

جو نیا محل وزیر نے شہزادی مریم کے لیے بنایا تھا اس کی ایک کھڑکی وزیر کے گھر کی طرف تھی اور اسی منزل کے سامنے جس میں نورالدین رہتا تھا۔ نورالدین ایک مدت تک مزے مزے کی چیزیں، کھاتا پیتا اور سائیسوں پر حکم چلاتا رہا ان میں سے جو کوئی غیر حاضر ہوتا یا طویلے میں بندھے ہوئے

گھوڑوں کو دانہ چارا نہ دیتا تو وہ اُسے دھکّے دیتا، خوب مارتا اور اُس کے پانو میں بیڑیاں ڈال دیتا۔ نورالدین کی وجہ سے وزیر بڑا خوش تھا لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ اونٹ کس کل بیٹھنے والا ہے۔ نورالدین روز دونوں گھوڑوں کے پاس جاتا اور ان پر ہاتھ پھیرتا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وزیر انھیں کتنا چاہتا اور ان کی کتنی عزت کرتا ہے۔ وزیر کی ایک باکرہ بیٹی تھی ایسی حسین جیسے چوکڑی بھرنے والا آہو یا لچک دار شاخ۔ اتفاق سے ایک روز وہ اس جھروکے میں بیٹھی تھی جو وزیر کے گھر اور نورالدین کے کمرے کے سامنے تھا کہ اس نے نورالدین کو کچھ حسرت آمیز اشعار پڑھتے سُنا، اپنے دل میں کہنے لگی کہ قسم ہے مسیح اور سچے دین کی یہ مسلمان بڑا خوش رو جوان ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عاشق ہے اور اپنی معشوقہ سے جُدا، خُدا جانے اس خوش رو جوان کی محبوبہ اسی کی طرح حسین ہے اور اسے بھی اتنی ہی تمنّا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی محبوبہ بھی اسی کی طرح حسین ہے تو اس کا آنسو بہانا اور فریاد کرنا بجا ہے ورنہ وہ انھی حسرتوں میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔۔۔۔

آٹھ سو اٹھاسیویں رات

آٹھ سو اٹھاسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! وزیر کی بیٹی نے کہا ورنہ وہ انھی حسرتوں میں اپنی عمر ضائع کرے گا۔ اتفاق سے وزیر کی بیوی مریم زنّاریہ ایک دن پہلے نئے محل میں آچکی تھی اور وزیر زادی کو معلوم تھا کہ وہ غمگین و ملول رہتی ہے، اس لیے اس کا ارادہ

ہوا کہ اس کے پاس جاکر اس جوان کا ذکر کرے۔ اس کا یہ خیال ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ شہزادی مریم نے جو اس کے باپ کی بیوی تھی اسے بلوا بھیجا تاکہ اس کے ساتھ باتیں چیتیں کرکے اپنا دل بہلائے۔ وزیرزادی اس کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ وہ غمگین ہی آنسو رخساروں پر بہ رہے ہیں۔ کہنے لگی اے شہزادی، تجھے کیا ہوگیا ہی کہ تو غمگین اور سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہی۔ یہ سن کر شہزادی مریم کو گزرا ہوا زمانہ یاد آگیا جب کہ وہ عیش وعشرت سے زندگی بسر کرتی تھی۔ وزیرزادی نے کہا اے شہزادی، غمگین نہ ہو اور میرے ساتھ محل کے جھروکے پر چل، ہمارے ہاں اصطبل میں ایک حسین خوش قامت اور شیریں کلام جوان ہی جو فراق زدہ عاشق معلوم ہوتا ہی شہزادی مریم نے پوچھا اُس کے فراق زدہ عاشق ہونے کی کیا نشانی ہی؟ وزیرزادی نے کہا اے شہزادی، وہ دن رات حسرت آمیز اشعار پڑھا کرتا ہی شہزادی مریم نے اپنے دل میں کہا اگر وزیرزادی کی باتیں سچ ہیں تو یہ تو نورالدین ہی کی علامتیں ہیں جو بےچارا زخم خوردہ ہی۔ دیکھنا تو چاہیے کہ وہ نورالدین ہی یا کوئی اور؟

اب شہزادی مریم کی محبت اتنے جوش میں آئی اور تمنائیں اس قدر امنڈنے لگیں کہ وہ فوراً اُٹھ کر وزیرزادی کے ساتھ جھروکے پر پہنچی دیکھا تو اپنے محبوب اور آقا نورالدین کی سی صورت نظر آئی۔ ذرا غور سے دیکھنے کے بعد اسے بالکل شبہ باقی نہیں رہا، لیکن اس نے دیکھا کہ نورالدین مارے رنج وغم کے بیمار اور بہت زیادہ دُبلا ہوگیا ہی۔ اس بھید کو اس نے وزیرزادی پر ظاہر نہیں کیا بلکہ اس سے کہنے لگی کہ مسیح اور سچّے دین کی قسم مجھے اب تک یہ نہ معلوم تھا کہ تجھے میری پریشانی اور رنج وغم کی

خبر ہے۔ یہ کہہ کر وہ جھروکے کے پاس سے اٹھی اور اپنی جگہ چلی گئی اور وزیر زادی اپنے کام پر چل دی۔ تھوڑی دیر کے بعد شہزادی مریم جھروکے کے پاس لوٹی، وہاں آکر بیٹھ گئی اور نورالدین کو دیکھنے لگی کہ وہ کیسا پیارا ہے گویا چودھویں رات کا چاند، لیکن اس کی صورت سے حسرت ٹپک رہی ہے اور آنسو جاری ہیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . . .

آٹھ سو نواسیویں رات

آٹھ سو نواسیویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جب مریم نے دیکھا کہ نورالدین کی صورت سے حسرت ٹپک رہی ہے اور آنسو جاری ہیں تو اس نے دوات اور کاغذ منگوا کر بسم اللہ کے بعد یہ لکھنا شروع کیا: "سلامتی ہو تیرے اوپر اللہ کی طرف سے اور رحمت اور برکت! میں تجھے خبر دیتی ہوں کہ تیری باندی مریم تجھے سلام کہتی ہے اور وہ تیری تمنا میں تڑپ رہی ہے اور یہ اسی کی طرف سے خط ہے۔ جوں ہی تجھے یہ خط ملے فوراً وہ تمام باتیں کیجیو جو میں اس میں لکھ رہی ہوں اور خبردار نہ ان کے خلاف کیجیو نہ سستی سے کام لیجیو۔ بہترین موقع تہائی رات گزرنے کے بعد ہے، اس وقت سوا اس کے اور کوئی کام نہ کیجیو کہ دونوں گھوڑوں پر زینیں کس کر انھیں شہر کے باہر لے جائیو اور اگر کوئی پوچھے کہ تو کہاں جا رہا ہے تو کہیو کہ انھیں ٹہلانے کو لیے جا رہا ہوں۔ تو یہ کہے گا تو تجھے کوئی نہ روکے گا، کیوں کہ لوگوں کو یقین ہو گا کہ شہر کے دروازے بند ہیں۔" یہ لکھ کر اس نے خط بند کیا اور اسے ایک ریشمی رومال میں

لپیٹ جھروکے سے نورالدین کے پاس پھینک دیا۔ نورالدین نے اُسے اٹھاکر پڑھا اس کا مطلب سمجھا اور یہ معلوم کرکے کہ یہ شہزادی مریم کا خط ہے اسے چوما، آنکھوں سے لگایا اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ رات ہوتے اس نے دونوں گھوڑوں کو بنانا سنوارنا شروع کیا اور جب تہائی رات گزر چکی تو اس نے ان پر زینیں کسیں اور اصطبل سے نکل کر دروازے میں قفل ڈال دیا اور شہر کے باہر جاکر شہزادی مریم کا انتظار کرنے لگا۔

یہ تو نورالدین کی کہانی ہوئی، اب شہزادی مریم کا ماجرا سنو۔ وہ فوراً اٹھ کر اس کمرے میں گئی جو محل میں اس کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کانا وزیر شُتر مرغ کے پروں کا ایک تکیہ لگائے بیٹھا ہے لیکن اس کی ہمت نہیں پڑتی کہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے یا باتیں کرے۔ اسے دیکھتے ہی مریم نے خدا کی درگاہ میں مناجات کی اور کہنے لگی کہ خداوندا اس کی مراد مجھ سے پوری نہ ہونے دیجیو اور پاک کرنے کے بعد مجھے ناپاک نہ بنائیو۔ پھر وہ وزیر کی طرف متوجہ ہوکر محبت کا اظہار کرنے لگی اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر پیار کرنے لگی اور کہا اے میرے آقا، آخر یہ نازنخرا کیسا؟ مثل ہے کہ تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھا کھڑے کو سلام کرتا ہے۔ اے میرے آقا، اگر تو میرے پاس آکر باتیں نہیں کرتا تو میں تیرے پاس آکر باتیں کروں گی۔ وزیر نے کہا اے تمام دنیا کی رانی، نیکی اور احسان تیری طرف سے ہے، میں تو تیرے نوکروں میں سے ایک نوکر اور تیرا ادنا غلام ہوں۔ اے یکتا موتی، میں تجھ سے بات کرتے شرماتا ہوں اور تیرے آگے میرا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ مریم بولی کہ باتیں نہ بنا بلکہ کھانے پینے کے لیے کچھ لا۔ یہ سنتے ہی وزیر نے باندیوں اور نوکروں کو آواز دے کر کہا

کہ کھانا لاؤ، وہ فوراً دسترخوان لاکر بچھا گئے اور اس پر طرح طرح کے کھانے چن دیے۔ شہزادی مریم نے دسترخوان کی طرف ہاتھ بڑھایا خود بھی کھاتی جاتی اور وزیر کے منھ میں بھی نوالے دیتی جاتی اور اس کا منھ بھی چومتی جاتی۔ جب دونوں کا پیٹ بھر گیا تو انھوں نے اٹھ کر ہاتھ دھوئے۔

اس کے بعد نوکروں نے دسترخوان بڑھایا اور مے نوشی کا سامان حاضر کیا۔ مریم جام بھر بھر کر پیتی اور پلاتی اور وزیر کی خدمت کرتی جاتی یہاں تک کہ مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وزیر کو خوب شراب چڑھ گئی اور اس کی زبان بھٹکنے لگی تو مریم نے اپنی جیب سے تازہ مغربی بھنگ کا ایک ٹکڑا نکالا کہ اگر ہاتھی بھی اس میں سے ذراسی سونگھ لیتا تو اس سال سے آیندہ سال تک پڑا سوتا رہتا۔ یہ بھنگ مریم نے اسی موقع کے لیے تیار کی تھی۔ وزیر کو بے خبر پاکر اس نے وہ بھنگ پیالے میں ڈال دی اور اُسے بھر کر اس کے آگے پیش کیا۔ مارے خوشی کے وزیر کے ہوش جاتے رہے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اسے شراب دے رہی ہے اور وہ پیالے کو چڑھا گیا۔ ابھی شراب پیٹ تک نہ اُترنے پائی ہوگی کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ شہزادی مریم نے اٹھ کر فوراً دو خرجیوں میں ایسی چیزیں بھریں جو ہلکی اور قیمتی تھیں مثلاً جواہرات، یاقوت اور طرح طرح کی قیمتی معدنیات۔ اس کے بعد اس نے کچھ کھانے پینے کا سامان ساتھ لیا اور جنگی لباس پہن کر ہتھیار لگا لیے، اس کے علاوہ اس نے نورالدین کے لیے عمدہ شاہی لباس ساتھ لیا اور سب چیزوں کو خرجیوں میں رکھ کر اپنے کندھے پر لادا اور محل سے نکل نورالدین کی تلاش میں چل دی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔۔۔۔۔۔

آٹھ سو نوّیں رات

آٹھ سو نوّیں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! مریم محل سے نکل کر نورالدین کی تلاش میں چل دی۔

یہ تو مریم کا ماجرا ہوا، اب مسکین عاشق نورالدین کی سرگزشت سنو۔ وہ شہر کے دروازے پر جاکر بیٹھ گیا اور گھوڑوں کی لگامیں ہاتھ میں لیے مریم کی راہ دیکھنے لگا۔ خدا نے اس پر نیند مسلّط کردی اور وہ سو گیا، پاک ہے وہ ذات جو کبھی سوتی نہیں! جزیروں کے بادشاہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت دینے کے لیے تیار تھے بہ شرطے کہ کوئی ان دونوں گھوڑوں کو یا کم از کم ایک کو چرا لائے۔ اس زمانے میں ایک حبشی غلام تھا جس نے جزیروں میں پرورش پائی تھی اور گھوڑوں کے چور کے نام سے مشہور تھا۔ فرنگستان کے بادشاہوں نے اسے بہت رشوتیں دی تھیں کہ وہ دونوں گھوڑوں میں سے ایک کو چرا لائے اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ دونوں چرا لائے تو وہ اسے ایک پورا جزیرہ دے دیں گے اور ایک نفیس خلعت عطا کریں گے۔ یہ غلام افرنجیہ میں مدّت سے چھپ چھپ کر گشت لگایا کرتا تھا لیکن اب تک ایک گھوڑا بھی اس کے ہاتھ نہ لگا تھا کیوں کہ دونوں بادشاہ کے اصطبل میں تھے جب بادشاہ نے وہ دونوں گھوڑے کانے وزیر کو دے دیے اور وہ اس کے اصطبل میں آگئے تو غلام بہت خوش ہوا اور اس کی ہمّت بڑھ گئی اس نے کہا مسیح اور سچے دین کی قسم اب میں انھیں ضرور چرا لے جاؤں گا۔ اس رات وہ غلام اسی ارادے سے نکلا تھا کہ وزیر کے اصطبل میں جاکر دونوں گھوڑے چرا لائے۔ وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس نے دیکھا کہ نورالدین

پڑا سو رہا ہے اور دونوں گھوڑوں کی باگیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ غلام نے
دونوں کی باگیں اُتار دیں اور چاہتا ہی تھا کہ ایک پر سوار ہو کر دُوسرے کو
کھینچتا ہوا لے جائے کہ شہزادی مریم دونوں خرجیاں کندھے سے لٹکائے آ
پہنچی اور غلام کو نورالدین سمجھ کر اُسے ایک خرجی دی اور اس نے اُسے
ایک گھوڑے پر رکھ لیا، پھر دُوسری خرجی دی اور اس نے اُسے دُوسرے
گھوڑے پر رکھ لیا۔ غلام نے چُپ چاپ خرجیاں لے لیں اور وہ اُسے
نورالدین سمجھتی رہی۔ اس کے بعد وہ شہر کے دروازے سے باہر نکل آئی
اور غلام چُپ چاپ ساتھ ہو لیا۔ مریم نے کہا ای میرے آقا نورالدین، تو
چُپ کیوں ہے؟ غلام نے غصّے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ای لونڈیا تو کیا
کہتی ہے؟ مریم اس کی کھٹھل زبان سُن کر سمجھ گئی کہ وہ نورالدین کی زبان نہیں
اور سر اٹھا کر اس کی طرف نظر ڈالی اور دیکھا اس کے نتھنے لوٹوں کی طرح
کے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی مریم کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا وہ کہنے لگی ای
بنو حام کے بزرگ، تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا ای ملعون
بچّی، میرا نام مسعود ہے اور جب لوگ سو جاتے ہیں تو میں گھوڑے چرایا
کرتا ہوں۔

اس پر مریم نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ تلوار کھینچ کر ایسا وار کیا کہ وہ چمکتی
ہوئی غلام کی گردن کے آر پار ہو گئی، وہ زمین پر اپنے خون میں لوٹنے لگا
اور خدا نے اس کی رُوح کو فوراً دوزخ میں پہنچا دیا جو بُری قیام گاہ ہے۔
اب شہزادی مریم نے دونوں گھوڑوں کو لیا، ایک پر سوار ہو گئی اور دوسرے
کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لیا اور نورالدین کو ڈھونڈنے پیچھے لوٹی دیکھا کہ وہ
اسی جگہ جہاں اس سے ملنے کا وعدہ تھا انگلیاں پکڑے نیند میں خراٹے لے رہا

ہو اُسے نہ سر کا ہوش ہو نہ پانو کا۔ مریم نے گھوڑے سے اُتر کر اسے دھکّا دیا وہ سہم کر جاگ پڑا اور کہنے لگا ای میری آقا، خدا کا شکر ہو کہ تو صحیح وسلامت پہنچ گئی۔ مریم نے کہا اُٹھ کر چپ چاپ اس گھوڑے پر سوار ہو جا، وہ اس پر سوار ہو گیا اور شہزادی مریم دوسرے گھوڑے پر اور دونوں شہر سے نکل آئے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد مریم نے نور الدین کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تجھ سے کہا نہ تھا کہ سوئیو نہیں کیوں کہ جو سویا وہ کھویا۔ نور الدین نے کہا ای میری آقا، تیرے وعدے سے میرے دل کو اتنی ٹھنڈک پہنچی کہ میری آنکھیں مچ گئیں۔ ای میری آقا، کہہ تو سہی کہ کیا بات ہو۔ اس پر مریم نے سارا ماجرا شروع سے لے کر آخر تک کہہ سنایا۔ نور الدین بولا شکر ہو خدا کا کہ ہم بچ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تیز تیز چلنا شروع کیا اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا اور باتیں کرتے ہوے اس جگہ پہنچے جہاں شہزادی مریم غلام کو مار کر پھینک آئی تھی اور جہاں وہ دیو کی طرح زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مریم نے نور الدین سے کہا اُتر کر اس کے کپڑے اُتار ڈال اور اس کے ہتھیار لے آ۔ اس نے کہا ای میری آقا، واللہ میں اُترتے ڈرتا ہوں، نہ میں اس کے قریب کھڑا ہوں اور نہ اس کے پاس پھٹکوں۔ غلام کا ڈیل ڈول دیکھ کر نور الدین ڈر گیا۔ مریم کے کارنامے پر اس کا شکرگزار ہوا اور اس کی بہادری اور دلاوری پر تعجّب کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ رات بھر تیز تیز چلتے رہے، جب صبح ہوئی اور دن نکلا تو وہ ایک بڑے سبزہ زار پر پہنچے جہاں غزال رعنائی کر رہے تھے جس کے ہر طرف سبزی ہی سبزی تھی، پھل آئے ہوے تھے، چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں اور چشمے ہر طرف بہہ رہے تھے۔ وہاں شہزادی مریم اور نور الدین

اُتر پڑے، تاکہ اس وادی میں ذرا ستا لیں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

آٹھ سو اکیانویں رات

آٹھ سو اکیانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! مریم اور نورالدین نے اس وادی میں اُتر کر پھل کھائے، پانی پیا اور گھوڑوں کو سبزہ زار میں چھوڑ دیا کہ چریں، پانی پئیں اور نورالدین اور مریم بیٹھ کر اپنی اپنی کہانیاں سنانے اور جدائی کے شکوے شکایت کرنے لگے۔ اتنے میں انھوں نے گرد اٹھتی دیکھی جس سے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز اور ہتھیاروں کی جھنکار سُنائی دی۔ قصّہ یہ تھا کہ جب بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی وزیر سے کر دی اور وزیر اس رات اس کے پاس گیا تو صبح ہوتے بادشاہ انھیں صباح بہ خیر کہنے گیا جیسا کہ بادشاہوں کا اپنی بیٹیوں کے متعلّق دستور ہے۔ بادشاہ اپنے ساتھ ریشمی جوڑے لیتا گیا اور راستے میں چاندی سونا نچھاور کیا تاکہ نوکر چاکر اور سنگار کرنے والیاں انھیں اٹھا لیں۔ بادشاہ اور اس کے چند غلام چلتے چلتے نئے محل میں پہنچے، دیکھا کہ وزیر فرش پر پڑا ہوا ہے اور اُسے سر پا ئو کی خبر نہیں۔ بادشاہ نے محل میں اِدھر اُدھر دیکھا اس کی بیٹی بھی کہیں دکھائی نہ دی، وہ گھبرا گیا اس نے گرم پانی، سرکہ اور کُندر منگا کر آپس میں ملایا اور اُسے اس کی ناک میں ڈال کر اُسے خوب ہلایا۔ پنیر کے ٹکڑے کی طرح بھنگ اس کے پیٹ سے نکل پڑی۔ بادشاہ نے دوبارہ یہی کیا اور جب وزیر کو ہوش آیا تو اس نے اس کی اور اپنی بیٹی مریم کی

خیریت پوچھی۔ وزیر بولا اے عظیم الشان بادشاہ، سوا اس کے مجھے اس کی اور کوئی خبر نہیں کہ اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے ایک جام پلایا تھا۔ اس وقت سے مجھے کچھ خبر نہیں، نہ معلوم وہ کہاں ہے۔

بادشاہ نے وزیر کی یہ باتیں سنیں تو غصّے میں اندھا ہو گیا، تلوار کھینچ کر وزیر کے سر پر ایسا وار کیا کہ تلوار چمکتی ہوئی اس کے دانتوں سے نکل گئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے غلاموں اور سئیسوں کو بلا کر کہا کہ دونوں گھوڑے لے آؤ۔ وہ بولے اے بادشاہ! دونوں گھوڑے رات سے غائب ہیں ہمارا داروغہ بھی ان کے ساتھ غائب ہے اور آج صبح ہم نے دیکھا کہ سارے دروازے کھلے پڑے ہیں۔ بادشاہ نے کہا قسم ہے میرے دین و ایمان کی کہ دونوں گھوڑوں کو سوا میری بیٹی اور اس قیدی کے جو گرجا کی خدمت کرتا تھا کوئی نہیں لے گیا۔ وہی میری بیٹی کو پہلی بار بھی لے گیا تھا۔ اسے میں خوب پہچان گیا تھا، اسی کانے وزیر نے اسے میرے پنجے سے چھڑایا اور اب اس نے مجھے اس کا بدلہ دیا۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے فوراً اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا، تینوں بڑے بہادر اور سورما تھے، ہر ایک شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں ایک ایک ہزار کی برابر تھا۔ بادشاہ نے ان سے چلّا کر کہا کہ سوار ہو جاؤ، وہ سوار ہو گئے اور بادشاہ بھی اپنے بطریقوں، مصاحبوں اور سرداروں کو لے کر ان کے ساتھ سوار ہو گیا مریم اور نورالدین کے کھوج میں چل کھڑے ہوئے اور اسی وادی میں آکر انھیں پکڑا۔ انھیں دیکھ کر مریم اٹھ کھڑی ہوئی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار باندھ لی، ہتھیار لگا لیے اور نورالدین سے کہنے لگی کہ لڑائی میں تیرا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ لڑائی میں میری ثابت قدمی

ایسی ہے جیسی کھونٹی کی تاڑ میں۔
نورالدین کی یہ باتیں سُن کر مریم مسکرانے لگی اور بولی اے میرے آقا نورالدین، تو اپنی جگہ کھڑا رہیو، بس ان کے لیے کافی ہوں خواہ ان کا شمار ریت کے ذرّوں کی طرح کیوں نہ ہو۔ اب مریم تیار ہو کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئی باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور گھوڑا اس طرح چل نکلا جیسے آندھی یا نل کا پانی۔ مریم اپنے زمانے کی سب سے بہادر لڑکی تھی کیوں کہ باپ نے اسے بچپن ہی سے شہسواری اور جنگ جوئی سکھائی تھی۔ اس نے نورالدین سے کہا کہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پیچھے پیچھے رہیو اور اگر ہم بھاگیں تو خبردار تو گھوڑے سے گریو نہیں یاد رکھ تیرے گھوڑے کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ جب بادشاہ کی نظر اپنی بیٹی مریم پر پڑی تو وہ اسے پہچان گیا اور اپنے بڑے بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے برطوط، مجھے یقین ہے کہ یہ تیری بہن مریم ہے، وہ ہمارے مقابلے پر آمادہ ہے اور ہم سے جنگ کرنا چاہتی۔ بڑھ کر اس پر حملہ کر لیکن قسم ہے تجھے مسیح اور سچے دین کی اگر تو اس پر فتح پا جائے تو جب تک عیسائیوں کا دین اس کے سامنے پیش نہ کر لیجیو اسے قتل نہ کیجیو۔ اگر وہ اپنا پُرانا دین اختیار کر لے تو اسے گرفتار کر کے لے آئیو، اور اگر انکار کرے تو اسے بُری طرح سے قتل کر دیجیو تاکہ لوگ عبرت پکڑیں اور یہی کارروائی اس ملعون کے ساتھ کیجیو جو اس کے ساتھ ہے۔ برطوط بولا سر آنکھوں سے اور فوراً بڑھ کر اس نے اپنی بہن مریم پر حملہ کر دیا۔ وہ بھی اُدھر سے بڑھ کر اس کے قریب آ گئی۔ برطوط نے کہا اے مریم، کیا یہ کافی نہ تھا کہ تو نے باپ داداؤں کا مذہب چھوڑ کر خانہ بدوشوں کا مذہب یعنی اسلام اختیار کر لیا! قسم ہے مسیح اور سچے دین کی اگر تو نے

اپنے باپ دادا بادشاہوں کا دین نہ اختیار کر لیا اور اس کی اچھی طرح پیروی نہ کی تو میں تجھے اس بُری طرح سے قتل کروں گا کہ لوگوں کو عبرت ہوگی۔ مریم اپنے بھائی کی باتوں پر ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ گئی بات پھر ہاتھ نہیں آتی نہ مر کر کوئی پھر زندہ ہونا ہے۔ ابھی تو تجھے اس سے زیادہ ناکامیاں اٹھانی ہیں۔ قسم ہے خدا کی کہ میں محمد بن عبداللہ کے دین سے منھ نہیں موڑوں گی کیوں کہ وہی سچا دین ہے۔ اگر مجھے موت کا جام بھی پینا پڑے تو بھی میں اس سیدھے راستے سے نہیں پھروں گی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی۔۔۔۔

آٹھ سو بانویں رات

آٹھ سو بانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! مریم نے کہا اگر مجھے موت کا جام بھی پینا پڑے تو بھی میں سیدھے راستے سے منھ نہیں موڑوں گی۔ جب ملعون برطوط نے اپنی بہن کو یہ کہتے سُنا تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اس پر وہ باتیں سخت گراں گزریں۔ اب دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ جب وہ اپنی بہن مریم پر کوئی نیا ہاتھ مارتا تو وہ اسے نہایت خوبی سے روک لیتی۔ اس لڑائی نے اتنا طول کھینچا کہ دونوں گرد آلود اور گھوڑے نظروں سے غائب ہو گئے۔ برطوط حملہ کرتے کرتے تھک گیا تو مریم نے اس پر ایسا وار کیا کہ اس کی تلوار چمکتی ہوئی گردن کے آر پار ہو گئی اور خدا نے جلدی سے اُس کی روح جہنم میں پہنچا دی جو بُری جگہ ہے۔ اب مریم گھوڑے کو میدان میں جولانی دینے لگی اور کہا ہے کوئی بہادر جنگ جو جو میرے مقابلے میں آئے؟

حتیٰ سوُرما نکل کر آئیں تاکہ میں انھیں ذلت کا جام پلاؤں۔ ای بُت پرستو، کافرو اور گمراہو، آج کے دن ایمان والوں کا چہرہ سفید ہوگا اور کافروں کا سیاہ۔

بادشاہ نے دیکھا کہ اس کا بڑا بیٹا مارا گیا تو وہ اپنا منّھ پیٹنے لگا کپڑے پھاڑ ڈالے اور منجھلے بیٹے کی طرف مخاطب ہوکر کہا ای برطوس، فوراً اپنی بہن مریم کے مقابلے کے لیے نکل اپنے بھائی برطوط کا بدلہ اس سے لے اور اسے ذلت و خواری کے ساتھ گرفتار کرکے میرے پاس لے آ۔ اس نے کہا ابا جان، سر آنکھوں سے اور فوراً اپنی بہن مریم کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور حملہ کر دیا۔ اُدھر سے مریم بھی حملہ آور ہوئی دونوں میں پہلے سے بھی زیادہ لڑائی ہونے لگی۔ بھائی نے دیکھا اس کی مریم کے آگے کچھ چلتی نظر نہیں آتی وہ چاہتا تھا کہ بھاگ کھڑا ہو مگر مریم نے اسے مہلت نہ دی اس کے قریب آکر ایسا ہاتھ دیا کہ اس کا سر بھُٹّا سا اُڑ گیا۔ اب مریم پھر میدان میں جولانی کرنے لگی اور کہا، کہاں ہیں شہسوار سوُرما اور کہاں ہے بے دین کا نا وزیر؟ اس کا باپ بادشاہ زخمی دل اور فگار آنکھوں سے کہنے لگا کہ قسم ہے مسیح اور سچّے دین کی اس نے میرے منجھلے بیٹے کو بھی قتل کر دیا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو آواز دی اور کہا ای فسیان، اپنی بہن سے لڑنے کے لیے تیار ہو جا، جا کر اپنے دونوں بھائیوں کا بدلہ لے اور اس کا مقابلہ کر خواہ اِدھر یا اُدھر، اور اگر تو اسے زیر کر لے تو بڑی طرح قتل کیجیو۔ غرض کہ اب مریم کا چھوٹا بھائی اس کے مقابلے میں نکلا، مریم نے اس پر نہایت بہادری اور خوبی سے حملہ کیا اور کہنے لگی ای ملعون، ای اللہ اور

مسلمانوں کے دشمن، میں تجھے بھی ابھی تیرے بھائیوں سے ملائے دیتی ہوں، کافروں کے رہنے کی جگہ بُری ہے۔ یہ کہہ کر اس نے میان سے تلوار نکالی اور ایسا وار کیا کہ اس کی گردن اور دونوں باہیں اُڑ گئیں، وہ بھی اپنے بھائیوں سے جا ملا اور خُدا نے اس کی روح فوراً جہنّم میں بھیج دی جو بُری رہنے کی جگہ ہے۔

جب بطریقوں اور شہسواروں نے جو بادشاہ کے ساتھ تھے دیکھا کہ اس کے تینوں بیٹے مارے گئے حالاں کہ وہ بڑے سوُرما تھے تو ان کے دل میں شہزادی مریم کی طرف سے ڈر بیٹھ گیا اور دہشت سما گئی، انھوں نے سر نیچا کر لیا۔ انھیں موت، سرکوبی اور ذلت و خواری کا یقین آگیا اور غصّے سے ان کے دل میں آگ بھڑک اٹھی وہ دُم دبا کر بھاگے۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے تینوں بیٹے مارے گئے اور لشکر بھاگ کھڑا ہوا تو وہ حیران و پریشان ہو گیا اور ڈرنے لگا اس کے دل میں ایک آگ بھڑکنے لگی اور وہ اپنے جی میں کہنے لگا کہ شہزادی مریم ہمیں بے حد حقیر سمجھتی ہے۔ اگر میں ہمّت کر کے اکیلا اس کے مقابلے میں نکلوں تو ممکن ہے کہ وہ مجھے بھی نیچا دکھلائے اور بری طرح سے قتل کر دے جیسے کہ اس نے اپنے بھائیوں کو قتل کیا ہے کیوں کہ اسے اب ہم سے کوئی امید باقی نہیں نہ ہمیں اس کے لوٹ آنے کی پروا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ میں اپنی عزت بچا کر اپنے شہر چلا جاؤں۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور اپنے شہر کی طرف چل دیا۔ جب وہ محل میں پہنچا تو اس کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی کیوں کہ اس کے تینوں بیٹے

مارے گئے اور لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور عزت خاک میں مل گئی۔ ابھی وہ آدھے ہی پل بیٹھا ہوگا کہ اس نے اپنے مصاحبوں اور سرداروں کو بلوایا اور ان سے اپنی بیٹی کی شکایت کی کہ اس نے اس کے تینوں بیٹوں کو قتل کر دیا جس پر اسے بے حد رنج و غم ہے اور ان سے مشورہ چاہا۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ وہ خلیفہ ہارون الرشید کے نام خط لکھے اور اسے سارے واقعے سے آگاہ کرے۔ بادشاہ نے خلیفہ ہارون الرشید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "امیر المومنین کو سلام کے بعد معلوم ہو کہ میری ایک بیٹی ہے جس کا نام مریم زنّاریہ ہے۔ اسے ایک مسلمان قیدی نے جس کا نام نورالدین علی ابن تاجر تاج الدین مصری ہے خراب کر دیا تھا اور ایک رات لے کر بھاگ گیا تھا۔ میں اپنے آقا امیر المومنین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسلمان ملکوں میں خط لکھ کر اس کا پتا چلائے اور ایک معتمد ایلچی کے ہاتھ یہاں بھیج دے"

اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو ترانویں رات

آٹھ سو ترانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! افرنجہ کے بادشاہ نے امیر المومنین ہارون الرشید کو خط لکھا کہ میری بیٹی کو تلاش کر کے اپنے نوکروں میں سے ایک معتمد ایلچی کے ہاتھ میرے پاس بھیج دے۔ اس خط میں یہ بھی تھا کہ "مہربانی کے بدلے میں تجھے رومۃ الکبریٰ کا آدھا شہر دے دوں گا تاکہ تو وہاں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوا لے اور اس کا خراج وصول کرے"۔ جب وہ اپنے درباریوں اور مصاحبوں

کے مشورے کے مطابق یہ خط لکھ چکا تو اس نے اسے لپیٹا اور اس وزیر کو بلوایا جسے اس نے کانے وزیر کی جگہ وزیر بنایا تھا اور اس سے کہا کہ اس پر شاہی مہر لگا۔ اسی طرح تمام سرداروں نے اپنے اپنے دستخط کر کے مہریں لگادیں۔ اب بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اگر تو میری بیٹی کو لے آیا تو میں تجھے دو امیروں کی جاگیر عطا کروں گا اور دوہری جھالر کی خلعت پہناؤں گا۔ یہ کہہ کر اس نے وزیر کو خط دیا اور کہا بغداد جا کر یہ خط خود خلیفہ کے ہاتھ میں دیجیو۔ وزیر خط لے کر روانہ ہو گیا، گھاٹیاں اور بیابان طے کرتا ہوا بغداد پہنچا۔ وہاں پہنچ کر وہ پہلے تین دن سستایا، پھر لوگوں سے امیرالمومنین ہارون الرشید کے محل کا پتا دریافت کیا۔ لوگوں نے اسے وہاں پہنچادیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر امیرالمومنین سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ جب اجازت مل گئی تو وزیر اندر گیا اور اس کے آگے زمین چوم کر اسے افرنجہ کے بادشاہ کا خط پیش کیا اور اس کے ساتھ وہ تحفے تحائف بھی جو امیرالمومنین کے قابل تھے۔ جب امیرالمومنین نے خط کھول کر پڑھا اور اس کا مطلب سمجھا تو فوراً اپنے وزیروں کو حکم دے دیا کہ تمام اسلامی ممالک میں خط لکھے جائیں۔ وزیروں نے خطوط لکھے، مریم اور نورالدین کے حلیے اور دونوں کے نام لکھے اور یہ کہ وہ بھاگ کر آئے ہیں، جو کوئی انھیں پکڑے امیرالمومنین کے پاس بھیج دے، اور خبردار اس میں نہ سستی کی جائے نہ غفلت۔ خطوط پر مہر لگی اور وہ پیادوں کے ہاتھ ہر صوبے میں روانہ کر دیے گئے۔

یہ تو ان بادشاہوں کا قصہ ہوا، اب نورالدین مصری اور افرنجہ کے بادشاہ کی بیٹی مریم زنّاریہ کی داستان سنو۔ بادشاہ اور اس کے لشکر کے بھاگنے کے بعد انھوں نے فوراً سوار ہو کر شام کی راہ لی، خدا نے ان کی

پردہ پوشی کی اور وہ دمشق پہنچ گئے۔ لیکن خلیفہ کے فرستادے ان سے ایک دن پہلے وہاں پہنچ چکے تھے اور دمشق کے والی کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ دونوں جب کبھی آ سے ملیں وہ انھیں پکڑ کر خلیفہ کے پاس بھیج دے۔ جوں ہی دونوں دمشق میں داخل ہوئے جاسوسوں نے ان کے پاس جا کر ان کے نام پوچھے، انھوں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور اپنا سارا قصہ سُنا دیا۔ جاسوسوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں یہی ہیں وہ انھیں پکڑ کر دمشق کے والی کے پاس لے گئے اور والی نے انھیں دارالسلام بغداد بھجوا دیا۔ بغداد پہنچ کر انھوں نے امیرالمومنین ہارون الرشید سے ملنے کی اجازت مانگی اجازت ملنے کے بعد وہ اس کے پاس آئے اس کے آگے زمین چومی اور کہا اے امیرالمومنین، یہ ہے افرنجہ کے بادشاہ کی بیٹی مریم زنّاریہ اور یہ ہے مصری تاجر تاج الدین کا بیٹا نورالدین جس نے اسے خراب کیا ہے اور اسے اس کے وطن سے چُرا کر دمشق لایا ہے۔ ان کے داخل ہوتے ہی ہم نے انھیں پکڑا اور ان کے نام پوچھے انھوں نے سچ سچ بتا دیا۔ اس کے بعد ہم انھیں لے کر تیری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

امیرالمومنین کی نظر مریم پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ اس کا قد درمیانہ بدن سڈول اور باتیں میٹھی ہیں اس جیسی حسین دُنیا میں نہ ہو گی، علاوہ بریں اس کے چہرے سے بہادری ٹپکتی ہے۔ خلیفہ کے قریب پہنچ کر مریم نے اس کے آگے زمین چومی اور دُعا دی کہ خدا اس کی عزت اور نعمتیں قائم رکھے اور اسے آفتوں سے بچائے! خلیفہ کو اس کی خوب صورتی اور شیریں زبانی پر تعجب ہوا اس نے پوچھا کہ تو ہی مریم زنّاریہ ہے جو افرنجہ کے بادشاہ کی بیٹی ہے؟ مریم نے کہا ہاں اے امیرالمومنین، موحدین کے امام، دین کی

پشت و پناہ اور رسول اللہ کے چچا زاد بھائی۔ اب خلیفہ نے علی نورالدین کی طرف نظر اٹھائی دیکھا کہ وہ بڑا خوش رو اور خوب صورت جوان ہو گویا چودھویں رات کا چاند۔ خلیفہ نے پوچھا، علی نورالدین تو ہی ہو جو تاجر تاج الدین کا بیٹا اور قیدی ہو؟ اس نے کہا ای امیرالمومنین! ہاں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تو اس لڑکی کو اس کے باپ کے مُلک سے کیوں بھگا لایا؟ اس پر نورالدین نے سارا قصّہ شروع سے لے کر آخر تک بیان کر دیا۔ یہ قصّہ سُن کر خلیفہ کو بڑا اچنبھا ہوا اور خوشی بھی ہوئی اور وہ کہنے لگا کہ مرد کیا کیا تکلیفیں جھیلتے ہیں! اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی . . . . .

آٹھ سو چورانویں رات

آٹھ سو چورانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ، خلیفہ ہارون الرشید کو نورالدین کا قصّہ سُن کر بڑا تعجب ہوا، اس نے شہزادی مریم کی طرف مخاطب ہو کر کہا ای مریم سُن، تیرے متعلق تیرے باپ افرنجہ کے بادشاہ نے مجھے لکھا ہو، تو کیا کہتی ہو؟ مریم نے کہا ای زمین پر خدا کے خلیفہ اور نبی کی سنتوں اور فرضوں کے قائم کرنے والے، خُدا تجھے ہمیشہ نعمتوں میں رکھے اور تکلیفوں سے بچائے! تو خدا کی زمین پر اس کا نائب ہو اور میں تمھارے دین میں داخل ہو چکی ہوں کیوں کہ وہی مضبوط اور صحیح دین ہو اور میں نے کافروں کا مذہب چھوڑ دیا ہو جو مسیح پر بہتان لگاتے ہیں۔ میں خدا پر اور ان چیزوں پر جو اس کا رسول لایا ہو ایمان رکھتی ہوں، پاک خدا کی پرستش کرتی ہوں، اس کی توحید کی قائل

ہوں، اس کے آگے عاجزی سے سجدہ کرتی، اس کی بزرگی بیان کرتی ہوں اور خلیفہ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ سوا خدا کے اور کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں جنھیں اس نے ہدایت اور سچا دین لے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دکھائے خواہ مشرکین کتنا ہی برا کیوں نہ مانیں۔ اے امیر المومنین، کیا تیرا دل یہ گوارا کر سکتا ہے کہ ملحدوں کے بادشاہ کے لکھنے پر تو مجھے کافروں کے ملک کو بھیج دے جو خدا کے ساتھ شرک، صلیب کی تعظیم اور بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور عیسیٰ کی الوہیت کے قائل ہیں حالاں کہ وہ مخلوق ہے! اے خدا کے نائب، اگر تو نے ایسا کیا تو میں حشر کے دن خدا کے آگے تیرا دامن پکڑوں گی اور تیرے چچیرے بھائی رسول اللہ کے آگے تیری شکایت کروں گی اور "وہ وہ دن ہوگا کہ نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، اگر کوئی چیز کام آئے گی تو انسان کا سچا دل"۔ امیر المومنین نے کہا اے مریم! خدا نہ کرے کہ میں ایسا کروں۔ میں ایک مسلمہ موحد کو ایسی جگہ کیسے بھیج سکتا ہوں جہاں خدا اور اس کے رسول نے منع کیا ہو۔ مریم بولی میں اقرار کرتی ہوں کہ سوا خدا کے اور کوئی معبود نہیں اور یہ بھی اقرار کرتی ہوں کہ محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ امیر المومنین نے کہا، مریم، خدا تجھے برکت دے اور اسلام کی طرف اور زیادہ ہدایت کرے۔ چوں کہ تو مسلمان ہو گئی ہے تیرا ہم پر حق ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ میں تیرے ساتھ کبھی ناانصافی نہ کروں گا خواہ تیرے بدلے مجھے زمین بھر سونا اور جواہرات ہی کیوں نہ مل رہے ہوں۔ تو اطمینان رکھ اور بالکل غم نہ کر۔ کیا تو اس پر راضی ہے کہ یہ جوان علی مصری تیرا شوہر ہو اور تو اس کی بیوی۔ مریم بولی میں کیوں کر راضی نہ ہوں گی کہ یہ میرا شوہر ہو! اسی نے تو اپنے مال سے

مجھے مول لیا ہے اور میرے اوپر بڑے بڑے احسان کیے ہیں، منجملہ ان کے وہ میری خاطر کئی بار اپنی جان پر کھیل چکا ہے۔

امیرالمومنین نے لڑکی کی شادی نورالدین سے کردی اس کا مہر باندھا اور شادی کے دن قاضی اور گواہوں کو بُلواکر اس کا نکاح نامہ لکھوا دیا، وہ دن دیکھنے کے قابل تھا۔ اب امیرالمومنین روم کے بادشاہ کے وزیر کی طرف مخاطب ہوا جو اس وقت وہاں موجود تھا اور اس سے کہنے لگا تونے اس کی باتیں سنیں؟ وہ اب مسلمان ہے اور میں اسے اس کے باپ کے پاس جو کافر ہے کیوں کر بھیج سکتا ہوں، وہ اس کے ساتھ بُرا سلوک اور اس پر ظلم کرے گا خاص کر اس وجہ سے کہ اس نے اس کے بیٹوں کو قتل کیا ہے، اور قیامت کے دن اس کا گناہ میری گردن پر ہوگا! لہٰذا تو اپنے وطن واپس جاکر بادشاہ سے کہہ دے کہ یہ باتیں جانے دے اور بیٹی سے ہاتھ دھو بیٹھ۔ وزیر بے وقوف تو تھا ہی کہنے لگا اے امیرالمومنین قسم ہے سچ اور سچے دین کی کہ میں بغیر مریم کو لیے واپس نہیں جاسکتا خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوگئی ہو، اگر میں بے اس کے گیا تو بادشاہ مجھے مار ڈالے گا۔ خلیفہ بولا کہ پکڑو اس مردود کو، اسے قتل کردو اور جلا دو۔ شہزادی مریم بولی اے امیرالمومنین، اس مردود کے خون سے اپنی تلوار گندی نہ کر اور خود تلوار کھینچ کر اس پر ایسا وار کیا کہ سر تن سے جدا ہوگیا اور وہ جہنم واصل ہوا۔ خلیفہ کو اس کی پھرتی اور دلیری پر بڑا تعجب ہوا۔ اس کے بعد خلیفہ نے نورالدین کو خلعت بخشا اور دونوں کے لیے خاص اپنے محل میں ایک حصّہ عنایت کیا، ان کا ماہانہ اور روزینہ مقرر کردیا اور حکم دے دیا کہ ان کے لیے تمام ضروری چیزیں کپڑے، فرش اور نفیس برتن مہیا کردیے جائیں۔ غرض کہ وہ بغداد میں نہایت عیش و

عشرت سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس کے بعد نورالدین کو اپنے ماں باپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اس نے خلیفہ سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے وطن جا کر عزیز و اقارب سے ملے اور مریم کو بھی بلا کر خلیفہ کے سامنے پیش کیا۔ خلیفہ نے اجازت دے دی۔ قیمتی ہدیے اور تحفے ان کے ساتھ کر دیے، دونوں کو ایک دوسرے کی خبر گیری کرنے کی تاکید کر دی اور حکم دیا کہ مصر کے امرا، علما اور روسا کو خطوط لکھے جائیں کہ وہ نورالدین، اس کی بیوی اور ماں باپ کی خبر گیری رکھیں اور ان کا احترام کریں۔ جب یہ خبر تاج الدین کو مصر میں پہنچی تو وہ اپنے بیٹے کی واپسی پر بے حد خوش ہوا ماں کو بھی بہت خوشی ہوئی اور خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سارے بڑے لوگ اس کے خیر مقدم کے لیے گئے اس سے ملے، یہ دن دیکھنے کے قابل تھا کہ سب پیارے آپس میں مل گئے۔ آئے دن کسی نہ کسی امیر کے گھر ان کی دعوت ہونے لگی اور سبھوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ نورالدین سے مل کر اس کے والدین بہت خوش ہوئے اور ان کا رنج و غم دور ہو گیا، اسی طرح وہ شہزادی مریم سے مل کر بے حد خوش ہوئے، اس کی بڑی عزت کی ہر دن ان کے لیے عید کا دن تھا وہ نہایت عیش و عشرت سے دن گزارنے لگے یہاں تک کہ مزوں کو کرکرا اور صحبتوں کو تتر بتر کرنے والی، گھروں اور محلوں کو اجاڑنے اور قبروں کو آباد کرنے والی موت آ پہنچی، وہ دنیا سے چل بسے اور ان کا شمار مُردوں میں ہو گیا۔ پاک ہے وہ ذات جو زندہ ہے اور کبھی مرتی نہیں اور جس کے ہاتھ میں حکومت کی کنجیاں ہیں۔

مصری شوہر اور فرنگن بیوی کی کہانی

قاہرہ کا والی امیر شجاع الدین بیان کرتا ہے کہ ہم نے ایک رات صعید مصر میں ایک شخص کے ساتھ گزاری، اس نے ہماری دعوت کی اور ہمارا بہت احترام کیا۔ یہ شخص گندم گوں کیا بلکہ خاصا سیاہ فام اور بوڑھا تھا مگر اس کے چھوٹے چھوٹے بچے گورے اور سرخی مائل تھے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تیرے بچے گورے ہیں اور تو سیاہ؟ اس نے جواب دیا کہ ان کی ماں فرنگن ہے اور یہ عجیب و غریب قصہ ہے۔ ہم نے کہا کہ کیا تو ہمیں یہ قصہ بتا سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں۔ سنو، میں نے ایک بار اس شہر میں سن کی کھیتی کی، جب وہ تیار ہو گئی تو اسے کاٹا اور بنایا۔ اس میں میرے پانسو دینار صرف ہوئے لیکن جب میں اُسے بیچنے لگا تو اس سے زیادہ دام کسی نے نہ لگائے۔ لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اُسے عکّا لے جاؤں، وہاں مجھے فائدہ ہوگا۔ اس وقت عکّا فرنگیوں کے ہاتھ میں تھا۔ میں سن لے کر عکّا گیا اور اس میں سے تھوڑا سا چھ مہینے کی میعاد پر بیچا۔ اسی اثنا میں ایک فرنگن میرے پاس سن خریدنے آئی، فرنگنوں کا دستور ہے کہ بازار میں بے نقاب پھرتی ہیں۔ اس کا حسن دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اس کے ہاتھ میں نے کچھ مال اُدھار بیچا اور وہ لے کر چل دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ پھر میرے پاس آئی پھر میں نے اس کے ہاتھ اُدھار بیچا لیکن پہلے سے بھی زیادہ مدت کے لیے۔ اب وہ بار بار آنے لگی اور تاڑ گئی کہ میں اسے چاہتا ہوں۔ وہ ہمیشہ ایک بڑھیا کے ساتھ آیا کرتی تھی، میں نے بڑھیا سے کہا کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں، کیا تو کسی ترکیب سے

میرا وصال اس سے کرا سکتی ہی؟ اس نے جواب دیا میں ترکیب تو نکال سکتی ہوں لیکن یہ بھید ہم تینوں سے باہر نہ جانے پائے۔ علاوہ اس کے تجھے کچھ دام بھی خرچ کرنے پڑیں گے۔ میں نے کہا اگر مجھے اپنی جان بھی دے دینی پڑے تو کم ہی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی - - - -

---

آٹھ سو پچانویں رات

آٹھ سو پچانویں رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! اس شخص نے کہا اگر مجھے جان بھی دے دینی پڑے تو دریغ نہ کروں گا۔ اب یہ فیصلہ ہوا کہ وہ بڑھیا کو پچاس دینار دے دے اور لڑکی اس کے پاس آ جائے۔ اس نے پچاس دینار نکال کر اسے دے دیے۔ جب بڑھیا نے دینار لے لیے تو کہنے لگی کہ آج رات کو وہ تیرے ہاں آئے گی، اس کے لیے کوئی جگہ اپنے گھر میں آراستہ کر رکھیو۔ اس شخص کا بیان ہی کہ میں نے جا کر اپنی حیثیت کے مطابق کھانا پینا اور موم بتیاں تیار کیں۔ میرا مکان سمندر کے کنارے تھا اور زمانہ گرمیوں کا، اس لیے میں نے چھت پر فرش بچھایا، فرنگن آئی ہم نے کھایا پیا اور جب رات زیادہ گزری تو ہم وہیں آسمان کے نیچے لیٹ گئے۔ چاند ہمارے اوپر چمک رہا تھا اور سمندر میں تاروں کے عکس ہمیں دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنے دل میں کہنے لگا تجھے خدا کے آگے شرم نہیں آتی کہ تو پردیس آسمان کے نیچے اور سمندر کے کنارے ہو کر ایک فرنگن کے ساتھ خدا کی نافرمانی کرتا اور دوزخ کے عذاب کا مستحق بنتا ہی۔ خداوندا! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ تیری شرم اور تیرے عذاب کے ڈر سے میں

آج رات اس فرنگن کے ساتھ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ کہہ کر میں صبح تک سوتا رہا، وہ صبح کو ناراض ہوکر اٹھی اور اپنے گھر چلی گئی میں اپنی ڈکان پر جاکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہ اور بڑھیا دونوں میرے پاس سے گزریں، وہ تیش میں بھری ہوئی تھی اور اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بے حال ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا تو ایسا کہاں کا آیا جو اس لڑکی سے کنارہ کشی کرتا ہے؟ کیا تو سری سقطی ہے یا بشر حافی، جنید بغدادی یا فضیل بن عیاض؟ یہ کہہ کر میں بڑھیا کے پاس گیا اور کہا کہ اسے دوبارہ میرے ہاں لا۔ بڑھیا بولی کہ مسیح کی قسم میں سنو دینار سے کم میں اُسے نہ لاؤں گی۔ میں نے اسے سنو دینار دے دیے اور وہ اسے پھر لے آئی۔ لیکن جب وہ میرے پاس آئی تو میں پھر وہی سوچ کر گناہ سے باز آیا اور اسے خدا کے ڈر سے چھوڑ دیا۔

صبح کو حسب معمول میں پھر اپنی ڈکان پر جا بیٹھا۔ بیٹھا ہی تھا کہ وہ بڑھیا تیوری چڑھائے میری ڈکان کے سامنے سے گزری۔ میں نے کہا اسے ایک دفعہ اور لے آ۔ وہ بولی اب پانسو دینار سے کم میں تو اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سن کر میں کانپ اُٹھا اور پکا ارادہ کر لیا کہ سن کے تمام دام لےکر اپنی جان کے فدیے میں دے دوں۔ اتنے میں ایک منادی ڈھنڈورا پیٹتا ہوا آیا کہ اے مسلمانو! جو وقتی صلح ہمارے اور تمہارے درمیان تھی ختم ہوگئی، اب جتنے تم میں سے یہاں باقی ہیں انھیں ہم ایک ہفتے کی مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اپنا کاروبار ختم کر کے اپنے اپنے ملکوں کو چلے جائیں۔ اس صورت میں اس لڑکی کا آنا جانا بھی معلوم اور میں اپنے سن کے دام لوگوں سے وصول کرنے لگا جسے میں نے اُدھار بیچا تھا، جتنے دام وصول ہو سکے وصول کیے اور جو باقی رہ گئے ان کے بدلے دوسرا مال لے لیا۔ غرض کہ عکا سے عمدہ عمدہ

مال لے کر چل دیا مگر دل میں اسی فرنگن کی لو لگی رہی کیوں کہ وہ میرے دل اور مال دونوں پر قبضہ کر چکی تھی، دمشق پہنچ کر سامان خوب مہنگا بیچا۔ صلح کے ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی تھیں، خدا نے مجھے بہت فائدہ دیا۔ اب میں نے ان کنیزوں کی تجارت شروع کر دی جو لڑائی میں پکڑی گئی تھیں تاکہ اس فرنگن کی طرف سے مجھے تسکین ہو جائے اور تین سال تک اسی کام میں لگا رہا۔ اس کے بعد جو ماجرا ملک ناصر کو فرنگیوں کے ساتھ پیش آیا سب جانتے ہیں۔ خدا نے اُسے ان پر فتح دی اور اس نے ان کے تمام بادشاہوں کو گرفتار کر کے خدا کے حکم سے سمندر کے کنارے کا تمام مُلک اپنے قبضے میں کر لیا۔ اس اثنا میں ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص ملک ناصر کے لیے ایک کنیز خریدنے میرے پاس آیا، میرے پاس ایک نہایت حسین کنیز تھی اسے میں نے پیش کیا اور اس شخص نے اسے سَو دینار میں خرید لیا۔ نوّے دینار تو اس نے نقد ادا کر دیے اور دس باقی رہے، اس وقت شاہی خزانے میں رُپے کی کمی تھی کیوں کہ سارا مال فرنگیوں کی لڑائی میں خرچ ہو چکا تھا۔ جب بادشاہ کو یہ خبر ملی تو اس نے کہا کہ اسے وہاں لے جاؤ جہاں قیدی لڑکیاں ہیں اور دس دینار کے بدلے ایک فرنگن لڑکی پسند کر لینے دو، اور شہرزاد کو صبح ہو تی . . . . .

آٹھ سو چھیانویں رات

آٹھ سو چھیانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! ملک ناصر نے حکم دیا کہ میں ایک کنیز پسند کر لوں، لوگ مجھے وہاں لے گئے

جہاں قیدی لڑکیاں تھیں۔ کنیزوں کو دیکھتے دیکھتے میری نظر اسی فرنگن لڑکی پر جا پڑی جس سے مجھے محبت تھی اور میں اسے پہچان گیا۔ وہ ایک فرنگی شہسوار کی بیٹی تھی، میں نے ان سے کہا کہ اسے مجھ کو دے دو۔ جب میں اسے لے کر اپنے خیمے میں آیا تو میں نے پوچھا کیا تو مجھے پہچانتی ہے؟ وہ بولی نہیں۔ میں نے کہا میں وہی تیرا دوست تاجر ہوں جو سن کی تجارت کرتا تھا میرے اور تیرے درمیان کچھ باتیں پیش آچکی ہیں تو مجھ سے ڈیڑھ سو دینار بھی لے چکی ہے۔ بلکہ پانسو دینار اور لینے کی امید رکھتی تھی اب میں نے دس دینار میں تجھے خرید لیا ہے۔ وہ بولی کہ یہ تیرے سچے دین کی بہ دولت ہے، میں اقرار کرتی ہوں کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔ غرض وہ مسلمان ہوگئی اور بہت اچھی مسلمان ہوئی۔ اب میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کی قسم جب تک میں آزاد کر کے قاضی کو خبر نہ کر لوں اس سے ہم بستر نہ ہوں گا، میں نے جا کر ابن شدّاد سے سارا ماجرا بیان کیا اور اس نے نکاح پڑھا دیا۔ میں اس سے ہم بستر ہوا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ اس کے بعد لشکر روانہ ہوگیا اور ہم لوگ دمشق چلے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد دونوں طرف سے معاہدہ ہوگیا کہ قیدی مردوں اور عورتوں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ اس معاہدے کی رو سے تمام قیدی مرد اور عورتیں واپس دے دی گئیں سوا اس عورت کے جو میرے پاس تھی کوئی باقی نہ رہا۔ اب لوگ کہنے لگے کہ فلاں شہسوار کی بیوی نہیں آئی، اس کے متعلق پوچھ گچھ اور بڑی جستجو ہونے لگی۔ لوگوں نے خبر دی کہ وہ میرے پاس ہے انھوں نے اُسے مجھ سے مانگا۔ میں اس کے پاس نہایت پریشان حالت میں پہنچا، میرا رنگ فق تھا۔ اس نے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ میں نے کہا بادشاہ کا فرستادہ

قیدیوں کو لینے آیا ہے اور تجھے بھی مجھ سے لینا چاہتا ہے۔ وہ بولی کہ گھبرا نہیں، مجھے بادشاہ کے پاس لے چل، میں جانتی ہوں کہ اس سے کیا کہنا چاہیے۔

مصری کا بیان ہے کہ میں اسے لے کر سلطان ملک ناصر کے پاس گیا دیکھا کہ فرنگیوں کے بادشاہ کا ایلچی اس کے دائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا یہی وہ عورت ہے جو میرے پاس ہے۔ ملک ناصر نے ایلچی کے سامنے اس سے پوچھا کہ تو اپنے وطن جانا چاہتی ہے یا اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، خدا نے تم سب کو آزاد کر دیا ہے۔ عورت نے سلطان سے کہا کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں اور میرا پیٹ دیکھ کہ حاملہ بھی ہوں، اب میرا وجود فرنگیوں کے لیے بے کار ہے۔ ایلچی نے کہا کون تجھے زیادہ عزیز ہے یہ مسلمان یا فلاں شہسوار جو تیرا شوہر ہے؟ اس نے وہی جواب دیا جو سلطان کو دیا تھا۔ ایلچی نے اپنے ساتھ والے فرنگیوں سے کہا کہ تم نے سن لیا کہ یہ کیا کہتی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔ ایلچی نے مجھ سے کہا کہ تو اپنی بیوی کو لے جا۔ میں ابھی چند قدم گیا ہوں گا کہ ایلچی نے مجھے واپس بلوایا اور کہا کہ لڑکی کی ماں نے میرے ساتھ اس کے لیے ایک امانت یہ کہہ کر بھیجی ہے کہ میری بیٹی قید میں ہے اس کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں، میں چاہتی ہوں کہ تو اسے یہ صندوق پہنچا دے۔ لہٰذا یہ صندوق بھی لیتا جا۔ میں نے صندوق لے لیا اور گھر پہنچ کر جب اسے کھولا تو دیکھا کہ اس کے کپڑے اسی طرح رکھے ہیں جیسے وہ چھوڑ آئی تھی اور دونوں توڑے بھی ایک پچاس اور دوسرا سو دینار کا اس میں رکھے ہوئے ہیں، اسی طرح بندھے ہوئے ان میں کوئی تغیر نہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، یہ اسی کے بچے ہیں اور وہ ابھی زندہ ہے اسی نے یہ کھانا تمھارے لیے پکایا ہے۔ یہ قصہ سن کر ہمیں سخت تعجب ہوا اور بڑا لطف آیا، خدا بہتر

جانے والا ہے۔

ایک مال دار بغدادی اور اس کی کنیز کی کہانی

پُرانے زمانے کا ذکر ہے، بغداد میں ایک امیرزادہ رہتا تھا جس نے اپنے باپ سے بہت بڑی میراث پائی تھی۔ اُسے ایک کنیز سے عشق تھا، کنیز کو بھی اس سے ایسی ہی محبت تھی جیسے اسے کنیز سے۔ اس نے کنیز کے اوپر اتنا خرچ کیا کہ تمام مال و دولت ختم ہو گیا۔ اب اس نے چاہا کہ کوئی کام کرے لیکن کام بھی اُسے نہ ملا۔ جب یہ جوان مال دار تھا تو وہ موسیقی کے استادوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا اسے اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی۔ اس کے بعض دوستوں نے اُسے مشورہ دیا کہ تیرے اور تیری کنیز کے لیے بہترین پیشہ یہ ہے کہ تم گایا کرو۔ اس سے تو بہت کچھ کما لے گا اور کھانے پینے کا سامان ہو جائے گا، لیکن نہ اس نے اسے پسند کیا نہ کنیز نے بلکہ کنیز نے اس سے کہا میری رائے یہ ہے کہ تو مجھے بیچ ڈال اور ہم دونوں اس مصیبت سے چھٹ جائیں۔ جو شخص مجھ جیسی کو مول لے گا وہ ضرور مال دار ہوگا اور جب عیش و عشرت میں رہنے لگوں گی تو کسی نہ کسی تدبیر سے پھر تیرے پاس آجاؤں گی۔ چناں چہ وہ کنیز کو بازار لے گیا۔ جس شخص کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی وہ بصرے کا رہنے والا ایک ہاشمی تھا بڑا ادیب، شریف اور سخی آدمی، اس نے ڈیڑھ ہزار دینار میں اسے خرید لیا۔ کنیز کے مالک کا بیان ہے کہ دام لے کر میں بہت پچھتایا، میں اور کنیز دونوں رونے لگے میں نے چاہا کہ سودا واپس ہو جائے لیکن خریدار راضی نہ ہوا۔ ناچار میں نے دیناروں

کو تھیلی میں رکھ لیا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں کیوں کہ گھر میں اس کے بغیر کیا جی لگتا، میں اتنا رویا پیٹا کہ کبھی ایسا نہ کیا ہوگا اور ایک مسجد میں جاکر بیٹھ گیا مجھے اپنے تن بدن کی خبر نہ رہی، تھیلی کو تکیے کی جگہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ رہا۔ نیند آگئی اسی بے خبری کی حالت میں کوئی شخص تھیلی کو میرے سر کے نیچے سے نکال کر بھاگا میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا دیکھا کہ تھیلی غائب ہے اس کے پیچھے دوڑنا چاہا لیکن میرے پانو میں رسّی بندھی ہوئی تھی منھ کے بل گر پڑا رونے پیٹنے اور اپنے دل میں کہنے لگا تیری جان بھی گئی اور مال بھی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی دکھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو ستانویں رات

آٹھ سو ستانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جوان نے کہا کہ جان بھی گئی اور مال بھی، اور میری حالت اتنی ابتر ہوئی کہ میں دجلہ پہنچا، اور منھ پر کپڑا لپیٹ دریا میں کود پڑا۔ آس پاس کے لوگ سمجھ گئے کہ کسی بڑی مصیبت کی وجہ سے میں نے یہ حرکت کی ہے وہ میرے پیچھے کود پڑے اور مجھے باہر نکال لائے اور مجھ سے وجہ پوچھی۔ میں نے اپنا قصہ سنایا تو انھیں بہت افسوس ہوا اور ایک بوڑھے شخص نے میرے پاس آکر کہا کہ تیرا مال تو جا چکا ہے، اب تو اپنی جان کھو کر کیوں جہنمی بنتا ہے؟ میرے ساتھ چل کر اپنا گھر دکھا۔ میں نے اس کے کہنے کی تعمیل کی جب ہم گھر پہنچے تو کچھ دیر تک وہ میرے ہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ مجھے ذرا تسکین ہوئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ چلا گیا۔ وہ چلا گیا تو پھر وحشت

نے عود کیا قریب تھا کہ میں خودکشی کرلوں لیکن مجھے آخرت اور دوزخ کی یاد آگئی اور میں اپنے گھر سے بھاگ کر ایک دوست کے پاس پہنچا اس سے سارا ماجرا بیان کیا۔ اُسے مجھ پر بہت ترس آیا وہ رونے لگا اور اس نے مجھے پچاس دینار دے کر کہا کہ میری رائے مان فوراً بغداد چلا جا اور جب تک لڑکی کی محبت تیرے دل سے نکل نہ جائے انھیں خرچ کر۔ تو تو منشیوں کی اولاد میں سے ہے، تیرا خط بہت عمدہ ہے تو ادب میں ماہر ہے، جس والی کے پاس تیرا جی چاہے اس کے ساتھ لگا رہ، ممکن ہے کہ خدا تجھے تیری کنیز سے ملا دے۔ میں نے اس کی رائے مان لی، میرا دل مضبوط ہو گیا غم و رنج میں کمی آئی اور میں نے واسط جانے کا ارادہ کر لیا کیوں کہ وہاں میرے عزیز و اقارب تھے۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک جہاز لنگر ڈالے کھڑا ہے اور ملاح اس میں سامان لاد رہے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ جہاز ایک ہاشمی کا ہے اس پوشاک میں ہم تجھے نہیں لے جا سکتے۔ میں نے انھیں کرائے کا لالچ دیا، وہ بولے اگر تو جانے پر تُلا ہوا ہے تو اس نفیس پوشاک کو اُتار ڈال اور ملاحوں کے کپڑے پہن کر ہمارے ساتھ ہو جا۔ گویا تو بھی ملاح ہے۔ میں نے جا کر ملاحوں کا لباس خریدا اور اسے پہن کر جہاز پر چڑھ گیا۔ یہ جہاز بصرے جا رہا تھا، مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میں نے دیکھا اس جہاز میں وہی میری کنیز ہے اور دو باندیاں اس کی خدمت کر رہی ہیں۔ اب میری پریشانی ذرا دُور ہوئی اور میں اپنے دل میں کہنے لگا کہ کم از کم بصرے تک تو میں اس کی صورت دیکھوں اور اس کا گانا سنوں گا۔ اتنے میں وہی ہاشمی چند لوگوں کے ساتھ سوار

آ پہنچا سب جہاز پر بیٹھ گئے اور جہاز چل نکلا۔
اس کے بعد ہاشمی نے کھانا نکالا اس نے کنیز نے اور سب لوگوں نے کھایا، ہاشمی نے کنیز سے کہا آخر کب تک تو نہ گائے گی اور گریہ وزاری کرتی رہے گی؟ تو ہی انوکھی تو نہیں جو اپنے محبوب سے جدا ہوئی ہو۔ یہ باتیں سُن کر مجھے یقین آگیا کہ اسے مجھ سے اب تک کتنی محبت ہے۔ اب ہاشمی نے کنیز کے سامنے پردہ ڈال دیا اور ان لوگوں کو بُلاکر جو میری طرف تھے پردے کے باہر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں معلوم ہوا کہ اس کے بھائی بند ہیں۔ وہ ان کے لیے ضروری چیزیں مثلاً شراب اور خشک میوہ نکال کر لایا سب کے سب کنیز سے گانے بجانے کا اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے سارنگی منگاکر اسے ٹھیک ٹھاک کیا اور گانے لگی۔ گاتے گاتے اس کا دل بھر آیا اس نے سارنگی پھینک دی اور گانا بند کر دیا۔ لوگوں کا مزا کرکرا ہوگیا اور میں غش کھاکر گر پڑا، انھیں گمان ہوا کہ مجھ پر جن چڑھ آیا ہے وہ میرے کان میں آیتیں پڑھنے لگے اور اسے برابر پھسلانے اور گانے پر آمادہ کرتے رہے آخر اس نے سارنگی لے کر دو شعر اور گائے اور غش کھاکر گر پڑی۔ لوگ رونے لگے، میں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگیا ملاح مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئے ہاشمی کے ایک غلام نے کہا کہ تم اس دیوانے کو کیوں اپنے ساتھ لائے ہو؟ ایک اور شخص بولا کہ کسی شہر کے پاس پہنچ کر اسے اُتار دینا تاکہ ہمیں اس سے نجات ملے۔ یہ سُن کر مجھے بہت رنج ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ ان لوگوں کے ہاتھ سے چھٹکارا اسی وقت ہو سکتا ہے جب میں کنیز کو اپنی موجودگی کی خبر کر دوں اور وہ لوگوں کو منع کردے کہ مجھے نہ اُتاریں۔
اب چلتے چلتے ہم ایک گاؤں کے پاس پہنچے، جہاز کے مالک نے لوگوں سے

کہا کہ ہمارے ساتھ خشکی پر اُترو، لوگ اُتر گئے۔ شام کا وقت تھا میں اُٹھ کر پردے کے پیچھے گیا اور سارنگی لے کر ایک ایک کرکے راگ بجانے لگا یہاں تک کہ اس راگ پر پہنچا جو لڑکی نے مجھ سے سیکھا تھا اور پھر جہاز میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

آٹھ سو اٹھانویں رات

آٹھ سو اٹھانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جوان نے کہا کہ میں اپنی جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ اتنے میں لوگ بھی خشکی پر سے آکر جہاز میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اس وقت خشکی اور سمندر پر چاندنی کھیت کیے ہوے تھی ہاشمی نے کنیز سے کہا کہ خدا کے لیے ہمارا مزا کرکرا نہ کر۔ کنیز نے سارنگی اٹھائی تاروں پر ہاتھ پھیرا اور ایک چیخ ماری، لوگوں کو گمان ہوا کہ اس کی جان نکل گئی۔ وہ بولی کہ میرا اُستاد اس جہاز میں ہے۔ ہاشمی بولا اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم ضرور اس کی صحبت سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی وجہ سے تیرا غم غلط ہوجاتا اور ہم تیرے گانے کا لطف بھی حاصل کرتے، جہاز میں اس کا ہونا ناممکن ہے۔ لڑکی نے کہا جب تک میرا اُستاد موجود ہے نہ میں سارنگی بجاسکتی نہ راگ گاسکتی ہوں۔ ہاشمی بولا اچھا ہم ملاحوں سے پوچھتے ہیں۔ لڑکی نے کہا ہاں پوچھ، اس نے ملاحوں سے پوچھا کہ کیا تم اپنے ساتھ اور کسی کو بھی لائے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، میں ڈرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تلاش کا خاتمہ کر دیا جائے اس لیے میں نے ہنس کر کہا میں اس کا اُستاد ہوں اور جب میں اس کا آقا تھا تو میں نے اسے کئی راگ سکھائے تھے۔ میری آواز

لڑکی کے کان میں پڑی تو وہ کہنے لگی خدا کی قسم یہ تو میرے آقا کی آواز ہے۔ غلام آکر مجھے ہاشمی کے پاس لے گئے اس نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا اور کہا ارے یہ تجھے کیا ہو گیا اور تجھ پر کیا مصیبت گزری؟ میں نے اپنی ساری روداد سُنا دی اور رونے لگا، ساتھ ہی پردے کے پیچھے سے لڑکی کے رونے کی آواز بلند ہوئی مجھ پر ترس کھا کر ہاشمی اور اس کے بھائی بند بھی رو پڑے ہاشمی کہنے لگا کہ واللہ میں اب تک نہ لڑکی کے پاس گیا ہوں نہ اس سے ہم بستر ہوا ہوں نہ آج تک اس کا گانا سُنا ہے۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے، میں بغداد محض گانا سُننے اور امیر المومنین سے اپنا وظیفہ لینے گیا تھا اور مجھے دونوں میں کامیابی ہوئی۔ جب میں اپنے وطن کو لوٹنے لگا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ کوئی بغدادی گانے والا میرے ساتھ رہنا چاہیے اور اس کنیز کو خرید لیا مجھے اس کی بالکل خبر نہ تھی کہ تم دونوں کی یہ حالت ہے۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ بصرے پہنچ کر اُسے آزاد کر دوں گا اور اس کی شادی تیرے ساتھ کر کے تیرے لیے کافی تنخواہ مقرر کر دوں گا بلکہ کافی سے بھی زیادہ، لیکن اس شرط پر کہ جب میں اس کا گانا سُننا چاہوں تو پردہ ڈال کر وہ پردے کے پیچھے سے گائے، میرے بھائیوں اور مصاحبوں کے ساتھ تو بھی موجود ہو۔ میں یہ سُن کر چُپ ہو گیا۔

اس کے بعد ہاشمی نے اپنا سر پردے کے اندر ڈال کر کہا اب تو خوش ہے؟ وہ اسے دُعائیں دینے لگی اور اس کی شُکر گزار ہوئی۔ پھر اس نے اپنے ایک غلام کو بُلا کر کہا کہ اس جوان کا ہاتھ پکڑ کر لے جا اس کے یہ کپڑے اُتار کر عمدہ لباس پہنا، عطر لگا اور ہمارے پاس لے آ۔ غلام مجھے لے گیا اور جو کچھ اس کے آقا نے حکم دیا تھا کیا اور پھر مجھے اس کے پاس لے آیا اور

جس طرح ان دونوں کے آگے شراب رکھی گئی میرے آگے بھی رکھی گئی لڑکی نے بہترین گانے گائے سب کو وجد آنے لگا اور مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی اب میں نے اس لڑکی سے سارنگی لے کر گانا شروع کیا۔ لوگ میرا گانا بجانا سُن کر بہت خوش ہوئے سارے راستے یہی کیفیت رہی، تھوڑی دیر میں گاتا اور تھوڑی دیر لڑکی یہاں تک کہ جہاز کنارے پر آکر ٹھیرا، جہاز نے لنگر ڈال دیا سب لوگ کنارے پر اُتر پڑے اور میں بھی اُتر پڑا۔ میں نشے میں تو تھا ہی پیشاب کرنے بیٹھا تو نیند آگئی مسافر جہاز پر بیٹھ کر چل دیے انھیں میرا پتا بھی نہ چلا کیوں کہ وہ بھی نشے میں تھے۔ اُدھر وہ بصرے پہنچ گئے اِدھر میری آنکھ اس وقت کھُلی جب دھوپ تیز ہونے لگی۔ میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا۔ میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ ہاشمی کا نام کیا ہے، اس کا گھر کہاں ہے اور وہ کس لقب سے پکارا جاتا ہے۔ حیران و پریشان تھا اور جو خوشی مجھے لڑکی سے مل کر ہوئی تھی خواب و خیال معلوم ہوتی تھی۔ اسی پریشانی کی حالت میں ایک بڑا جہاز میرے پاس سے گزرا میں اس میں بیٹھ کر بصرے پہنچا جہاں نہ میں کسی کو پہچانتا تھا اور نہ ہاشمی کا گھر جانتا تھا۔ وہاں ایک بقال کی دُکان پر جا کر میں نے اس سے دوات اور کاغذ مانگا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آٹھ سو ننانویں رات

آٹھ سو ننانویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جوان کا بیان ہے کہ میں دوات اور کاغذ لے کر کچھ لکھنے لگا۔ بقال نے دیکھا کہ میں خوش خط ہوں لیکن میرے کپڑے میلے کچیلے ہیں، اس نے میرا حال دریافت کیا میں نے

کہا پردیسی ہوں اور نادار۔ وہ بولا کیا تو میرے ساتھ رہنا پسند کرے گا؟ میں
تجھے کھانا کپڑا اور روزانہ نصف درہم دیا کروں گا تو میری دُکان کا حساب
کتاب رکھا کیجیو۔ میں نے کہا ہاں اور اس کے پاس ٹھیر گیا اس کی آمدنی اور
خرچ کا حساب لکھنے لگا۔ ایک مہینہ ہوگیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آمدنی
بڑھ گئی ہے اور خرچ کم ہوگیا ہے۔ اس پر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میرا
روزینہ ایک درہم کر دیا۔ جب ایک سال گزر گیا تو اس نے یہ تجویز پیش
کی کہ وہ میری شادی اپنی بیٹی سے کر دے اور دُکان میں مجھے اپنا ساجھی بنا
لے۔ میں نے اسے منظور کر لیا اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا اور دُکان کا کام
کاج کرنے لگا، باوجود ان سب باتوں کے میں ہمیشہ شکستہ دل رہتا اور میرے
چہرے سے غم ظاہر ہوتا۔ بقال شراب پیتا تو مجھے بھی پلاتا لیکن غم کی وجہ
سے میں منظور نہ کرتا۔ دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ ایک دن جب کہ میں
دُکان میں بیٹھا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ لوگ کھانا پینا لیے کہیں جا رہے ہیں
بقال سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ اس نے کہا آج کا دن سیر و تفریح کے
لیے مخصوص ہے تمام گانے بجانے والے اور امیر زادے سمندر کے کنارے
جا کر کھاتے پیتے اور نہر ابلہ پر درختوں کے درمیان سیر و تفریح کرتے ہیں۔
میرے دل نے کہا کہ میں بھی جا کر سیر کروں، ممکن ہے کہ جب میں ان لوگوں کو
دیکھوں تو میری محبوبہ بھی مل جائے۔ میں نے بقال سے کہا میں بھی سیر و تفریح
کے لیے جانا چاہتا ہوں، وہ بولا بہتر ہے۔ انھیں کے ساتھ چلا جا اور اس
نے میرے لیے کھانا پینا تیار کروا دیا میں نہر ابلہ پہنچا تو دیکھا کہ لوگ لوٹ
رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ لوٹ کر آنے لگا اتنے میں میری نظر اس
ناخدا پر پڑی جس کی کشتی میں ہاشمی اور کنیز تھے کہ وہ نہر ابلہ میں کشتی پر

بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اسے آواز دی اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مجھے پہچان کر اپنے ساتھ بٹھالیا اور کہنے لگے کہ تو زندہ ہے؟ اور مجھے گلے لگا کر میرا قصہ پوچھنے لگے۔

جب میں اپنا سارا قصہ سنا چکا تو وہ بولا ہمارا خیال تھا کہ تو نشے کی حالت میں پانی میں ڈوب گیا ہے۔ میں نے ان سے لڑکی کا حال پوچھا انھوں نے بیان کیا کہ جب اسے معلوم ہوا کہ تو کھو گیا ہے تو اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، سارنگی جلا ڈالی، رونے پیٹنے لگی۔ ہم بصرے پہنچے تو اس سے کہا کہ یہ رونا دھونا اور غم کرنا جانے دے۔ اس نے کہا میں کالے کپڑے پہنوں گی، اس گھر کے ایک کونے میں ایک قبر بنا کر اس کے پاس بیٹھی رہا کروں گی اور گانے سے توبہ کروں گی۔ ہم نے اس کے لیے یہ سب چیزیں بنا دیں اور وہ آج تک اسی حالت میں ہے۔ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ واقعی اسی حالت میں ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری میں سمجھا کہ اس کی جان نکل گئی اور اسے گلے لگا لیا اور دیر تک گلے لگائے رہا۔ ہاشمی نے مجھ سے کہا کہ اسے لے جا، میں نے کہا ہاں لیکن پہلے اسے آزاد کردے جیسا کہ تو نے وعدہ کیا تھا اور اس کا نکاح میرے ساتھ پڑھا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ہمیں بہت کچھ عمدہ سامان، لباس، فرش اور پانسو دینار دیے اور کہا کہ یہی رقم میں تجھے ہر مہینے دیا کروں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ تو میرا مصاحب رہے اور لڑکی گانا سنایا کرے۔ اس کے بعد اس نے ہمارے لیے ایک گھر خالی کرا دیا اور حکم دیا کہ ہماری سب ضروریات کی چیزیں اس میں منتقل کرا دی جائیں، میں لڑکی کو اس میں لے گیا۔ پھر میں نے بقال کے پاس جا کر اپنا سارا قصہ سنایا اور کہا کہ تو مجھے اجازت دے دے

کہ میں تیری لڑکی کو بے کسی جرم کے طلاق دے دوں۔ میں نے اس کا مہر بھی واپس کر دیا اور چیزیں بھی جو میرے اوپر واجب تھیں۔ دو سال تک ہاشمی کے ساتھ رہا خوب مال دار ہو گیا اور میری وہی حالت ہو گئی جو کنیز کے ساتھ بغداد میں تھی۔ خدا نے ہماری شکل دور کر دی، ہمیں بہت کچھ دیا اور صبر کے بدلے کام یابی عطا کی، واللہ اعلم۔

جلی عاد بادشاہ اور اس کے وزیر کی کہانی

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ہند کا ایک بادشاہ تھا، جلی عاد نام تھا، بہت بلند بالا خوب صورت، خوش سیرت، سخی اور عظیم الشان، فقیروں پر احسان کرتا، رعیت اور تمام ملک والوں سے محبت رکھتا۔ اس کے ماتحت بہتر بادشاہ تھے اور اس کے ملک میں تین سو پچاس قاضی، اس کے ستر وزیر تھے اور ہر دس سپاہیوں پر ایک سردار، بڑے وزیر کا نام شماس تھا، اس کی عمر بائیس سال کی تھی وہ بڑا خلیق، نرم زبان، سوچ سمجھ کر جواب دینے والا، ہر بات میں پکا، حکیم، مدبر، باوجود کم سنی کے حکم رانی میں قابل اور علم و ادب میں ماہر۔ بادشاہ اس سے بے حد محبت کرتا اور اس کی فصاحت، بلاغت اور سیاست دانی کی وجہ سے اس کا بہت گرویدہ تھا اور اس وجہ سے بھی کہ خدا نے اس کے دل میں رحم اور رعیت پروری عطا کی تھی۔ بادشاہ بھی بڑا انصاف پسند تھا، رعیت کی حفاظت، چھوٹوں بڑوں کے ساتھ احسان کرتا اور جس رعایت، بخشش، امان اور اطمینان کی ضرورت انھیں ہوتی اسے مہیا کرتا، رعیت سے خراج کم لیتا، ہر چھوٹے بڑے سے محبت رکھتا، ان کے

ساتھ احسان کرتا اور شفقت سے پیش آتا۔ غرض کہ وہ ان کے ساتھ ایسی خوش خلقی سے پیش آتا کہ پہلے کبھی کوئی نہ پیش آیا ہوگا۔ باوجود ان تمام باتوں کے اولاد کی طرف سے بدنصیب تھا جب یہ خیال آتا کہ خدا نے سب کچھ دیا مگر کوئی بیٹا نہیں دیا تو کلیجے پر سانپ سا لوٹ جاتا۔ ایک دن وہ لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ میرے بعد حکومت و سلطنت کا کیا حشر ہوگا کہ اُسے نیند آگئی، اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک درخت کی جڑ میں پانی ڈال رہا ہے، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

نوسوویں رات

نوسوویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! جلی عاد نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک درخت کی جڑ میں پانی ڈال رہا ہے، اس درخت کے آس پاس اور بہت سے درخت ہیں، اتنے میں اس درخت سے آگ نکلی اور اس نے آس پاس کے تمام درخت جلا دیئے۔ بادشاہ کی خوف سے آنکھ کھُل گئی۔ ایک غلام کو بُلا کر کہا کہ وزیر کو فوراً بُلا لا۔ غلام نے شماس کے پاس جا کر کہا کہ بادشاہ نے تجھے فوراً بلایا ہے، وہ ابھی گھبرایا ہوا نیند سے اُٹھا ہے اور مجھے بھیجا ہے کہ تجھے فوراً لے چلوں۔ غلام کی یہ باتیں سُن کر شماس فوراً چل کھڑا ہوا، بادشاہ کے پاس پہنچا دیکھا کہ وہ فرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ شماس نے اس کے آگے سجدہ کیا دعا دی کہ اس کی عزت اور نعمتیں قائم و دائم رہیں اور کہنے لگا اے بادشاہ! خدا تجھے کبھی غمگین نہ کرے! آج رات تو نے کیا خواب دیکھا کہ ڈر گیا اور فوراً مجھے بُلوایا؟ بادشاہ

بولا بیٹھ جا وہ بیٹھ گیا اور بادشاہ نے خواب بیان کرنا شروع کیا کہ میں نے رات ایسا خواب دیکھا ہے جس سے میں ڈر گیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں ایک درخت کی جڑ میں پانی ڈال رہا ہوں، اس درخت کے آس پاس اور بہت سے درخت ہیں۔ اتنے میں اس درخت کی جڑ سے ایک آگ نکلی اس نے آس پاس کے سارے درخت جلا دیے۔ یہ خواب دیکھ کر میں سہم گیا، کانپنے لگا اور تجھے بلوا بھیجا کیوں کہ تو بڑا ماہر ہے خواب کی تعبیر جانتا ہے بڑا عالم اور دانش مند ہے۔ شماس نے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکا لیا اور پھر مسکرانے لگا۔ بادشاہ نے پوچھا اے شماس تیری سمجھ میں کیا آتا ہے؟ سچ سچ کہہ دے اور مجھ سے کچھ نہ چھپا۔ شماس کہنے لگا اے بادشاہ! خدا نے تیری دعا منظور کر لی وہ تیری آنکھیں ٹھنڈی کرے گا۔ اس خواب کی تعبیر بہت نیک ہے وہ یہ کہ خدا تجھے ایک لڑکا دے گا وہ تیری بڑی عمر کے بعد تیرا وارث ہوگا لیکن اس میں ایک بات ہوگی جس کا بیان کرنا میں اس وقت مناسب نہیں سمجھتا کیوں کہ ابھی اس کی تفصیل کا وقت نہیں آیا ہے۔

یہ سن کر بادشاہ خوش ہو گیا اس کا ڈر جاتا رہا اور کہنے لگا کہ اگر یہ بات ہے تو جب تعبیر پوری کرنے کا وقت آ جائے تو اسے پورا کر دیجیو تاکہ میری خوشی پوری ہو جائے، میں اس سے محض خدا کی مرضی کا خواہاں ہوں۔ شماس نے دیکھا کہ بادشاہ پوری تعبیر سننے پر تلا ہوا ہے تو اس سے کچھ بہانہ کر کے ٹال دیا۔ بادشاہ نے اپنے ملک کے تمام نجومیوں اور تعبیر گویوں کو بلایا وہ سب حاضر ہوئے تو ان سے اپنا خواب بیان کیا اور کہا میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتاؤ۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بادشاہ سے اجازت مانگی کہ وہ بات کرے۔ بادشاہ نے اسے اجازت دے دی تو اس نے کہا اے بادشاہ سن۔ تیرا وزیر شماس تیرے خواب کی تعبیر بتانے سے عاجز

نہیں ہے لیکن اس نے اس وجہ سے نہیں بتایا ہے کہ تجھے پریشانی نہ ہو۔ یہ ہے وجہ کہ اس نے پوری تعبیر نہیں بتائی۔ لیکن اگر تو مجھے اجازت دے تو میں کہوں۔
بادشاہ بولا ای تعبیر گو، بلا کم و کاست کہ ڈال اور سچ سچ بتا۔ تعبیر گو نے کہا تیرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اُس وقت تیرا وارث ہوگا جب تو بڑی عمر کو پہنچ چکا ہوگا لیکن رعیت کے ساتھ اس کا برتاؤ وہ نہ ہوگا جو تیرا ہے بلکہ وہ تیرے دستور کے خلاف چلے گا لوگوں پر ظلم کرے گا اور اس کا وہی حشر ہوگا جو چوہے کو بلّی کے ساتھ ہوا، خدا اس سے محفوظ رکھے! بادشاہ نے پوچھا کہ بلّی اور چوہے کی کیا کہانی ہے؟

بلّی اور چوہے کی کہانی

تعبیر گو نے کہا خدا بادشاہ کی عمر دراز کرے! ایک بار ایک بلّی رات کے وقت ایک جھاڑی میں گئی کہ کچھ شکار مارے لیکن اُسے کچھ ہاتھ نہ لگا بلکہ وہ سردی اور بارش کی وجہ سے بیمار اور کمزور ہوگئی اور اپنے دل میں کہنے لگی کہ مطلب نکالنے کے لیے کوئی چال چلنی چاہیے۔ اتنے میں اسے ایک درخت کے نیچے ایک بل دکھائی دیا وہ اس کے قریب جاکر سونگھنے اور میاؤں میاؤں کرنے لگی یہاں تک کہ اسے پتا چل گیا کہ بل کے اندر ایک چوہا ہے اردگرد گھومنے لگی اور ارادہ کیا کہ چوہے کو پکڑنے کے لیے اندر گھسے۔ جب چوہے کو یہ معلوم ہوا تو اس نے بلّی کی طرف پیٹھ کرکے پاؤں ٹیک لیے تاکہ بل کا منھ بند ہو جائے اور بلّی اندر نہ آسکے۔ یہ دیکھ کر بلّی کمزور آواز سے کہنے لگی بھائی، تو یہ کیا کرتا ہے؟ میں تو تیرے پاس پناہ لینے آئی ہوں تاکہ

تو میرے حال پر رحم کھا کر مجھے آج رات اپنے بل میں رہنے دے، بڑھاپے اور کم نوزی کی وجہ سے بیمار ہو گئی ہوں، چلنے پھرنے سے معذور ہوں اور بڑی مشکل سے اس جھاڑی تک آئی ہوں۔ کتنی ہی بار میں نے موت کی دُعا مانگی ہو کہ مجھے آرام مل جائے۔ اب میں سردی اور بارش کی ماری تیرے دروازے پر پڑی ہوں اور تجھے خُدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ مہربانی کر اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے لے اور اپنے بل کے دروازے ہی پر مجھے پڑا رہنے دے، میں پردیسن اور مسکین ہوں مثل ہو کہ جو پردیسی مسکین کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہو قیامت کے روز اسے جنت دی جاتی ہو۔ ای میرے بھائی، تو اس بات کا مستحق ہو کہ میرا ثواب لے اور مجھے اجازت دے دے کہ میں آج رات صبح تک تیرے ہاں گزار دوں اور پھر چلتی بنوں، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

نوسو کے بعد پہلی رات

نوسو کے بعد پہلی رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! بلی نے چوہے سے کہا میں محض رات گُزار کر چلتی بنوں گی۔ بلی کی یہ باتیں سُن کر چوہا بولا تو کیسے میرے بل میں آسکتی ہو! تو تو میری قدرتی دُشمن ہو اور تیری غذا میرا گوشت ہو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تو مجھے کہیں دھوکا دے رہی ہو کیوں کہ یہ تیری فطرت ہو اور تیرے عہد و پیماں پر کوئی بھروسا نہیں۔ مثل ہو کہ بد اطوار شخص کے سپرد خوب صورت عورت کو نہیں کرنا چاہیے نہ فقیر نادار کے سپرد مال کو نہ آگ کے سپرد سوکھی لکڑی کو، اس لیے میں اپنے آپ کو تیرے حوالے

نہیں کر سکتا۔ عقل مندوں نے بھی کہا ہے کہ جب دشمن کم زور ہو جاتا ہے تو اس کی دشمنی بڑھ جاتی ہے۔ بلّی نے نہایت دھیمی آواز اور اداس چہرہ بنا کر کہا تیرا کہنا ٹھیک ہے، میں اس سے انکار نہیں کرتی لیکن درخواست کرتی ہوں کہ پچھلی باتیں معاف کرے جو میری اور تیری فطری دشمنی کی وجہ سے پیش آئی ہیں۔ بزرگ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ جو مخلوق دوسری مخلوق کو معاف کر دیتا ہے تو اس کا خالق بھی اس کے گناہ بخش دیتا ہے۔ میں کل تک تیری دشمن ضرور تھی مگر آج تیری دوستی کی طلب گار ہوں۔ یہ قول کسی کے کہ اگر تو اپنے دشمن کو دوست بنانا چاہتا ہے تو اس کے ساتھ نیکی کر، اور بھائی، میں تو خدا کے سامنے تجھ سے عہد و پیماں کرتی ہوں کہ میں تجھے کبھی نقصان نہ پہنچاؤں گی۔ علاوہ اس کے اب مجھ میں اس کی طاقت بھی نہیں، اس لیے خدا پر بھروسا کرکے میرے ساتھ بھلائی کر اور ای میرے بھائی، میرے عہد و پیماں پر بھروسا رکھ۔ چوہا بولا میں کیسے اس شخص کا عہد و پیماں مان سکتا ہوں جس کی دشمنی میرے ساتھ ازلی ہے اور جس کا دستور ہی مجھے دھوکا دینا ہو۔ اگر ہماری دشمنی سوا خون کے اور کسی چیز کی ہوتی تو بھی خیریت تھی لیکن وہ تو روحوں کے درمیان فطری دشمنی ہے۔ مثل ہے کہ جو کوئی اپنے آپ کو دشمن کے سپرد کر دیتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنا ہاتھ کالے سانپ کے منہ میں دے دے۔ بلّی نے ناراض ہو کر کہا اب میں پریشان ہو گئی ہوں اور میرا جسم کم زور ہو گیا ہے، نزع کی حالت ہے اور عنقریب تیرے دروازے پر میری جان نکل جائے گی اور میرا گناہ تیری گردن پر ہوگا کیوں کہ تو مجھے مصیبت سے نجات دے سکتا ہے اور نہیں دیتا، بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ یہ سن کر چوہا خدا سے ڈرا، اُسے ترس آ گیا اور وہ اپنے دل میں کہنے

لگا کہ جو خدا سے اپنے دشمن پر مدد لینا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ دشمن کے ساتھ
رحم اور نیکی سے پیش آئے میں خدا پر بھروسا کر کے اس بلی کو مرنے سے بچائے
لیتا ہوں تاکہ مجھے اس کا ثواب ملے۔ یہ کہہ کر چوہا باہر نکل آیا اور بلی کو گھسیٹ
کر اپنے بل میں لے گیا۔ بلی تھوڑی دیر تک اس کے پاس چپ چاپ بیٹھی
رہی یہاں تک کہ اس میں طاقت آگئی وہ سستا چکی اور ذرا دم لے لیا تو وہ
اپنی بیماری، کمزوری اور دوستوں کی کمی پر افسوس کرنے لگی، چوہا اس کو
دلاسا دیتے اور اس کی دلجوئی کرنے لگا، اس کے قریب آکر کبھی بیٹھتا کبھی
اس کے آس پاس پھرتا۔ اتنے میں بلی بل کے منھ پر ٹیک لگا کر لیٹ گئی
تاکہ چوہا اس کے قبضے میں رہے نکل نہ بھاگے۔ جب چوہا بل سے نکلنے
لگا تو ظاہر تھا کہ بلی کے پاس سے گزرے جوں ہی وہ بلی کے قریب آیا
اس نے اسے پکڑ کر پنجے میں دبوچ لیا، کاٹنے، جھنجھوڑنے، اچھالنے، لڑھکانے
نوچنے اور تکلیف دینے لگی۔ اب چوہا خدا سے دہائی مانگنے اور نجات کی درخواست
کرنے لگا اور ناراض ہو کر بلی سے کہا کہ وہ عہد و پیمان کہاں گیا جو تو نے باندھا
تھا اور کہاں ہوئیں وہ قسمیں جو تو نے کھائی تھیں؟ کیا یہی بدلہ ہے جو تو مجھے
دے رہی ہے؟ میں نے تجھے اپنے بل میں داخل کیا اور اپنی جان تیرے
سپرد کر دی، لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ جو اپنے دشمن کے ساتھ عہد باندھتا ہے
وہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ خیر مجھے اپنے پیدا کرنے والے پر بھروسا
ہے کہ وہ مجھے تیرے پنجے سے چھڑائے گا۔ چوہا یہی کہہ رہا تھا اور بلی ارادہ
کر ہی رہی تھی کہ اسے چٹ کر جائے اتنے میں ایک شکاری آپہنچا جس کے
پاس شکاری کتے تھے، ایک کتے نے بل کے پاس آکر دیکھا کہ اندر لڑائی
جھگڑا ہو رہا ہے اس نے خیال کیا کہ بل کے اندر لومڑی کسی چیز کا شکار

کر رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر کتا نیچے کی طرف دوڑا کہ اس کا شکار کرے اور بلّی کو پکڑ کر کھینچا۔ جب بلّی کتے کے پنجے میں پھنس گئی تو اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے اس نے چوہے کو چھوڑ دیا جو ابھی زندہ تھا بلکہ گھایل تک نہیں ہوا تھا۔ مگر بلّی کو شکاری کتا کھینچ کر باہر نکال لایا اور اس کی گردن توڑ کر پھینک دی، اور یہ مثل ٹھیک اتری کہ جو رحم کرتا ہے اس پر کسی نہ کسی دن رحم کیا جاتا ہے اور جو ظلم کرتا ہے وہ فوراً ظلم کا بدلہ پالیتا ہے۔

اے بادشاہ! یہ ہے جوان کے ساتھ پیش آیا لہٰذا کسی کو یہ نہ چاہیے کہ بھروسا کرنے والے کو دغا دے کیوں کہ جو شخص دغا دے گا اور خیانت کرے گا اس کا وہی حشر ہو گا جو بلّی کا ہوا، جیسی کرنی ویسی بھرنی اور جو نیکی کرے گا اس کا ثواب پائے گا۔ لیکن اے بادشاہ! افسوس نہ کر اور غمگین نہ ہو کیوں کہ ظلم و جور کرنے کے بعد تیرا بیٹا تیری اچھی عادتیں اختیار کرے گا۔ اور یہ فاضل شناس جو تیرا وزیر ہے چاہتا ہے کہ تجھ سے کوئی ایسی بات نہ چھپائے جس کا تعلق تجھ سے ہے اور اس کا ایسا کرنا بہت ٹھیک ہے کیوں کہ مثل ہے کہ وہی شخص سب سے زیادہ ڈرتا ہے جس کا علم سب سے زیادہ ہو اور جو بھلائی کرنے پر سب سے زیادہ تلا ہوا ہو۔ یہ سن کر بادشاہ قائل ہو گیا اور حکم دیا کہ انھیں بہت انعام دیا جائے۔ بعد ازاں بادشاہ نے انھیں رخصت کیا اور اٹھ کر اندر گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ جب رات ہوئی تو وہ اپنی ایک بیوی کے ساتھ ہم بستر ہوا جو اسے سب سے زیادہ عزیز اور پیاری تھی۔ چار مہینے گزرنے کے بعد بچہ اس کے پیٹ میں کلبلانے لگا اسے بے حد خوشی ہوئی اس نے بادشاہ کو خبر دی۔ بادشاہ بولا کہ میرا خواب ٹھیک نکلا، آیندہ خدا مددگار ہے۔ بادشاہ نے رانی کو بہترین محل رہنے کے لیے دیا، اسے بڑی عزت و حرمت سے رکھا اور لڑکے بہت

کچھ انعام دیا پھر اس نے ایک غلام کو بلا کر کہا، شماس کو بلا لا۔ شماس آیا تو بادشاہ نے اس سے اپنی بیوی کا حاملہ ہونا بیان کیا اور خوش ہو کر کہا کہ میرا خواب ٹھیک نکلا اور میری مراد بر آئی۔ یقین ہے کہ اس حمل سے بیٹا پیدا ہوگا اور میری بادشاہت کا وارث ہوگا۔ اے شماس، تیری کیا رائے ہے؟ شماس چپ رہا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادشاہ بولا کیا بات ہے کہ تو میری خوشی میں شامل نہیں ہوتا اور مجھے جواب نہیں دیتا؟ اے شماس، کیا یہ بات تجھے بری معلوم ہوتی ہے؟ شماس نے بادشاہ کے آگے سجدہ کر کے کہا اے بادشاہ، خدا تیری عمر دراز کرے! درخت کے سایہ میں بیٹھنے سے کیا فائدہ اگر اس میں سے آگ نکلنے لگے! صاف شراب پینے میں کیا مزا اگر وہ گلے میں پھنسی رہے! اور ٹھنڈا میٹھا پانی پینے سے کیا فائدہ اگر پینے والا اس میں ڈوب جائے! اے بادشاہ، میں خدا کا اور تیرا غلام ہوں لیکن میں کہوں گا کہ تین چیزوں کے بارے میں سمجھ دار آدمی کو بات نہیں کرنی چاہیے جب تک وہ پوری نہ ہو جائیں۔ ایک مسافر کے بارے میں جب تک وہ سفر سے لوٹ نہ آئے، دوسرے سپاہی کے بارے میں جب تک وہ دشمن کو زیر نہ کر لے، تیسرے حاملہ عورت کے بارے میں جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ اور شہرزاد کو صبح ہو گئی۔۔۔۔

نو سو کے بعد دوسری رات

نو سو کے بعد دوسری رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! یہ کہنے کے بعد کہ عقل مندوں کو تین چیزوں کے بارے میں زبان نہیں کھولنی چاہیے جب تک وہ پوری نہ ہو جائیں، شماس نے بادشاہ سے کہا اے بادشاہ

سُن! ادھوری بات کے بارے میں زبان کھولنے والے کی مثال ایسی ہے
جیسی اُس درویش کی جس کے سر پر گھی اُلٹ گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ
اس درویش کی کیا کہانی ہے اور اس کے ساتھ کیا گزری؟

درویش کی کہانی جس کے سر پر گھی اُلٹ گیا تھا

شماس نے کہا اے بادشاہ! کسی شہر میں ایک شریف کے ہاں ایک
درویش رہتا تھا جسے ہر روز اس شریف کے ہاں سے کھانا ملتا تین روٹیاں
تھوڑا سا گھی اور شہد۔ اس شہر میں گھی مہنگا تھا اس لیے وہ درویش گھی کو
ایک ہانڈی میں جمع کرتا جاتا یہاں تک کہ وہ بھر گئی۔ اس نے اس ڈر سے
کہ کہیں چوری نہ ہو جائے اپنے اوپر چھینکے میں لٹکا دیا۔ ایک رات جب کہ وہ
ڈنڈا لیے اپنے فرش پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ گھی اس شہر میں مہنگا ہے مجھے
سب کا سب گھی بیچ کر ایک بھیڑ خریدنی اور اس میں ایک کسان سے
ساتھ ساجھا کرنا چاہیے۔ پہلے سال اس کے ایک نر پیدا ہوگا پھر مادہ،
دوسرے سال پہلے مادہ پھر نر۔ پھر ان بھیڑوں کے بھی نر اور مادہ بچے
ہوں گے یہاں تک کہ ایک بڑا گلہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں اپنا حصہ
الگ کرلوں گا اور اس میں سے ایک حصہ بیچ ڈالوں گا اور اس کے داموں
سے فلاں زمین مول لوں گا اس میں باغ لگا کر ایک عالی شان محل بناؤں گا
کپڑے اور پوشاکیں بنواؤں گا، غلام اور باندیاں خریدوں گا پھر فلاں تاجر
کی بیٹی سے شادی کروں گا اور ایسی ولیمے کی دعوت دوں گا کہ کبھی نہ ہوئی ہو
کیوں کہ اس کے لیے میں جانور ذبح کروں گا، عمدہ کھانے، مٹھائیاں، شکرپارے

بنواؤں گا اور اس میں موسیقی دانوں، اُستادوں اور سارے باجوں کو اکٹھا کروں گا۔ پھول، خوش بوئیں اور خوش بُودار بوٹیاں مہیا کروں گا۔ تمام امیروں، غریبوں، عالموں، رئیسوں اور حکام کو دعوت دوں گا۔ جو شخص جس چیز کی فرمایش کرے گا لا موجود کروں گا، طرح طرح کے کھانے اور شرابیں منگواؤں گا اور ڈھنڈورا پٹوا دوں گا کہ جس کسی کو جس چیز کی ضرورت ہو لے جائے۔ جب دلہن کی منہ دکھائی ہو چکے گی تو میں اس سے ہم بستر ہوں گا، اس کے حُسن و جمال کے مزے لوٹوں گا، خوب کھاؤں گا پیوں گا اور لطف اُٹھاؤں گا اور اپنے دل میں کہوں گا کہ اب میری مُراد بر آئی اور زہد و عبادت سے چھٹکارا ملا۔ اس کے بعد میری بیوی کو حمل رہ جائے گا اس کے ایک لڑکا پیدا ہوگا، مجھے بڑی خوشی ہو گی، میں دعوتیں دوں گا اور بڑے ناز نعمت سے اُسے پالوں گا اُسے حکمت، ادب اور حساب سکھاؤں گا، اس کا نام لوگوں میں مشہور کروں گا، مجلسوں میں بیٹھ کر اس پر ناز کروں گا، اُسے بھلائی کرنے کا حکم دوں گا اور وہ میری مخالفت نہیں کرے گا، بُری باتوں سے اسے روکوں گا اور اسے تنبیہ کروں گا کہ خُدا سے ڈرے۔ نیکی کرے اور اسے عمدہ عمدہ اور خوب صورت خوب صورت تحفے دوں گا۔ اگر میں دیکھوں گا کہ وہ خدا کی فرماں برداری کرتا ہے تو اسے اور زیادہ تحفے تحائف دوں گا اور اگر میں دیکھوں گا کہ وہ گناہ کی طرف مائل ہے تو اسی ڈنڈے سے اس کی خبر لوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے خیالی بیٹے کو مارنے کے لیے ڈنڈا اُٹھایا اور وہ جا کر گھی کی ہانڈی پر پڑا جو چھینکے میں لٹک رہی تھی وہ ٹوٹ گئی اس کے ٹکڑے درویش کے سر پر آ کر گرے اور گھی اس کے سر، کپڑوں اور داڑھی پر بہنے لگا اور لوگوں نے اس سے عبرت حاصل کی۔

ای بادشاہ، یہی وجہ ہو کہ انسان کو کسی بات پر زبان نہیں کھولنی چاہیے جب تک وہ ہو نہ جائے۔ بادشاہ نے کہا ای وزیر، تو سچ کہتا ہو۔ تو بڑا اچھا وزیر ہو کیوں کہ تو سچ بولتا ہو اور اچھا مشورہ دیتا ہو۔ اسی وجہ سے تیرا رتبہ میرے نزدیک تیری خواہش کے موافق ہو اور میں تجھے ہمیشہ مانتا ہوں۔ شماس خدا اور بادشاہ کے آگے سجدے میں گر گیا اُسے دُعا دی کہ تیری نعمتیں ہمیشہ قائم رہیں اور خدا تیری عمر دراز کرے اور تیرا رُتبہ بلند کرے! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں تجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا خواہ وہ پوشیدہ ہو یا علانیہ۔ تیری رضامندی میری رضامندی ہو اور تیری ناراضگی میری ناراضگی۔ سوا تیری خوشی کے میری اور کوئی خوشی نہیں اور یہ ممکن نہیں کہ اگر تو مجھ سے ناراض ہو تو مجھے نیند آسکے کیوں کہ تیرے احسان کی وجہ سے خدا نے مجھے تمام اچھی چیزیں دی ہیں۔ میں خدا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے فرشتوں سے تیری نگہبانی کرے اور جب تو اس سے ملے تو وہ تجھے اچھا ثواب دے! یہ سُن کر بادشاہ خوش ہو گیا اور شماس اس سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد رانی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا، خوش خبری دینے والوں نے جا کر بادشاہ کو خوش خبری دی کہ تیرے بیٹا پیدا ہوا ہو۔ بادشاہ بہت خوش ہوا خدا کا بڑا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا کہ شکر ہو خدا کا کہ اس نے نااُمیدی کے بعد مجھے اولاد دی اور وہ بندوں پر بڑا شفیق اور مہربان ہو۔ اس کے بعد بادشاہ نے تمام رعایا کے نام خط بھیجے تاکہ انھیں خبر ہو جائے اور انھیں اپنے ہاں بُلایا اور تمام امرا، رؤسا، علما اور حکام جو اس کے ماتحت تھے حاضر ہوئے۔

یہ تو بادشاہ کا حال ہوا، اب اس کے بیٹے کا حال سنو۔ سائے مُلک

میں شادیانے بجنے اور ہر طرف سے لوگ آنے لگے، عالم، فلسفی، ادیب اور
حکیم آکر دربار میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ اس کے
بعد بادشاہ نے ساتوں بڑے وزیروں کو حکم دیا جن کا سردار شماس تھا کہ وہ
اپنی اپنی حکمت کے مطابق اس مسئلے پر تقریریں کریں جو اس وقت سب سے
زیادہ اہم ہی۔ وزیروں کا سرتاج شماس سب سے پہلے اٹھا اور بادشاہ سے
تقریر کرنے کی اجازت چاہی، بادشاہ نے اجازت دے دی، وزیر نے
کہنا شروع کیا کہ شکر ہی خدا کا جو ہمیں عدم سے وجود میں لایا اور اپنے شاہی
بندوں پر جو عادل اور منصف ہیں یہ احسان کیا کہ انھیں حکومت اور نیک روی
دی، ان کے ہاتھ سے ان کی رعیّت کو روزی عطا کی، بالخصوص ہمارا بادشاہ
جس کے ذریعے سے خدا نے ہمارے مُلک کے مُردوں کو زندہ کیا اس نے
ہمیں نعمتوں سے پاٹ دیا اس کی سلامتی کی وجہ سے ہمیں عیش و عشرت،
اطمینان اور انصاف نصیب ہوا۔ کون سا بادشاہ اپنی رعیّت کے ساتھ وہ
کام کرتا ہی جو اس بادشاہ نے کیا۔ ہماری ضرورٗیات کو پورا کرنا، ہمارے
حقوق دینا، ایک دوسرے میں انصاف کرنا غفلت نہ کرنا اور ہمارے
اوپر سے ظلم و ستم کو دور کرنا! یہ خدا کا لوگوں پر احسان ہی اگر ان کا بادشاہ
ان کے کاموں میں دل چسپی لے اور انھیں ان کے دشمنوں سے بچائے کیوں کہ
دشمن کا انتہائی مقصد یہی ہوتا ہی کہ وہ اپنے دشمن کو زیر کر کے انھیں اپنے
قبضے میں لے آئے۔ بہت سے لوگ اپنے بیٹوں کو بادشاہوں کے پاس
خدمت کے لیے بھیجتے ہیں اور ان کے پاس غلاموں کی طرح رہتے ہیں
تاکہ وہ انھیں دشمنوں سے بچائیں۔ ہماری حالت یہ ہی کہ اس بادشاہ کے
زمانے میں کسی دشمن نے ہمارے مُلک میں قدم نہیں رکھا، یہی بڑی نعمت

اور سعادت ہے جس کی تعریف سے لوگ عاجز ہیں کیوں کہ وہ تعریف سے بالاتر ہے۔ اور تو، ای بادشاہ، اس بڑی نعمت کا اہل اور مستحق ہے اور ہم تیری پناہ اور تیری قوّت کے سایے میں ہیں، خدا تجھے بہترین ثواب دے اور تیری عمر دراز کرے! ہم اس سے پہلے خدا کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا مانگتے تھے کہ وہ ہماری دُعا قبول کرے اور تجھے ہماری خاطر زندہ رکھے اور ایک نیک بخت بیٹا دے جس سے تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، خدا نے ہماری درخواست سُن لی اور دُعا قبول کرلی، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

نو سو تیسری رات

نو سو تیسری رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! وزیر شماس نے بادشاہ سے کہا کہ خدا نے ہماری درخواست سُن لی اور دُعا قبول کرلی اور ہمیں بہت جلد خوشی عطا کی جس طرح کہ کسی تالاب میں مچھلیوں کو۔ بادشاہ نے پوچھا کہ مچھلیوں کا کیا قصّہ ہے اور یہ کس طرح ہُوا؟

مچھلیوں اور جھینگے کی کہانی

شماس نے کہا ای بادشاہ! کسی جگہ ایک تالاب تھا اور اس میں چند مچھلیاں رہتی تھیں۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ اس کا پانی سوکھ گیا اور مچھلیاں ایک دوسرے کے قریب آگئیں کیوں کہ ان کے لیے پانی کافی نہ تھا وہ مرنے کے قریب ہوگئیں اور کہنے لگیں معلوم نہیں اب ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے

اور ہمیں کیا کرنا چاہیے کس سے جا کر مشورہ کریں کہ ہمیں کیوں کر نجات مل سکتی ہے۔ ان میں سے ایک مچھلی کھڑی ہوئی جو عمر اور عقل میں سب سے بڑی تھی اور بولی سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم خدا سے دعا مانگیں لیکن پہلے چل کر جھینگے سے مشورہ کرلیں وہ ہمارا سردار ہے۔ دیکھیں کہ اس کی کیا رائے ہے وہ ہم سب سے زیادہ صائب الرائے بھی ہے۔ مچھلیوں نے اس کی رائے مان لی اور سب کی سب مل کر جھینگے کے پاس گئیں، دیکھا کہ وہ اپنے گڑھے میں بیٹھا ہوا ہے اُسے ان کی تکلیف کی خبر تک نہیں۔ مچھلیوں نے اسے سلام کرکے کہا اے ہمارے آقا! کیا تجھے ہماری حالت کی بالکل خبر نہیں حالاں کہ تو ہمارا حاکم اور سردار ہے۔ جھینگے نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا، تمھیں کیا ہوا اور کیا چاہتی ہو؟ مچھلیوں نے اپنا قصہ سُنایا اور کہا پانی کی کمی سے ہم پر مصیبت آگئی ہے، تالاب اگر بالکل سوکھ گیا تو ہم مرجائیں گے۔ ہم تیری رائے لینے آئے ہیں جس سے ہم بچ جائیں کیوں کہ تو ہمارا بڑا اور ہم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ جھینگے نے تھوڑی دیر کے لیے اپنا سر نیچا کرلیا اس کے بعد کہنے لگا اس میں شک نہیں کہ تمھاری عقل ناقص ہے تمھیں خدا کی رحمت سے ناامیدی ہے اور اس بات کو نہیں جانتیں کہ وہ تمام مخلوقات کو روزی دینے کا ذمہ دار ہے۔ تمھیں معلوم نہیں کہ خدا اپنے بندوں کو بغیر حساب کے روزی دیتا ہے قبل اس کے کہ اس نے کوئی چیز پیدا کی ہو اس کی روزی مقرر کردی ہے اور اپنی خدائی قدرت سے ہر شخص کی عمر محدود اور روزی مقسوم کردی ہے۔ پھر ہم کیسے اس چیز پر غم گین ہو سکتے ہیں جو ابھی تک غیب میں پوشیدہ ہے! میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں کہ خدا کے آگے عاجزی کی جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنا ضمیر صاف کرکے

خدا سے دُعا مانگے کہ وہ ہمیں تکلیفوں سے بچائے۔ جو خدا پر بھروسا کرتا ہے خدا اس کی اُمید کو بے کار نہیں جانے دیتا اور جو اس کا وسیلہ چاہتا ہے وہ اسے نامُراد نہیں پھیرتا۔ اگر ہم اپنی حالت دُرست کرلیں تو ہمارے سب کام ٹھیک ہو جائیں گے اور ہمیں بھلائی اور نعمتیں ملیں گی۔ جب جاڑے آئیں گے اور ہمارے نیک بختوں کی دُعا سے ہماری زمین سیلاب ہو جائے گی تو جو بھلائی خدا ہمیں دے گا وہ پھر ضائع نہ ہو گی۔ میری صلاح ہے کہ ہم صبر کریں اور دیکھیں کہ خدا کیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں موت آجائے گی تو آرام ہو جائے گا اور اگر کوئی ایسی بات پیش آجائے گی کہ ہمیں بھاگنا پڑے تو ہم بھاگ کر خدا جہاں لے جائے گا چلے جائیں گے۔ تمام مچھلیوں نے یک زبان ہو کر کہا ای ہمارے مولا، تو ٹھیک کہتا ہے، خدا تجھے ہماری طرف سے نیک بدلہ دے! یہ کہہ کر سب مچھلیاں اپنی اپنی جگہ چلی گئیں۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ خدا نے خوب مینھ برسایا اور تالاب پہلے سے زیادہ بھر گیا۔

ای بادشاہ، اسی طرح ہم بھی تیری اولاد کی طرف سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ اب چوں کہ خدا نے ہماری خاطر تجھے ایک مبارک لڑکا دیا ہے ہم خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ نیک بخت نکلے، تیری آنکھیں ٹھنڈی کرے تیرا اچھا وارث ہو اور ہمارے ساتھ ایسی بخششیں کرے جیسی کہ تو کرتا رہا ہے۔ جو کوئی خدا سے مقصد رکھتا ہے خدا اسے نامراد نہیں پھیرتا۔ کسی شخص کو خدا کی رحمت سے نا اُمید نہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد دُوسرا وزیر اٹھا اور اس نے بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ نے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ وزیر نے تقریر شروع کی کہ کوئی بادشاہ اس وقت تک بادشاہ نہیں کہلایا جاسکتا جب تک وہ بخششیں اور انصاف نہ کرے اور اپنے

احکام میں دریا دلی سے کام نہ لے، رعیت کے ساتھ پرانے عمدہ دستور قائم نہ رکھے، ایک کا دوسرے کے ساتھ انصاف نہ کرے، لوگوں کے جان و مال کی حفاظت نہ کرے، انھیں تکلیف سے نہ بچائے، غریبوں کی خبر گیری نہ کرے اور جس کا جو واجب حق ہو نہ دے تاکہ سب اس کے لیے دعا کریں اور اس کے فرماں بردار رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا بادشاہ رعیت کا پیارا ہوتا ہے دنیا میں بلندی حاصل کرتا ہے اور آخرت میں بزرگی اور خدا کی رضامندی۔ اے بادشاہ، ہم سب تیرے غلام اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ہم نے بیان کی ہیں سب تجھ میں موجود ہیں۔ مثل ہے کہ بہترین بات یہ ہے کہ بادشاہ کو رعایا کے حق میں منصف ہونا چاہیے، ان کے حکیم کو ماہر، ان کے عالم کو باخبر اور اپنے علم پر عمل کرنے والا۔ ہم ان ساری بھلائیوں سے مستفید ہیں۔ اس سے پہلے ہم اس بات سے ناامید ہو چکے تھے کہ تیرا ایک بیٹا ہو جو تیرے بعد حکومت کرے لیکن خدا نے تیری دعا نہیں ٹالی کیوں کہ تیرا گمان اس کی طرف سے اچھا تھا اور تو نے اپنے کام کو اس کے حوالے کر رکھا تھا۔ تیری امید کیسی اچھی امید تھی! اور تیرا حال وہی ہوا جو کوّے کا سانپ کے ساتھ ہوا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کیسے کوّے اور سانپ کی کیا حکایت ہے؟

کوّے اور سانپ کی کہانی

وزیر نے کہا اے بادشاہ، کسی درخت پر ایک کوّا اور اس کی

بیوی آرام اور چین سے زندگی بسر کرتے تھے یہاں تک کہ بچّے نکلنے کا زمانہ آیا۔ یہ زمانہ سخت گرمیوں کا تھا، ایک سانپ اپنے بل میں سے نکل کر درخت پر چڑھ گیا اور شاخوں میں لٹکتے لٹکتے کوّے کے گھونسلے میں جا بیٹھا اور گرمیوں کا سارا زمانہ اس میں گزار دیا۔ کوّے مارے مارے پھرنے لگے، نہ انھیں آرام ملتا نہ کہیں رہنے کی جگہ۔ جب گرمیاں ختم ہوگئیں تو سانپ اپنی جگہ چلا گیا اور کوّا اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ ہم خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے ہمیں بچالیا اور اس آفت سے نجات دی، اگرچہ اس سال ہمارے کھانے پینے کا سامان ضائع ہوگیا لیکن خدا ہماری امیدوں پر پانی نہیں پھیرے گا، ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں صحیح وسلامت رکھا، ہمیں سوا اس کے اور کسی پر بھروسا نہ کرنا چاہیے۔ اگر خدا کو منظور ہے اور ہم آیندہ سال تک زندہ رہے تو وہ ہمیں اور بچّے عنایت کرے گا۔ پھر بچّے نکالنے کا زمانہ آیا تو سانپ پھر اپنی جگہ سے نکل کر درخت پر چڑھا۔ ابھی وہ ایک شاخ میں لٹکا ہی ہوا تھا اور پہلے کی طرح کوّے کے گھونسلے میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ ایک چیل اس پر جھپٹی اور اس زور سے اس کے سر پر پنجہ مارا کہ اس کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ وہ زمین پر گر پڑا اور چیونٹیوں نے آکر اسے چٹ کر لیا۔ کوّا اور اس کی بیوی سلامتی اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے ان کے بہت سے بچّے ہوئے اور انھوں نے اپنی سلامتی اور اولاد پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اے بادشاہ، ہمیں بھی اس بات پر خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہماری ناامیدی کے بعد تجھے مبارک بیٹا دے کر ہم پر

اور ہم پہ کتنا احسان کیا، اور شہرزاد کو صبح ہوئی۔۔۔۔

نوسو چوتھی رات

نوسو چوتھی رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ!
جب دُوسرا وزیر اپنی تقریر ختم کرچکا تو تیسرا وزیر اٹھا اور کہنے لگا
ای منصف بادشاہ جو اس دُنیا میں نیکی کرے گا آخرت میں اس کا پھل
پائے گا، خوش ہو کہ جسے دُنیا والے چاہتے ہیں اُسی کو آسمان والے
بھی چاہتے ہیں۔ خدا نے تیری محبت کے حصّے کرکے تیری رعیت
کے دلوں میں رکھ دیے ہیں۔ ہمیں اور تجھے چاہیے کہ اس کا شکر ادا
کریں اور اس کی حمد بجالائیں تاکہ وہ اپنی نعمتوں سے تجھے اور
تیری وجہ سے ہمیں مالا مال کردے۔ ای بادشاہ تجھے معلوم ہونا چاہیے
کہ بغیر خدا کے حکم کے کوئی شخص کچھ نہیں کرسکتا، وہی بخشش کرنے
والا ہی اور جو بھلائی کسی کے حصے میں آئی ہی اسی سے ملی ہی۔ وہ
جس طرح چاہتا ہی اپنے بندوں کو نعمتیں دیتا ہی، کسی کو مالا مال کر
دیتا ہی اور کسی کو اپنی روٹی کمانے کے لیے مزدوری کرنی پڑتی ہی۔ کسی
کو خدا سردار بنا دیتا ہی اور کسی سے دُنیا چھڑا کر اپنی طرف راغب
کر لیتا ہی، اس کا قول ہی کہ میں ہی نفع اور نقصان پہنچاتا ہوں، میں
ہی شفا دیتا، بیمار کرتا، مارتا، جلاتا، امیر اور غریب بناتا ہوں،
ساری چیزیں میرے ہی ہاتھ میں ہیں اور وہ لوٹ کر میرے ہی
پاس آئیں گی۔ ہر شخص پہ فرض ہی کہ خدا کا شکر کرے۔ اور ای بادشاہ!

تو سب سے بڑا نیک اور نیک بخت ہے کیوں کہ مثل ہے کہ سب سے زیادہ نیک اور نیک بخت وہ شخص ہے جس میں خدا نے دنیا اور آخرت، دونوں کی نیکیاں جمع کر دی ہوں اور جو خدا کی دی ہوئی نعمت پر قناعت کرے اس کی عطا کردہ حکومت پر شکر گزار ہو۔ اور جو شخص ظلم کرتا ہے فرائض اور حقوق پر کار بند نہیں ہوتا تو اس کی مثال جنگلی گدھے اور لومڑی کی سی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کیا قصہ ہے؟

جنگلی گدھے اور لومڑی کی کہانی

وزیر نے کہا اے بادشاہ! ایک لومڑی ہر روز اپنے بھٹ سے نکل کر روزی تلاش کرنے جایا کرتی تھی۔ ایک روز جب کہ وہ کسی پہاڑ پر تھی دن ڈھل گیا اس نے لوٹنے کا ارادہ کیا راہ میں دیکھا کہ ایک اور لومڑی چلی جا رہی ہے۔ دونوں لومڑیاں ایک دوسری سے اپنے اپنے شکار کی باتیں کرنے لگیں۔ ایک نے کہا کہ کل مجھے ایک وحشی گدھا مل گیا، میں بھوکی تھی تین دن سے کچھ کھایا نہ تھا خوش ہو گئی خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے لیے گدھا بھیج دیا اور میں اس کے دل کی طرف بڑھی اور اسے کھا کر خوب سیر ہو گئی۔ اس کے بعد میں اپنے بھٹ میں چلی گئی۔ آج تین روز ہوئے کہ مجھے کھانے کو نہیں ملا ہے مگر میں سیر ہوں۔ دوسری لومڑی اس کی سیری کا حال سن کر حسد کرنے لگی اور اپنے دل میں کہا کہ میں بھی ضرور گدھے کا دل کھا کر چھوڑوں گی۔ اور اس نے کئی دن تک کچھ کھایا پیا نہیں کم زور اور مرنے کے قریب ہو گئی اس کی دوڑ دھوپ جاتی رہی اور اپنے

غار سے باہر بھی نہ نکل سکی۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے غار میں بیٹھی ہوئی تھی دو شکاری شکار کے لیے اِدھر سے نکلے اور ایک جنگلی گدھے کو دیکھ کر اس کا پیچھا کیا اور دن بھر اس کا پیچھا کرتے رہے۔ بالآخر ایک نے اس پر ایک دو شاخہ تیر چلایا جو گدھے کے بدن میں گھس کر اس کے دل تک پہنچ گیا اور وہ مر کر اسی لومڑی کے غار کے پاس گرا۔ شکاریوں نے اسے ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہی اور وہ تیر جو اس کے دل میں چبھ گیا تھا کھینچا۔ لکڑی تو باہر نکل آئی لیکن پیکان اندر رہ گیا۔ شام ہوئی تو لومڑی کمزوری اور بھوک سے پریشان اپنے غار سے نکلی دیکھا کہ ایک جنگلی گدھا غار کے منھ پر پڑا ہوا ہی اتنی خوش ہوئی کہ پھولے نہ سمائی اور کہنے لگی کہ شکر ہی خدا کا اس نے بغیر محنت مشقت کے میری خواہش پوری کر دی، میں کیا جانتی تھی کہ مجھے جنگلی گدھا مل جائے گا۔ شاید خدا اسے مار کر یہاں کھینچ لایا ہی۔ یہ کہہ کر وہ گدھے کی طرف جھپٹی اور اس کا پیٹ پھاڑ کر اپنا سر اس میں ڈالا اور منھ اِدھر اُدھر دوڑانے لگی اور جب اسے دل مل گیا تو اسے نگلنا چاہا۔ دل اس کے حلق میں پہنچا تو دو شاخہ پیکان اس کے گلے کی ہڈی میں چبھ گیا وہ نہ اسے نگل سکتی نہ اُگل سکتی۔ لومڑی کو یقین ہوا کہ موت آگئی اور کہنے لگی سچ ہی کہ کسی مخلوق کو اس سے زیادہ نہ طلب کرنا چاہیے جو خدا نے اس کی قسمت میں لکھ دیا ہی۔ اگر میں اس پر قناعت کرتی جو خدا نے میری قسمت میں لکھ دیا ہی تو ہلاک نہ ہوتی۔

لہٰذا اے بادشاہ! انسان کو چاہیے کہ قسمت کے لکھے پر راضی رہے، خدا کا شکر کرے اور اس سے نا اُمید نہ ہو۔ دیکھ اے بادشاہ! تیری اچھی نیت اور نیک کرداریوں کی وجہ سے خدا نے نا امیدی کے بعد تجھے بیٹا دیا۔ ہم

خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ اسے لمبی عمر دائمی نیک بختی عطا کرے اور تیری دراز عمر کے بعد آئے تیرا مبارک وارث بنائے جو تیرے راستے پر چلے۔ اس کے بعد چوتھا وزیر کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اگر بادشاہ سمجھ دار اور عقل مندی کی باتوں کو سمجھنے والا ہو، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

نو سو پانچویں رات

نو سو پانچویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، چوتھے وزیر نے کہا اگر بادشاہ سمجھ دار اور دانش مند ہو اور حکم رانی کرنے، سیاست دانی، نیک نیتی اور رعایا کے ساتھ انصاف پسندی برتتا ہو، معزز لوگوں کی عزت، محترم لوگوں کا احترام کرتا ہو اور باوجود قدرت کے عفو کر سکتا ہو، بڑوں اور چھوٹوں کی رعایت اور ان کا بوجھ ہلکا ان کے ساتھ بخشش کرتا ہو، ان کی جانوں کی حفاظت ان کی پردہ پوشی کرتا ہو اور ان کے عہد و پیماں پر قائم رہتا ہو، تو وہ دنیاوی اور آخروی نیک بختی کا مستحق ہے۔ یہی چیز اسے رعایا سے محفوظ رکھتی ہے۔ ملک کی برقراری، دشمنوں پر فتح یابی اور مطلب براری کے لیے مددگار ہوتی ہے بلکہ اس کی وجہ سے خدا کی نعمت اس پر اور بڑھ جاتی ہے اور اس میں خدا کی شکرگزاری کی توفیق پیدا ہو جاتی ہے، اس کی مہربانی سے اُسے کام یابی پر کام یابی ہوتی ہے۔ لیکن اگر بادشاہ میں یہ باتیں نہیں تو وہ اور اس کا مُلک دونوں مصیبتوں اور آفتوں کا شکار رہتے ہیں کیوں کہ وہ قریب اور دور والوں دونوں پر ظلم و ستم کرتا ہے، اور اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو ایک بادشاہ کا اس کے درویش بیٹے

کے ساتھ ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کیسے؟

ظالم بادشاہ اور اس کے درویش بیٹے کی کہانی

وزیر بولا اے بادشاہ! پچھم کے مُلک میں ایک بادشاہ بڑا ظالم، جابر، تند مزاج اور سخت گیر تھا۔ رعایا کے ساتھ بالکل رعایت نہ کرتا۔ جب کوئی شخص اس کے مُلک میں داخل ہوتا تو اس کے حکام اس کے مال کے پانچ حصے کر کے چار حصے لے لیتے اور صرف پانچواں حصہ اس کے لیے چھوڑ دیتے۔ اللہ کی شان کہ اس کا بیٹا باپ کے خلاف بڑا نیک بخت اور سعید تھا جب اس نے دیکھا کہ دُنیا ٹیڑھی چل رہی ہے تو اس نے دُنیا ترک کر دی اور بچپن ہی سے درویش بن کر خدا کی عبادت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ دُنیا سے دست کشی کر کے جنگل بیابانوں کی سیر کرتا اور کبھی کبھی شہروں میں بھی جاتا۔ اتفاق سے ایک بار اسی شہر میں پہنچا پہرے داروں نے اسے پکڑ کر اس کا جھاڑا لیا لیکن سوا دو جوڑے کپڑوں کے اس کے پاس کچھ نہ نکلا، ایک نیا اور ایک پُرانا۔ پہلے انھوں نے اسے خوب ذلیل و خوار کیا پھر اس کے نئے کپڑے اُتار لیے اور پُرانے چھوڑ دیے۔ وہ فریاد کرنے اور کہنے لگا کہ اے ظالمو۔ ستیا ناس ہو تمھارا! میں ایک فقیر درویش آدمی ہوں ان کپڑوں سے تمھارا کیا فائدہ ہوگا! اگر تم وہ کپڑے واپس نہ کرو گے تو میں بادشاہ کے پاس جا کر تمھاری شکایت کروں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو بادشاہ ہی کے حکم سے یہ کیا ہے، تیرا جو جی چاہے کر۔ درویش بادشاہ کے محل پر پہنچا لیکن دربانوں نے اُسے اندر جانے سے روکا وہ لوٹ گیا اور

اپنے دل میں کہنے لگا کہ اب سوا اس کے چارا نہیں کہ میں یہیں اس کا انتظار کروں اور جب وہ نکلے تو اس سے شکایت کروں کہ میری کیا گت بنائی گئی۔ وہ بادشاہ کے نکلنے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اس نے لشکری کو کہتے سنا کہ وہ آ رہا ہے۔ درویش آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ یکایک بادشاہ نکل آیا، درویش نے اس کے سامنے آ کر اس کی کامیابی کی دعا دی اور وہ ماجرا بیان کیا جو اسے پہرے دار کے ساتھ پیش آیا تھا ان کی شکایت کی اور کہا کہ میں اللہ والے لوگوں میں سے ہوں دنیا ترک کر کے خدا کی خوشنودی ڈھونڈ رہا ہوں، درویشی اختیار کر لی ہے، جن لوگوں کے پاس میں جاتا ہوں وہ حتی الامکان میرے ساتھ بھلائی کرتے ہیں اور اسی حالت میں میں شہر شہر اور گانو گانو جاتا ہوں۔

اس کے بعد درویش نے کہا کہ جب میں اس شہر میں آیا تو مجھے خیال تھا کہ یہاں کے لوگ بھی میرے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو درویشوں کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن تیرے ملازموں نے مجھے روک کر میرا ایک لباس اُتار لیا اور خوب مارا۔ دیکھ میری حالت میری مدد کر میرے کپڑے دلوا دے اور میں فوراً اس شہر سے چلا جاؤں گا۔ ظالم بادشاہ نے جواب دیا کہ تجھے کس نے اس شہر میں آنے کو کہا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ یہاں کا بادشاہ کیا کرتا ہے۔ درویش نے کہا میرے کپڑے دے دے پھر جو جی چاہے کیجیو۔ درویش کی یہ باتیں سُن کر بادشاہ کا مزاج برہم ہو گیا وہ کہنے لگا او جاہل، ہم نے تجھے ذلیل کرنے کے لیے تیرے کپڑے اُتار لیے ہیں اور اب چوں کہ تو شور مچا رہا ہے ہم تیری جان نکال لیں گے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے اسے قید خانے بھجوا دیا۔ جب وہ قید خانے پہنچا تو

اپنے جواب پر پچھتانے اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ آخر میں کپڑوں کو چھوڑ کر بھاگ کیوں نہ گیا۔ جب آدھی رات ہوئی تو اس نے اٹھ کر بہت دیر تک نماز پڑھی اور کہنے لگا کہ خداوندا! تو ہی انصاف کرنے والا اور میرا حال جانتا ہے کہ مجھے اس جابر بادشاہ کے ساتھ کیا پیش آیا، میں تیرا مظلوم بندہ ہوں اور تیرے آگے دُعا مانگتا ہوں کہ میرے حال پر رحم کر مجھے اس ظالم بادشاہ کے پنجے سے چھڑا اور اس پر اپنا عذاب اُتار کیوں کہ تو کسی ظالم کے ظلم سے بے خبر نہیں ہے۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ اس نے مجھ پر ظلم کیا تو آج ہی رات اس پر اپنا عذاب نازل کر، تیرا حکم انصاف ہے اور تو ہر مظلوم کا مددگار ہے، تیری قدرت اور بڑائی آخر تک قائم رہے گی۔ جب قید خانے کے داروغہ نے اس مسکین کی دُعا سنی تو وہ سر سے پانو تک کانپ اٹھا۔ اتنے میں بادشاہ کے محل سے ایک شعلہ نکلا اور وہ وہاں سے لے کر قید خانے تک ہر جگہ آگ لگ گئی سوا داروغہ اور درویش کے کوئی نہ بچا۔ درویش آزاد ہو گیا وہ اور داروغہ وہاں سے چل دیے اور چلتے چلتے ایک دوسرے شہر میں پہنچے، ادھر ظالم بادشاہ کا شہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک راکھ ہو گیا۔

ای نیک بخت بادشاہ! ہم تو دن رات تیرے لیے دُعا مانگتے اور خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اس نے تجھے پیدا کیا اور تیرے انصاف اور خوش خلقی سے ہمیں اطمینان ہے اس بات کا بڑا غم تھا کہ تیرے کوئی اولاد نہ تھی جو تیرے بعد بادشاہت کرے اور ڈر تھا کہ کہیں تیرے بعد کوئی دوسرا بادشاہ نہ بن بیٹھے لیکن اب اس نیک بخت لڑکے کے پیدا ہونے کی وجہ سے خدا نے ہم پر کرم کیا ہمارا غم دور کر کے ہمیں دل شاد کر دیا۔ ہم خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ اسے خلیفہ

بنائے ایسی عزّت اور سعادت دے جو ہمیشہ باقی رہے۔
اب پانچواں وزیر اٹھا اور کہنے لگا کہ مبارک ہو بزرگ خدا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی .....

نوسو چھٹی رات

نوسو چھٹی رات ہوئی تو اس نے کہا ای نیک نہاد بادشاہ! پانچویں وزیر نے کہا کہ مبارک ہو بزرگ خدا جو عمدہ بخششیں کرتا اور نفیس انعامات دیتا ہو۔ جاننا چاہیے کہ ہمیں تحقیق کے ساتھ معلوم ہو، خدا اسی کے ساتھ انعام و اکرام کرتا ہو جو اس کا شکریہ بجالاتا اور اس کے دین پر قائم رہتا ہو۔ اور ای نیک بخت بادشاہ! تجھ میں یہ تمام خصلتیں پائی جاتی ہیں علاوہ ازیں رعایا کے ساتھ ایسا عدل و انصاف بھی جس سے خدا راضی ہو۔ اسی وجہ سے خدا نے تیرا رتبہ بڑھایا، تیری زندگی کو مبارک بنایا اور ناامیدی کے بعد تجھے یہ نیک تحفہ دیا ہو جو تیرا نیک بخت بیٹا ہو جس کے سبب سے ہمیں دائمی خوشی اور سرور حاصل ہوا ہو جو کبھی جا نہیں سکتا۔ اب تک تیرے بیٹا نہ ہونے سے ہمیں بہت رنج و غم تھا تیرا عدل اور تیری محبت جو ہمارے ساتھ ہو ہم سوچ میں پڑے ہوئے تھے اور ہمیں ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری زندگی ختم ہو جائے اور تیرا والی وارث کوئی نہ ہو ہماری رائیں مختلف ہو جائیں، ہم میں پھوٹ پڑ جائے اور ہماری وہی حالت ہو جائے جو کوّے کی ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کوّے کا کیا قصہ ہو؟

سردار کوّے کی کہانی

وزیر نے عرض کیا اے نیک نہاد بادشاہ! کسی جنگل میں ایک بہت بڑی گھاٹی تھی جہاں بہت سے چشمے، درخت، میوے تھے اور چڑیاں زبردست خدا کی تسبیح کرتی تھیں جس نے دن اور رات پیدا کیے ہیں۔ منجملہ اور چڑیوں کے وہاں کوّے بھی تھے جو بڑے عیش و آرام سے رہتے۔ ان کا سردار اور حاکم ایک کوّا تھا جو اُن پر بڑا مہربان اور شفیق تھا جس کے ساتھ وہ امن و امان سے بسر کرتے اور اپنے درمیان اتنا اچھا انتظام رکھتے کہ اور چڑیوں کی ان کے خلاف کچھ نہ چلتی۔ اب ایسا اتفاق ہوا کہ ان کے سردار کو موت آگئی جو ہر مخلوق کے لیے مقدر ہے۔ انھیں بہت رنج و افسوس ہوا لیکن سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ کوئی ایسا نہیں جو اس کا جانشین ہو سکے سب نے مل کر مشورہ کیا کہ کون ایسا نیک ہے جو ان کا سردار بنے۔ بعض نے ایک کوّے کو تجویز کیا اور کہا کہ بس یہی ہمارا بادشاہ ہونے کے قابل ہے لیکن دوسرے ان سے متفق نہ ہوے اور اس کوّے کو پسند نہ کیا۔ اس پر ان کے درمیان پھوٹ پڑگئی جھگڑا ہونے لگا اور بڑا فتنہ و فساد ہوا۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ رات بھر تو آرام کریں جب صبح ہو تو کوئی روزی کی فکر میں نہ جائے جب تک دن نکل آئے اور پو پھٹتے ہی ایک جگہ جمع ہوں اور دیکھیں کہ کون سا پرندہ سب سے تیز اڑتا ہے، جو سب سے تیز اڑے وہی خدا کی طرف سے ہمارے اوپر مامور سمجھا جائے گا ہم اسے بادشاہ بنالیں گے اور اپنی حکومت اس کے سپرد کر دیں گے۔ اس پر سب رضامند ہو گئے اور اس شرط پر اتفاق ہو گیا۔ اتنے میں ایک شکرا آتا ہوا دکھائی دیا انھوں نے اس سے کہا اے نیک بخت،

ہم تجھے اپنا سردار مقرر کرتے ہیں تاکہ تو ہمارا انتظام کرے۔ شکرا راضی ہو گیا
اور کہنے لگا خدا نے چاہا تو تمھیں مجھ سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اس کے سردار
بننے کے بعد یہ دستور ہو گیا کہ جب کوّے اپنی روزی ڈھونڈنے نکلتے تو وہ
ان میں سے ایک کے ساتھ ہو جاتا اور اسے مار کر اس کا بھیجا اور دونوں آنکھیں
کھا جاتا باقی حصہ پھینک دیتا۔ وہ برابر یوں ہی کرتا رہا یہاں تک کہ کوّے
تاڑ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی بڑی تعداد ہلاک ہو چکی ہے اور باقی بھی
یقیناً ہلاک ہو جائیں گے ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟
ہم میں بہت سے ہلاک ہو چکے ہیں اور ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوا
جب ہمارے بڑے ہلاک ہونے لگے۔ اب ہمیں چاہیے کہ اپنی جان کی خیر
منائیں، چناں چہ صبح ہوتے ہی وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ہمیں بھی اب تک یہی ڈر تھا کہ ہماری بھی کہیں یہی گت نہ بنے اور
کوئی غیر ہم پر بادشاہت نہ کرے لیکن خدا نے اپنی عنایت سے یہ شہزادہ
ہمیں عطا کیا جو تیرا ہی گوشت و پوست ہے اور اب ہمیں یقین ہے کہ ہم اطمینان
اور اتفاق سے رہیں گے۔ ہمارے وطن میں امن و امان اور سلامتی رہے گی۔
مبارک ہے برتر و بزرگ خدا اور وہی حمد، شکر اور اچھی ثنا کا سزاوار ہے۔ خدا برکت
دے ہم کو جو اس کی رعیت ہیں اور ہمیں اور اُسے نیک بختی عطا کرے! اس کے
بعد چھٹا وزیر اٹھا اور کہنے لگا اے بادشاہ! خدا تجھے دنیا اور آخرت دونوں میں
نیک بخت رکھے! بزرگوں کا یہ پہلے ہی سے مقولہ ہے کہ جو نماز پڑھتا، روزہ
رکھتا، ماں باپ کا حق ادا کرتا اور انصاف سے احکام جاری کرتا ہے تو جب
وہ خدا سے ملے گا اسے راضی پائے گا۔ جب سے تو ہمارا حکمراں بنا ہے ہمارے
ساتھ انصاف کرتا ہے تیرا ہر کام مبارک ہے اس لیے ہم خدا سے دعا مانگتے ہیں

کہ وہ تجھے بہترین ثواب اور تیرے احسانوں کا بدلہ دے۔ تو نے ابھی سُن لیا ہے
کہ اس عالم وزیر نے کیا کہا، اگر بادشاہ مر جائے یا کوئی دوسرا بادشاہ حکومت
کرنے لگے جو اس جیسا نہ ہو تو ہمیں کتنی مایوسی ہوگی، اس کے بعد ہم میں کتنا
اختلاف بڑھے گا اور اس اختلاف کی وجہ سے کیا آفت آئے گی! اس لیے
ہم نے خدا سے دُعا کی کہ وہ بادشاہ کو ایک نیک بخت بیٹا عطا کرے جو اس
کے بعد مُلک کا والی وارث بنے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان جس دُنیاوی چیز
کو محبوب رکھتا ہے اس کا نتیجہ اسے معلوم نہیں ہوتا، اس وجہ سے انسان اپنے
پروردگار سے کوئی ایسی چیز نہ مانگے جس کے نتیجے سے وہ بے خبر ہو کیوں کہ
ایسی حالت میں اس کا نقصان فائدے سے زیادہ ہوتا ہے اس کی مطلوبہ چیز
میں اس کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو سپیرے اس کے
بیوی بچوں اور گھر والوں کا ہوا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی . . . . .

نو سو ساتویں رات

نو سو ساتویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ! وزیر نے
کہا کہ اس کا وہی حشر ہوگا جو سپیرے، اس کے بیوی بچوں اور گھر والوں کا
ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ سپیرے اس کے بیوی بچوں اور گھر والوں کا کیا قصہ
ہے؟

سپیرے اور اس کے بیوی بچوں کی کہانی

وزیر نے کہا اے بادشاہ! ایک سپیرا تھا جو سانپ پکڑتا، انھیں پالتا اور

انھی کے ذریعے سے اپنی روزی پیدا کرتا۔ اس کے پاس ایک بڑا پٹارا تھا جس میں تین سانپ تھے لیکن گھر والوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ وہ ہر روز اس پٹارے کو لے کر شہر کا چکر لگاتا لوگوں کو سانپوں کا تماشا دکھاتا اور اپنے بال بچوں کے لیے روٹی کماتا، شام کے وقت گھر لوٹتا اور پٹارے کو ایک طرف رکھ دیتا اور دوسرے دن صبح کو پھر اسے لے کر شہر میں نکل جاتا۔ یہی اس کا دستور تھا گھر والے بالکل بے خبر تھے کہ پٹارے میں کیا ہے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ جب سپیرا عادت کے موافق گھر لوٹ کر آیا تو اس کی بیوی نے پوچھا اس پٹارے میں کیا ہے؟ سپیرا بولا اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟ کیا تیرے پاس کافی بلکہ اس سے بھی زیادہ کھانے کو نہیں ہے! جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے اس پر قناعت کر اور ادھر اُدھر کی باتیں نہ پوچھ۔ عورت یہ سُن کر چُپ تو ہو گئی لیکن اپنے دل میں کہنے لگی کہ میں اس بات کا پتا لگا کر رہوں گی کہ اس پٹارے میں کیا ہے۔ اس پر وہ تُل گئی اپنے بچوں کو بھی لگا دیا وہ اپنے باپ سے پوچھیں کہ اس پٹارے میں کیا ہے اور ضد کریں تاکہ وہ انھیں بتا دے۔ بچوں کو گمان ہوا کہ اس میں ضرور کوئی کھانے کی چیز ہو گی وہ روز باپ کے پیچھے پڑ جاتے کہ دکھا پٹارے میں کیا ہے۔ باپ ان کو ٹال دیتا، بہلاتا اور کہتا کہ یہ بات نہ پوچھو۔ ایک مدت تک یہی پوچھ گچھ ہوتی رہی اور ان کی ماں برابر انھیں اکساتی رہی یہاں تک کہ ماں بیٹوں نے یہ صلاح کی کہ جب تک باپ پٹارا کھول کر انھیں دکھا نہ دے اس وقت تک وہ نہ اس کا کھانا کھائیں گے نہ پانی پییں گے۔ ایک رات وہ یہی سوچ رہے تھے کہ سپیرا بہت سا کھانا پینا لے کر آیا اور انھیں بلایا کہ آؤ ساتھ مل کر کھائیں، لیکن انھوں نے آنے سے انکار کر دیا اور خفگی کا اظہار کیا۔ باپ

انھیں میٹھی میٹھی باتیں کر کے پھسلاتا اور کہتا کہو تم کیا چاہتے ہو، کھانا پینا یا کپڑے؟
انھوں نے کہا ابّا، ہم سوا اس کے اور کچھ نہیں چاہتے کہ تو اس پٹارے
کو کھول دے ہم بھی تو دیکھیں کہ اس میں کیا ہی۔ اس نے کہا بیٹو! اس سے
تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ اُلٹا نقصان پہنچے گا۔ یہ سُن کر وہ اور زیادہ ضد
کرنے لگے باپ نے انھیں بہتیرا ڈانٹا ڈپٹا مارنے کی دھمکی بھی دی مگر وہ نہ مانے۔
برابر اپنی ضد پر اڑے رہے۔ آخر سپیرے کو تیش آگیا اور ڈنڈا لے کر
انھیں مارنے دوڑا وہ اس کے پاس سے مکان کے اندر بھاگے۔ اس وقت
پٹارا وہیں رکھا ہوا تھا سپیرے نے اُسے چھپایا نہ تھا۔ بیوی نے یہ دیکھ کر کہ
اس کا شوہر لڑکوں کے ساتھ مشغول ہی جلدی سے پٹارا کھول دیا کہ دیکھے
اس کے اندر کیا ہی۔ پٹارے کا کھلنا تھا کہ سانپ باہر نکل آئے۔ سب سے
پہلے عورت کو ڈسا وہ مرگئی پھر وہ مکان کے اندر دوڑنے لگے، سوائے
سپیرے کے سب چھوٹوں بڑوں کو مار ڈالا سپیرا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ای نیک بخت بادشاہ، اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ
انسان کو خدا کی مرضی کے خلاف کوئی تمنا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی قدرت
اور ارادے پر پورا بھروسا کرنا چاہیے۔ دیکھ ای بادشاہ! تیری نیکیوں کی افراط
اور سچ کی خوبیوں کی وجہ سے خدا نے ناامیدی کے بعد تجھے بیٹا دے کر
تیری آنکھیں ٹھنڈی اور تیرا دل خوش کر دیا ہو اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ
وہ اسے ایسا عادل بادشاہ بنائے جس سے خدا راضی اور رعیت خوش ہو۔
اب ساتواں وزیر اٹھا اور کہنے لگا اے بادشاہ! میں نے ان باتوں پر خوب غور
و خوض کیا ہی جو میرے بھائیوں ان عالم اور حکیم وزیروں نے کی ہیں اور
جو کچھ تیرے عدل، خوش اخلاقی اور دوسرے بادشاہوں پر تیری فضیلت کا

ذکر کیا ہے۔ ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم تیری ان باتوں کا ذکر کیا کریں، میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے اپنی نعمتوں سے تجھے مالا مال کر دیا اپنی رحمت سے تجھ میں ملک کی بہبودی کا احساس پیدا کیا تجھے اور ہمیں اس بات کی توفیق دی کہ ہم اس کا بہت بہت شکر کریں، یہ سب باتیں محض تیری ذات کی وجہ سے ہیں۔ جب تک تو ہمارے درمیان میں ہے ہمیں کسی ظلم و جور کا اندیشہ نہیں اور باوجود ہماری کم زوری کے کوئی ہم پر دست درازی نہیں کر سکتا۔ مثل ہے کہ بہترین رعایا وہ ہے جس کا بادشاہ منصف مزاج ہو اور بدترین وہ جس کا بادشاہ ظالم ہو۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تجھ سا بادشاہ ہمیں عنایت کیا اور ناامیدی اور بڑھاپے کے بعد یہ نیک بخت بیٹا تجھے دیا، خدا کی بہترین بخشش نیک اولاد ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ جس کے بیٹا نہیں اس کے لیے نہ تو آرام ہے نہ اس کا نام چلے گا۔ تجھے اپنے ٹھیک عدل اور خدا کے ساتھ نیک نیتی کے بدلے یہ نیک بخت بیٹا ملا ہے۔ تیری ہی خوش خلقی اور صبر کے بدلے خدا نے اپنے احسان سے تجھے اور ہمیں یہ مبارک شہزادہ عطا کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسی کہ مکڑی اور آندھی کی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ مکڑی اور آندھی کا کیا قصّہ ہے، اور شہرزاد نو صبح ہوتی......

نو سو آٹھویں رات

نو سو آٹھویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ مکڑی اور آندھی کی کیا کہانی ہے؟

مکڑی اور آندھی کی کہانی

وزیر نے کہا اے بادشاہ! ایک مکڑی نے کسی اونچے دروازے پر چڑھ کر ایک جالا تنا تھا اس میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور خدا کی شکر گزار رہتی کہ اسے یہ گھر میسر ہوا اور خوف سے پناہ ملی۔ وہ اسی طرح بہت دنوں تک رہتی اور خدا کا شکر بجالاتی رہی کہ اس نے اسے راحت دی اور اس کو روزی پہنچاتا رہا۔ خدا نے ایک بار اس کا امتحان لینا چاہا کہ اسے وہاں سے نکال کر دیکھے کہ وہ کہاں تک شکر اور صبر کرتی ہے۔ ایک پروا آندھی بھیجی جس نے اسے مع جالے کے اڑا کر سمندر میں پھینک دیا، موجیں اسے خشکی کی طرف بہالے گئیں، لیکن اس نے اپنی سلامتی پر خدا کا شکر کیا اور آندھی سے ناراض ہو کر کہا اے آندھی، تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا اور تجھے اس سے کیا فائدہ ملا کہ تو مجھے میرے گھر سے یہاں لے آئی حالانکہ میں دروازے کے اوپر اپنے گھر میں بڑے امن و امان سے رہتی تھی؟ آندھی نے جواب دیا ناراض نہ ہو میں تجھے اسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں تو پہلے تھی۔ مکڑی صبر کے ساتھ انتظار کرتی رہی کہ آندھی آ کے اسے اس کے گھر پہنچا دے یہاں تک کہ اتر کی ہوا چلی لیکن وہ اسے واپس نہ لے گئی، پھر دکھن کی ہوا آئی اور مکڑی کو لے کر اسی گھر کی طرف چلی۔ مکڑی اس جگہ پہنچی تو اس نے اسے پہچان لیا اور بہت خوش ہوئی۔

ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ اس نے بادشاہ کی تنہائی اور صبر کا نیک بدلہ دیا، نا امیدی اور بڑھاپے کے باوجود اسے یہ لڑکا عطا کیا اور اسے دنیا سے اٹھانے سے پہلے اس کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں اسے اتنی بڑی

حکومت اور سلطنت بخشی، اس کی رعیت پر رحم فرما کر انھیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ بادشاہ نے کہا کہ تعریف ہی خدا کے لیے ہر تعریف سے برتر اور شکر ہی اس کا ہر شکر سے بالاتر، نہیں ہی کوئی معبود سوا اس کے، وہی ہی پیدا کرنے والا ہر چیز کا، اس کی بڑی عظمت کا پتا ہمیں اس کی نشانیوں کے نور سے چلتا ہی، وہ اپنے ملک میں جس بندے کو چاہتا ہی حکومت اور سلطنت دیتا ہی اُسے اپنی مخلوقات پر نائب اور امین بنانے کے لیے منتخب کر لیتا ہی اور اُسے حکم دیتا ہی کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کرے اس کی شریعتیں اور سنتیں قائم رکھے اور حق بات پر عمل کرے اور جس طرح خدا اور رعایا کو پسند ہو ان کے کاموں کو انجام دے۔ جو کوئی اللہ کے حکم کی تعمیل اس کی خواہش کے موافق عمل اور اس کی اطاعت کرتا ہی تو وہ بھی دُنیا کے خطرے اس کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا اور آخرت میں اسے بہت عمدہ بدلہ دیتا ہی، وہ نیکوکاروں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ مگر جو کوئی خدا کے حکم کے خلاف کام، گناہ اور اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتا اور آخرت پر دُنیا کو ترجیح دیتا ہی تو نہ اسے دُنیا میں کوئی بھلائی ملتی ہی نہ آخرت میں کوئی فائدہ۔ خدا ظالموں اور فسادیوں کی رسّی ڈھیلی نہیں چھوڑتا نہ کسی نیک بندے کے اجر کو ضائع کرتا ہی۔ ہمارے ان وزیروں نے ابھی بیان کیا ہی کہ ہمارے عدل اور نیک برتاؤ نے جو ہم ان کے ساتھ کرتے رہے ہیں خدا نے ہم پر اور ان پر یہ مہربانی کی کہ ہمیں ایسے شکر ادا کرنے کی توفیق ہوئی جس سے ہم اور زیادہ انعام و اکرام کے مستحق ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے وہ باتیں کہیں جو خدا نے اس کے دل میں ڈالیں انھوں نے خدا کی نعمتوں اور عنایتوں پر اس کا انتہائی شکریہ

ادا کیا اور اس کی تعریف کی۔ میں بھی خدا کا شکرگزار ہوں کیوں کہ میں اسی کا مامور بندہ ہوں میرا دل اس کے ہاتھ میں ہے، میری زبان اس کی فرماں بردار اس کے حکم کی تابع ہے اور وہی کرتی ہے جو اس کی مرضی میرے اور ان کے متعلق ہے خواہ دُنیا اِدھر سے اُدھر کیوں نہ ہو جائے۔ علاوہ بریں انھوں نے وہ بھی بیان کیا جو اس لڑکے کے بارے میں ان کے دل میں آیا اور یہ بھی کہا کہ میرے اس عمر پر پہنچنے کے بعد جب کہ نا امیدی اور یقین کی کمزوری غالب آ جاتی ہے خدا نے مجھ پر نئے سرے سے مہربانی کی۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہمیں مایوسی اور رات اور دن کی طرح حاکموں کے بدلنے سے محفوظ رکھا، واقعی یہ مجھ پر اور ان پر خدا کی بڑی عنایت ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہمیں یہ بیٹا دیا جو فرماں بردار اور مطیع ہے اور خدا نے اسے بادشاہت کا وارث بنا کر بلند مرتبہ عنایت فرمایا۔ ہم خدا کی مہربانی سے امیدوار ہیں کہ وہ اس کے ہر کام کو مبارک کرے اور اسے بھلائی کی توفیق دے تاکہ وہ ایسا بادشاہ اور حکمراں ہو جو رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کرے جس کی عنایت نوازش اور کرم سے وہ آفتوں کی ہلاکت سے بچیں۔

بادشاہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو علما اور حکما نے اٹھ کر خدا کے آگے سجدہ کیا بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ہاتھ چوم کر رخصت ہو گئے اس کے بعد بادشاہ محل کے اندر گیا اور لڑکے کو دیکھ کر اس کے لیے دُعا کی اس کا نام قمرالزماں رکھا۔ جب وہ بارھویں سال میں لگا تو بادشاہ کو اس کی تعلیم کا خیال ہوا اس نے اس کے لیے شہر کے بیچوں بیچ ایک محل بنوایا جس میں تین سو ساٹھ کمرے تھے اور لڑکے کو وہاں رکھا اس کے لیے حکمت داں عالموں میں سے تین اُستاد مقرر کیے اور انھیں حکم دیا کہ وہ دن رات

اس کی تعلیم میں لگے رہیں ہر روز اس کے ساتھ ایک نئے کمرے میں بیٹھیں اور کوئی ایسا علم نہ ہو جو وہ اسے نہ سکھائیں تاکہ وہ ہر فن میں طاق ہو جائے، اور جو جو علم اُسے جس جس کمرے میں پڑھائیں اُسے کمرے کے دروازے پر لکھ دیں اور ہر ہفتے وہ جتنا سیکھتا جائے اس سے بادشاہ کو مطلع کرتے رہیں۔ اب علما لڑکے کی تعلیم میں مشغول ہو گئے دن رات اسے پڑھاتے رہے اور کسی علم میں جو انھیں آتا تھا کوتاہی نہیں کی۔ لڑکے نے بھی ذہانت اور تیز فہمی کا ایسا ثبوت دیا جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیا ہوگا اُستاد ہر ہفتے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہے کہ لڑکے نے کیا کیا پڑھا اور اُسے پکا کر لیا ہے۔ عالموں کا قول تھا کہ ہم نے ایسا ذکی و فہیم لڑکا کبھی نہیں دیکھا انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ خدا تجھے اس میں برکت دے اور اس کی زندگی سے تجھے فائدہ ملے۔

جب لڑکے کی عمر بارہ سال کی ہو چکی تو ہر علم کا بہترین حصّہ اُسے برزبان یاد تھا۔ وہ اپنے زمانے کے تمام علما و حکما سے بازی لے گیا تو اس کے اُستادوں نے بادشاہ کے پاس آکر کہا اے بادشاہ، خدا نے اس بلند اقبال لڑکے کی وجہ سے تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دی ہیں اور ہم اسے اس وقت تیرے پاس لائے ہیں جب وہ تمام علم اس حد تک سیکھ چکا ہے کہ دنیا بھر کے علما اور حکما میں سے کسی کو اس کے برابر استطاعت نہیں۔ بادشاہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا، خدا کا شکر ادا کیا اس کے سامنے سجدے میں گر گیا اور کہنے لگا کہ شکر ہے خدا کا اس کی بے شمار نعمتوں پر۔ اس کے بعد اس نے وزیر شماس کو بلوایا اور اس سے کہا اے شماس، علما نے میرے پاس آکر بیان کیا ہے کہ میرا بیٹا سارے علوم سیکھ چکا ہے اور کوئی علم باقی

نہیں جو انھوں نے اسے نہ سکھایا ہو یہاں تک کہ وہ تمام لوگوں سے بازی
لے گیا ہو۔ اے شماس، تو کیا کہتا ہو؟ شماس نے یہ سُن کر خدا کے آگے سجدہ
کیا بادشاہ کا ہاتھ چوما اور کہا کہ یاقوت ہمیشہ چراغ کی طرح چمکتا ہو خواہ وہ سخت
سے سخت پہاڑ کے اندر کیوں نہ ہو، اور یہ تیرا بیٹا تو ہیرا ہو، پھر اس کی کم سنی
اسے دانش مند ہونے سے کیوں کر روک سکتی ہو۔ شکر ہو خدا کا کہ اس نے
اسے اتنا کچھ عطا کیا، کل میں خاص خاص علما اور امرا کو اکٹھا کر کے اس کے
علم کا امتحان لوں گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

نوسو نویں رات

نوسو نویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، جب
بادشاہ جلی عاد نے شماس کی باتیں سُنیں تو اس نے حکم دیا کہ مشہور علما،
ذہین فضلا اور ماہر حکما کل شاہی محل پر حاضر ہوں۔ علما و فضلا بادشاہ کی
ڈیوڑھی پر اکٹھے ہو گئے تو اس نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی۔
اس کے بعد شماس وزیر حاضر ہوا اس نے شہزادے کے ہاتھ چومے،
شہزادے نے اُٹھ کر شماس کے آگے سجدہ کیا۔ شماس نے کہا شیر کے
بچے پر واجب نہیں کہ وہ کسی اور جانور کے آگے سر جھکائے نہ روشنی کو
اندھیرے کے قریب پھٹکنے کی ضرورت ہو۔ لڑکے نے کہا شیر کے بچے
نے جب بادشاہ کے وزیر کو دیکھا تو اس کے آگے جھکنا پڑا۔ شماس نے
کہا اچھا بتاؤ کہ "دائم مطلق" سے کیا مراد ہو اس کے دو "کون" کیا
کیا ہیں، اور دونوں "کونین" میں سے دائم کون سا "کون" ہو؟

لڑکے نے جواب دیا کہ "دائم مطلق" خدا ہے کیوں کہ وہ اوّل ہے بلا ابتدا کے اور آخر ہے بلا انتہا کے۔ اس کے دونوں "کون" دنیا اور آخرت ہیں "کونین" میں سے دائم آخرت کی نعمتیں ہیں۔ شماس بولا تو نے ٹھیک کہا میں نے تیرا جواب مان لیا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو یہ بتائے کہ تجھے کیوں کر معلوم ہوا کہ "کونین" میں سے ایک دنیا ہے اور دوسری آخرت؟ لڑکے نے کہا اس لیے کہ دُنیا مخلوق ہے اور نیست سے ہست ہوئی ہے لہٰذا وہ پہلی "کون" ہے۔ لیکن وہ عرض ہے جوہر نہیں اور جلد زائل ہونے والی ہے، اس میں جو عمل کیا جائے وہ سزا اور جزا کا مستحق ہے۔ اسی لیے اس فانی چیز کے اعادے کی ضرورت ہے اور وہ اعادہ آخرت ہے۔ شماس بولا تو نے ٹھیک کہا تیری بات میں نے مان لی لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تجھے یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ "کونین" میں سے دائم آخرت کی نعمتیں ہیں؟ لڑکے نے جواب دیا میں نے اس طرح جانا کہ یہ دُنیا جسے اس ذات نے پیدا کیا جو باقی اور لازوال ہے اعمال کا گھر ہے جن پر جزا و سزا ملتی ہے۔ شماس نے کہا کیں دنیا والے کے اعمال تعریف کے قابل ہیں؟ لڑکے نے کہا اُس کے جو دُنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے۔ شماس بولا وہ کون شخص ہے جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا جو شخص یہ جانتا ہے کہ دُنیا ختم ہونے والی ہے، وہ اسی لیے بنائی گئی ہے کہ فنا ہو جائے اور فنا کے بعد محاسبہ کیا جائے گا اور اگر اس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہوتا جو ہمیشہ رہتا تو وہ بھی دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا۔

اب شماس نے کہا اچھا بتا آخرت بے دنیا کے بھی دُرست ہو سکتی ہے؟ لڑکا بولا جس کی دُنیا نہیں آخرت بھی نہیں، دُنیا، دُنیا والوں اور آخرت

کی مثال جس کی طرف وہ جانے والے ہیں ایسی ہو جیسے ایک جاگیر کے مزدور جن کے لیے ایک امیر نے ایک تنگ مکان بنا کر انھیں اس میں رکھا ہو ان کا کام تقسیم کر دیا ہو اور اس کی میعاد مقرر کر دی ہو ان پر ایک پاسبان مقرر کر دیا ہو، جو مزدور اپنا کام پورا کرتا جائے پاسبان اُسے اُس تنگ مکان سے نکالتا جائے اور جو مزدور پورا نہ کرے اور میعاد ختم ہو جائے تو پاسبان اُسے سزا دے۔ وہ اسی حالت میں تھے کہ گھر کی دراڑوں میں سے شہد ٹپکنے لگا جب انھوں نے شہد کھایا اور انھیں اس کا مزا ملا تو وہ اپنے کام میں سستی کرنے لگے بالآخر اُسے بالکل چھوڑ دیا اور اُس تنگی اور تکلیف پر قناعت کی جس میں وہ تھے اس عذاب پر بھی جس کی طرف وہ عنقریب جانے والے تھے اُس تھوڑی سی مٹھاس پر ریجھ گئے۔ مگر جس جس کی میعاد پوری ہوتی جاتی پاس بان اسے نکالتا جاتا۔ اس سے ہمیں پتا چلتا ہو کہ دُنیا ایسا گھر ہو جہاں آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں جہاں کے رہنے والوں کے لیے موت لابدی ہو۔ جو کوئی دُنیا میں تھوڑی سی مٹھاس پاکر اسی کا ہو رہتا ہو وہ برباد ہو جائے گا کیوں کہ وہ دُنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہو۔ لیکن جس شخص نے دُنیا پر آخرت کو ترجیح دی اور اس تھوڑی سی مٹھاس کو بالکل منھ نہ لگایا وہی کام یاب ہوا۔ شماس بولا جو کچھ تو نے دُنیا اور آخرت کے بارے میں کہا میں نے سُن لیا اور اسے مان لیا، مگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں انسان پر مسلط ہیں اس لیے اُسے ان دونوں کو راضی رکھنا ہو۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اگر بندہ روزی کمانے میں لگ گیا تو آخرت میں بھی اس کی روح ٹوٹے میں رہے گی اور اگر وہ آخرت کی دُھن میں لگا رہا تو اس کا جسم نقصان اٹھائے گا۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دو مخالف کو ایک ساتھ خوش کر سکے۔ لڑکے نے کہا جسے دُنیا کی روزی میسّر ہوئی آخرت حاصل کرنے کی قوت اس میں زیادہ ہوگئی۔ دُنیا اور آخرت کا معاملہ ایسا ہے جیسے دو بادشاہ، ایک منصف مزاج اور دوسرا ظالم۔

منصف مزاج اور ظالم بادشاہ کی کہانی

کسی زمانے میں دو بادشاہ تھے، ایک عادل اور دوسرا ظالم۔ ظالم بادشاہ کا مُلک سرسبز تھا اس میں بہت سے درخت اور میوے تھے۔ یہ بادشاہ ہر تاجر کا مال اور تجارتی سامان ضبط کر لیا کرتا تھا اور وہ اس پر صبر کرتے تھے کیوں کہ مُلک اتنا زرخیز تھا کہ انھیں کھانے پینے کے لیے کافی مل جاتا۔ ایک بار عادل بادشاہ نے اپنے مُلک کے ایک شخص کو بہت سا مال و دولت دے کر ظالم بادشاہ کے مُلک کو بھیجا تاکہ وہ وہاں سے جواہرات خرید کر لائے۔ یہ شخص مال لے کر اس مُلک میں پہنچا، بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کے مُلک میں ایک تاجر بہت سا مال لے کر جواہرات خریدنے آیا ہے۔ بادشاہ نے کسی شخص کو بھیج کر اُسے بُلوایا اور اس سے پُوچھا کہ تو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کون تجھے یہاں لایا ہے اور تو کس ضرورت سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا میں فلاں مُلک سے آیا ہوں، وہاں کے بادشاہ نے مجھے بہت مال و دولت دے کر یہاں سے جواہرات مول لینے بھیجا ہے اور میں اس کا حکم بجالانے آیا ہوں۔ بادشاہ نے کہا ستیاناس ہو تیرا! کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اپنی رعایا کے ساتھ کیا کرتا ہوں؟ میں ہر روز ان کا مال ضبط کر لیتا

ہوں، پھر تجھے کیا ہوا کہ اپنا مال لے کر تو میرے ملک میں آیا اور اتنی مدّت سے یہاں ٹھیرا ہوا ہے؟ تاجر نے جواب دیا مال میرا نہیں بلکہ وہ میرے پاس بطور امانت کے ہے تاکہ میں اسے اُس کے مالک کے پاس پہنچا دوں۔ بادشاہ نے کہا جب تک تو اپنی جان کے فدیے میں سارا مال مجھے نہ دے دے میں تجھے اپنے ملک سے روزی نہ حاصل کرنے دوں گا، اور شہرزاد کو صبح ہوتی ......

نوسودسویں رات

نوسودسویں رات ہوئی تو اس نے کہا اے نیک نہاد بادشاہ، ظالم بادشاہ نے تاجر سے کہا کہ یا تو تو تمام مال دے کر اپنی جان بچا لے یا جان دے دے۔ وہ شخص اپنے دل میں کہنے لگا کہ میں دو بادشاہوں کے بیچ میں بڑا پھنسا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس بادشاہ کا ظلم عام ہے اور اُن سب پر ہوتا ہے جو اس کے ملک میں رہتے ہیں۔ اگر میں نے اس کی شرط منظور نہ کی تو میں مارا بھی جاؤں گا، میرا مال بھی ضائع ہوگا اور مطلب بھی پورا نہ ہوگا۔ اور اگر میں نے اسے سارا مال دے دیا تو پھر وہ دوسرا بادشاہ مجھے مار ڈالے گا جس کا مال ہے۔ اب سوا اس کے اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی کہ میں یہ مال دے کر کم از کم اس بادشاہ سے تو اپنی جان چھڑا لوں اور اس زرخیز ملک سے اپنی روزی حاصل کرتا رہوں جب تک کہ میں جواہرات نہ خرید لوں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ میں مال دے کر اس بادشاہ کو بھی راضی کر لوں گا اس کے ملک سے روزی بھی کماتا رہوں گا اور مال والے

کی حاجت پوری کر کے اس کے پاس جا بھی سکوں گا کیوں کہ جو کچھ تھوڑا بہت یہ بادشاہ لے لے گا اس پر وہ بادشاہ اتنی سزا نہیں دے گا جتنا کہ وہ اپنے عدل کی وجہ سے درگزر کرے گا۔ یہ سوچ کر تاجر نے بادشاہ کو دعا دی اور کہا اے بادشاہ، یہ مال کو اپنی جان پر قربان کرتا ہوں یہ مال ایک حقیر بدلہ ہے میرے آنے کے وقت سے جانے کے وقت تک کا۔ بادشاہ نے منظور کر لیا اُسے ایک سال رہنے کی اجازت دے دی اس شخص نے اپنا کُل مال دے کر جواہرات خریدے اور اپنے بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

اس کہانی میں عادل بادشاہ کی مثال آخرت کی ہے اور جو جواہرات ظالم بادشاہ کے مُلک میں تھے وہ نیکیاں اور بھلے کام ہیں۔ مال والا شخص دُنیادار ہے اور جو مال اس کے پاس ہے وہ انسان کی زندگی ہے۔ جب تو نے یہ دیکھ لیا تو تجھے معلوم ہو جانا چاہیے کہ جو شخص دُنیا کی روزی تلاش کرے اسے چاہیے کہ ایک دن بھی آخرت کی طلب سے خالی نہ رہے، اس طرح سے زمین کی زرخیزی سے فائدہ اٹھا کر اس نے دنیا کو بھی خوش کر دیا اور اپنی زندگی سے آخرت کی تلاش میں خرچ کر کے آخرت کو بھی راضی کر لیا۔ شماس بولا بتا آیا جسم اور رُوح اور عذاب میں برابر ہیں؟ یا عذاب مخصوص ہے محض اس شخص کے لیے جو شہوتوں اور گناہوں کا مرتکب ہے؟ لڑکے نے جواب دیا شہوتوں اور گناہوں کی طرف میلان ثواب کا سبب ہو سکتا ہے اس طرح سے کہ وہ نفس کو اس سے روکے اور توبہ کرتا رہے لیکن فیصلہ اس ذات کے ہاتھ میں ہے جو جس طرح چاہتی ہے کرتی ہے چیزیں اپنی ضد کے مقابلے میں پہچانی جاتی ہیں۔ کھانا

پینا بدن کے لیے ضروری ہے اور بدن بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔ روح کی پاکی یہ ہے کہ دُنیا میں نیت کی سچائی ہو اور اُس چیز کی طرف توجہ جس سے آخرت میں فائدہ پہنچے۔ دُنیا اور آخرت ایسی ہیں جیسے دو گھڑ دوڑ کے گھوڑے یا دو رضاعی بھائی یا ایک کام کے دو ساجھی۔ اس اجمال کی تفصیل نیت پر منحصر ہے۔ اسی طرح بدن اور روح عمل اور ثواب و عذاب میں مشترک ہیں۔

ہماری زبان

[انجم]ن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردوٗ

انجمن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔
[...]یں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص
[...]ے ہیں۔ اُردوٗ میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، اُن پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت
[...] حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے
[...]ی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالۂ سائنس

انجمن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا ماہانہ رسالہ

[ہ]ر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے)
[اس] کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردوٗ دانوں میں مقبول کیا جائے۔
[س]ائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں
[...] قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان
[...]نے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردوٗ زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات
[...]ن اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔
[چندہ س]الانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)
[خ]ط و کتابت کا پتا:۔ معتمد مجلس ادارت رسالۂ سائنس جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) دہلی